زیر نظر استاد محقق آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

# تفسیر نمونہ

۱۲

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

[illegible]
دارالعلم کی ایک شاخ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر: استادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

# تفسیرِ نمونہ

۱۳

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

## پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ——— تفسیر نمونہ جلد ۱۲

زیر نظر ——— استادِ محقق آقائے ناصر مکارم شیرازی

مترجم ——— سید صفدر حسین نجفی۔ پرنسپل جامعۃ المنتظر۔ لاہور

تصحیح ——— سید محمد حسین زیدی برستی

تجدید نظر ——— ثاقب نقوی

کتابت ——— اخوت کتابت، چوک اُردو بازار، لاہور

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰۔ گنگارام مینشن، شاہراہِ قائداعظم۔ لاہور

مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز

تاریخ اشاعت ——— رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

ایڈیشن ——— بار اوّل

ہدیہ ——— ۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

# قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور ۲

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# قارئین محترم !

سلام و رحمت

بارہویں جلد کے چند ہی ہفتوں بعد تیرہویں جلد بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انشاء اللہ آئندہ جلدیں بھی تیز رفتاری سے مراحل تکمیل طے کر رہی ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ اس دور کی اس عظیم اور مقبول تفسیر کی اشاعت کا یہ منصوبہ جلد از جلد مکمل ہو۔

اُردو میں اس تفسیر کی اشاعت نے تفسیر کے مطالعے، فہم قرآن اور تحقیق کا ایک نیا اور اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ یہ بات تشکر و فخر سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو زبان میں یہ تفسیر اپنی ہمہ گیری، مطالب کے تنوع، قدیم و جدید علوم پر اعلیٰ دسترس اور ہر قسم کے تعصب سے پاک قرآن حکیم کے آزاد مطالعے کے اعتبار سے بہت منفرد ہے۔ تمام طبقات اور تمام مکاتب میں مقبولیت سے بھی اس امر کی شہادت ملتی ہے۔

اس تفسیر نے فکر اور سوچ کو نئے زاویے دیے ہیں اس سے توقع ہے کہ ہمارے ملک میں قرآن پر مطالعات کے عمل کو مہمیز ملے گی، مسلمان قرآنی افکار کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب آئیں گے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد کو بھی تقویت ملے گی۔

آپ کی جانب سے نقد و تبصرہ کے عمل میں تسلسل کی بہت ضرورت ہے۔ ہم نے آپ احباب کے مخلصانہ مشوروں اور مشفقانہ آرا سے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔ اس جلد کی اشاعت میں ہم سے الحاج شیخ مبارک علی صاحب سیدو کے والے نے اپنے مرحوم آباؤ اجداد خصوصاً اپنے والد بزرگوار جناب شیخ کرامت علی سیدو کے والے کے ایصال ثواب کی غرض سے تعاون کیا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، الحاج شیخ مبارک علی صاحب کے اس حُسن نیت و حُسن عمل کو قبول فرمائے اور ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔

ہم بارگاہِ الٰہی سے نصرت و توفیق کے طالب ہیں اور آپ سے دعاؤں کے آرزومند۔

اللّٰھم صلّ علیٰ محمّد وآلہ الطاہرین۔

اراکین: مصباح القرآن ٹرسٹ

Marfat.com

# اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

# یہ تفسیر

## حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللٰہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

# چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے:

| | | | |
|---|---|---|---|
| ① | تفسیر مجمع البیان | تصنیف | مشہور مفسر علامہ طبرسی |
| ② | تفسیر تبیان | تصنیف | دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی |
| ③ | تفسیر المیزان | تصنیف | علامہ طبا طبائی |
| ④ | تفسیر صافی | تصنیف | علامہ محسن فیض کاشانی |
| ⑤ | تفسیر نور الثقلین | تصنیف | مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی |
| ⑥ | تفسیر برہان | تصنیف | مرحوم سید ہاشم بحرینی |
| ⑦ | تفسیر روح المعانی | تصنیف | علامہ شہاب الدین محمود آلوسی |
| ⑧ | تفسیر المنار | تصنیف | محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ |
| ⑨ | تفسیر فی ظلال القرآن | تصنیف | سید قطب مصری |
| ⑩ | تفسیر قرطبی | تصنیف | محمد بن احمد انصاری قرطبی |
| ⑪ | اسباب النزول | تصنیف | واحدی (ابوالحسن علی بن متویہ نیشاپوری) |
| ⑫ | تفسیر مراغی | تصنیف | احمد مصطفےٰ مراغی |
| ⑬ | تفسیر مفاتیح الغیب | تصنیف | فخر رازی |
| ⑭ | تفسیر روح الجنان | تصنیف | ابوالفتوح رازی |



Marfat.com

# اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک " ایران کا اسلامی انقلاب" اور " دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

با الفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکار علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو



Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی بارہ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی تیرہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)
[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔
اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے ) ۔

خداوندا !
ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !
جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے ، تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !
ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔
اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے ) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

Marfat.com

# فہرست مضامین


| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| **سورۂ مریم** | ۲۹ |
| اس سورہ کے مضامین | ۳۰ |
| اس سورہ کی فضیلت | ۳۰ |
| **آیت ۱ تا ۶** | ۳۳ |
| حضرت زکریاؑ کی پُراثر دعا | ۳۴ |
| **چند نکات** | ۳۵ |
| ۱۔ یہاں میراث سے کیا مراد ہے؟ | ۳۵ |
| ۲۔ اذ نادی ربہ نداء خفیا کا مفہوم | ۳۸ |
| ۳۔ ویرث من آل یعقوب کا مطلب | ۳۸ |
| **آیت ۷ تا ۹** | ۳۸ |
| **آیت ۱۰ تا ۱۱** | ۳۹ |
| زکریا کی آرزو پوری ہوگئی | ۳۹ |
| **چند نکات** | ۴۱ |
| ۱۔ یحییٰؑ عشق الٰہی میں سرشار پیغمبر | ۴۱ |
| ۲۔ محراب | ۴۳ |
| **آیت ۱۲ تا ۱۵** | ۴۳ |
| حضرت یحییٰ کی عمدہ صفات | ۴۴ |
| **چند نکات** | ۴۵ |
| ۱۔ آسمانی کتاب کو قوت کے ساتھ پکڑ لو | ۴۵ |
| ۲۔ انسان کی سرنوشت کے تین مشکل دن | ۴۵ |
| ۳۔ بچپن میں نبوّت | ۴۶ |
| ۴۔ حضرت یحییٰؑ کی شہادت | ۴۸ |
| **آیت ۱۶ تا ۱۷** | ۴۸ |
| **آیت ۱۸ تا ۲۱** | ۴۹ |
| حضرت عیسیٰؑ کی ولادت | ۴۹ |
| **چند نکات** | ۵۲ |
| ۱۔ رُوح خدا سے کیا مراد ہے؟ | ۵۲ |
| ۲۔ تمثّل کیا ہے؟ | ۵۲ |
| **آیت ۲۲ تا ۲۶** | ۵۳ |
| مریمؑ سخت طوفان کے تھپیڑوں میں | ۵۳ |
| **چند اہم نکات** | ۵۶ |
| ۱۔ حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت | ۵۶ |
| ۲۔ مریمؑ نے موت کی تمنا کیوں کی؟ | ۵۶ |
| ۳۔ ایک سوال کا جواب | ۵۷ |
| ۴۔ خاموشی کا روزہ | ۵۷ |
| ۵۔ ایک قوت بخش غذا | ۵۸ |
| **آیت ۲۷ تا ۳۳** | ۵۹ |
| حضرت مسیح کی گہوارے میں باتیں | ۶۰ |
| **چند اہم نکات** | ۶۲ |
| ۱۔ قرآن کا حُسن بیان اور ولادت عیسیٰؑ | ۶۲ |
| ۲۔ ماں کا مقام | ۶۳ |
| ۳۔ باکرہ سے بچہ پیدا ہونا | ۶۵ |
| ۴۔ نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کرسکتا ہے؟ | ۶۶ |




Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| آیت ۳۴ - ۳۵ | ۶۶ |
| کیا خدا کا بیٹا ممکن ہے ؟ | ۶۶ |
| فرزند کی نفی یعنی خدا سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی | ۶۸ |
| پہلی ہجرت کے بارے میں ایک اہم تاریخی نکتہ | ۶۸ |
| آیت ۳۶ تا ۴۰ | ۷۱ |
| قیامت ، حسرت کا دن | ۷۲ |
| آیت ۴۱ تا ۴۳ | ۷۵ |
| آیت ۴۴ - ۴۵ | ۷۶ |
| ابراہیمؑ کی مؤثر منطق | ۷۶ |
| چند نکات | ۷۹ |
| ۱. دوسروں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ | ۷۹ |
| ۲. عالم کی پیروی کرنے کی دلیل | ۷۹ |
| ۳. رحمت اور یادآوری کی صورت | ۷۹ |
| آیت ۴۶ تا ۵۰ | ۸۰ |
| شرک اور مشرکین سے دوری کا نتیجہ | ۸۱ |
| آیت ۵۱ | ۸۴ |
| آیت ۵۲ - ۵۳ | ۸۵ |
| موسیٰؑ ایک مخلص و برگزیدہ پیغمبر | ۸۵ |
| چند اہم نکات | ۸۶ |
| ۱. مخلص کسے کہتے ہیں ؟ | ۸۶ |
| ۲. رسول اور نبی میں فرق | ۸۶ |
| آیت ۵۴ - ۵۵ | ۸۷ |
| اسمٰعیلؑ صادق الوعد پیغمبر | ۸۸ |
| آیت ۵۶ تا ۵۸ | ۸۹ |
| آیت ۵۹ تا ۶۰ | ۹۰ |
| یہ سچے پیغمبر تھے لیکن ... ... | ۹۰ |
| چند نکات | ۹۳ |
| ادریسؑ کون تھے ؟ | ۹۳ |
| آیت ۶۱ تا ۶۳ | ۹۴ |
| جنت کی توصیف | ۹۵ |
| آیت ۶۴ - ۶۵ | ۹۸ |
| شانِ نزول | ۹۸ |
| ہم تو حکم کے بندے ہیں | ۹۹ |
| آیت ۶۶ تا ۷۰ | ۱۰۰ |
| شانِ نزول | ۱۰۰ |
| دوزخیوں کی کچھ توصیف | ۱۰۱ |
| آیت ۷۱ - ۷۲ | ۱۰۳ |
| کیا ہم سب جہنم میں جائیں گے ؟ | ۱۰۴ |
| ایک سوال کا جواب | ۱۰۶ |
| آیت ۷۳ تا ۷۶ | ۱۰۷ |
| آیت ۷۷ تا ۸۱ | ۱۱۰ |
| آیت ۸۲ | ۱۱۱ |
| ایک بیہودہ اور انحرافی خیال | ۱۱۱ |
| آیت ۸۳ تا ۸۷ | ۱۱۴ |
| شفاعت کیسے لوگ کر سکتے ہیں ؟ | ۱۱۵ |
| "عہد" کا معنی کیا ہے ؟ | ۱۱۷ |
| آیت ۸۸ تا ۹۳ | ۱۱۹ |
| آیت ۹۴ - ۹۵ | ۱۲۰ |
| خدا اور اولاد کا ہونا | ۱۲۰ |




Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| چند اہم نکات | ۱۲۲ |
| ۱۔ اَب بھی اُسے خدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں۔ | ۱۲۲ |
| ۲۔ آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہوں گے ؟ | ۱۲۲ |
| آیت ۹۶ تا ۹۸ | ۱۲۳ |
| ایمان محبوبیت کا سرچشمہ ہے | ۱۲۳ |
| چند اہم نکات | ۱۲۶ |
| ۱۔ مومنوں کے دل میں حضرت علیؑ کی محبت | ۱۲۶ |
| ۲۔ "یسّرنٰہ بلسانك" کی تفسیر | ۱۲۷ |
| سُورہ طٰہٰ | ۱۲۹ |
| سُورہ طٰہٰ کی فضیلت | ۱۳۰ |
| اِس سُورہ کے مضامین | ۱۳۱ |
| آیت ۱ تا ۸ | ۱۳۳ |
| شانِ نزول | ۱۳۴ |
| خود کو اتنا مشقت میں نہ ڈالو | ۱۳۴ |
| آیت ۹ تا ۱۲ | ۱۳۸ |
| آیت ۱۳ تا ۱۶ | ۱۳۹ |
| بیابان میں آگ کا شعلہ | ۱۳۹ |
| چند اہم نکات | ۱۴۴ |
| ۱۔ "فاخلع نعليك" سے کیا مراد ہے ؟ | ۱۴۴ |
| ۲۔ ایک سوال کا جواب | ۱۴۵ |
| ۳۔ نماز یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے | ۱۴۵ |
| آیت ۱۷ تا ۲۳ | ۱۴۶ |
| موسیٰؑ کا عصا اور ید بیضا | ۱۴۷ |
| چند اہم نکات | ۱۵۰ |
| ۱۔ دو عظیم معجزے | ۱۵۰ |
| ۲۔ چیزوں کی فوق العادت استعداد | ۱۵۱ |
| ۳۔ تورات اس بارے میں کیا کہتی ہے ؟ | ۱۵۱ |
| آیت ۲۴ تا ۳۰ | ۱۵۱ |
| آیت ۳۱ تا ۳۶ | ۱۵۲ |
| موسیٰؑ کے جچے تُلے تقاضے | ۱۵۳ |
| چند اہم نکات | ۱۵۴ |
| ۱۔ انقلاب کی رہبری کی شرائط | ۱۵۵ |
| ۲۔ سرکشوں کے خلاف جنگ | ۵۵ |
| ۳۔ ہر کام کے لیے پروگرام اور وسائل کی ضرورت ہے۔ | ۱۵۶ |
| ۴۔ تسبیح اور ذکر | ۱۵۷ |
| ۵۔ پیغمبرِ اسلام بھی موسیٰؑ کے تقاضوں کی تکرار کرتے ہیں | ۱۵۷ |
| آیت ۳۷ تا ۴۱ | ۱۵۹ |
| کتنا مہربان خدا ہے ؟ | ۱۶۰ |
| آیت ۴۲ | ۱۶۵ |
| آیت ۴۳ تا ۴۸ | ۱۶۶ |
| جابر فرعون کے ساتھ پہلی ٹکر | ۱۶۶ |
| چند اہم نکات | ۱۷۰ |
| ۱۔ خُدا کی عجیب قُدرت نمائی | ۱۷۰ |
| ۲۔ دشمنوں کے ساتھ مدارات | ۱۷۰ |
| ۳۔ کیا انبیاء کے علاوہ کسی اور پر وحی ہو سکتی ہے ؟ | ۱۷۱ |
| ۴۔ ایک سوال کا جواب | ۱۷۲ |
| آیت ۴۹ تا ۵۳ | ۱۷۲ |
| آیت ۵۴ تا ۵۵ | ۱۷۳ |




Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| تمہارا پروردگار کون ہے ؟ | ۱۶۳ |
| چند اہم نکات | ۱۶۸ |
| ۱۔ لفظ "مھد" و "مہاد" کا مفہوم | ۱۶۸ |
| ۲۔ لفظ "ازواجاً" کا مطلب | ۱۶۸ |
| ۳۔ اولی النہٰی کی تفسیر | ۱۶۸ |
| آیت ۵۶ تا ۶۲ | ۱۶۹ |
| آیت ۶۳ - ۶۴ | ۱۸۰ |
| آخری مقابلے کے لیے فرعون کی تیاری | ۱۸۱ |
| آیت ۶۵ تا ۶۹ | ۱۸۵ |
| موسیٰ بھی میدان میں آجاتے ہیں | ۱۸۶ |
| چند اہم نکات | ۱۸۸ |
| ۱۔ جادو کی حقیقت کیا ہے ؟ | ۱۸۸ |
| ۲۔ جادوگر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا | ۱۸۹ |
| آیت ۷۰ - ۷۱ | ۱۹۰ |
| آیت ۷۲ تا ۷۶ | ۱۹۱ |
| موسیٰ علیہ السلام کی عظیم کامیابی | ۱۹۲ |
| چند اہم نکات | ۱۹۶ |
| ۱۔ علم، ایمان و انقلاب کا سرچشمہ ہے۔ | ۱۹۶ |
| ۲۔ ہم تجھے "بیّنات" پر مقدم نہیں کرتے | ۱۹۷ |
| ۳۔ مجرم سے کون مراد ہے ؟ | ۱۹۷ |
| ۴۔ ماحول کی مجبوری ایک بہانہ ہے | ۱۹۸ |
| آیت ۷۷ تا ۷۹ | ۱۹۸ |
| بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کا غرق ہونا | ۱۹۹ |
| آیت ۸۰ تا ۸۲ | ۲۰۱ |
| نجات کی واحد راہ | ۲۰۲ |
| آیت ۸۳ تا ۹۱ | ۲۰۵ |
| سامری کا شور و غوغا | ۲۰۶ |
| چند اہم نکات | ۲۱۲ |
| ۱۔ شوقِ دیدار | ۲۱۲ |
| ۲۔ انبیاء کے انقلاب کی مخالف تحریکیں | ۲۱۳ |
| ۳۔ رہبری کے مراحل | ۲۱۳ |
| ۴۔ ایک اعتراض کا جواب | ۲۱۳ |
| آیت ۹۲ تا ۹۴ | ۲۱۵ |
| آیت ۹۵ تا ۹۸ | ۲۱۶ |
| سامری کا عبرت ناک انجام | ۲۱۷ |
| چند اہم نکات | ۲۲۲ |
| ۱۔ مشکلات کے مقابل ڈٹ جانا چاہیئے | ۲۲۲ |
| ۲۔ سامری کون ہے ؟ | ۲۲۳ |
| آیت ۹۹ تا ۱۰۱ | ۲۲۳ |
| آیت ۱۰۲ تا ۱۰۴ | ۲۲۴ |
| ان کے کندھوں پر بدترین بوجھ | ۲۲۴ |
| آیت ۱۰۵ تا ۱۱۲ | ۲۲۸ |
| قیامت کا ہولناک منظر | ۲۲۹ |
| چند نکات | ۲۳۳ |
| ۱۔ "ظلم" اور "ہضم" میں فرق | ۲۳۳ |
| ۲۔ قیامت کے مرحلے | ۲۳۴ |
| آیت ۱۱۳ - ۱۱۴ | ۲۳۴ |
| پروردگارا ! میرے علم کو اور زیادہ کردے | ۲۳۵ |
| چند نکات | ۲۳۷ |
| ۱۔ حصولِ وحی تک میں عجلت نہ کرو | ۲۳۷ |




Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| ۲۔ علم میں اضافے کے طلب گار رہو | ۲۳۷ |
| آیت ۱۱۵ تا ۱۱۹ | ۲۳۹ |
| آیت ۱۲۰ - ۱۲۱ | ۲۴۰ |
| شیطان کی فریب کاری | ۲۴۰ |
| کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے ؟ | ۲۴۴ |
| آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵ | ۲۴۵ |
| آیت ۱۲۶ تا ۱۲۷ | ۲۴۶ |
| تنگ زندگی | ۲۴۶ |
| چند اہم نکات | ۲۴۷ |
| ۱۔ یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج | ۲۴۷ |
| ۲۔ اندرونی اور بیرونی نابینائی | ۲۴۹ |
| ۳۔ گناہ میں اسراف | ۲۵۰ |
| ۴۔ "ہبوط" کیا ہے ؟ | ۲۵۰ |
| آیت ۱۲۸ تا ۱۳۰ | ۲۵۱ |
| گزشتگان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو | ۲۵۲ |
| آیت ۱۳۱ تا ۱۳۲ | ۲۵۵ |
| آیت ۱۳۴ - ۱۳۵ | ۲۵۶ |
| سورۂ انبیاء | ۲۶۱ |
| سورۂ انبیاء کی فضیلت | ۲۶۳ |
| اس سورہ کے مضامین | ۲۶۴ |
| آیت ۱ تا ۵ | ۲۶۴ |
| طرح طرح کے بہانے | ۲۶۵ |
| ایک نکتہ | ۲۶۶ |
| کیا قرآن حادث ہے ؟ | ۲۶۹ |
| | ۲۶۹ |

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| آیت ۶ تا ۹ | ۲۷۰ |
| آیت ۱۰ | ۲۷۱ |
| تمام پیغمبر نوع بشر میں سے تھے | ۲۷۱ |
| اہل ذکر کون ہیں ؟ | ۲۷۲ |
| آیت ۱۱ تا ۱۵ | ۲۷۵ |
| ظالم عذاب کے چنگل میں کیسے گرفتار ہوئے ! | ۲۷۶ |
| آیت ۱۶ تا ۱۸ | ۲۷۸ |
| آسمان اور زمین کی خلقت کھیل نہیں ہے | ۲۷۸ |
| ایک نکتہ | ۲۸۰ |
| مقصدِ خلقت | ۲۸۰ |
| آیت ۱۹ تا ۲۴ | ۲۸۳ |
| آیت ۲۵ | ۲۸۴ |
| شرک خیال آرائی سے شروع ہوتا ہے | ۲۸۴ |
| دلیلِ تمانع | ۲۸۶ |
| ایک سوال اور اس کا جواب | ۲۸۷ |
| آیت ۲۶ تا ۲۹ | ۲۹۱ |
| فرشتے مکرم اور فرمانبردار بندے ہیں | ۲۹۲ |
| آیت ۳۰ تا ۳۲ | ۲۹۴ |
| آیت ۳۳ | ۲۹۵ |
| جہانِ ہستی میں خدا کی نشانیاں | ۲۹۵ |
| چند اہم نکات | ۲۹۹ |
| ۱۔ "کل فی فلك یسبحون" کا مفہوم | ۲۹۹ |
| ۲۔ آسمان محکم چھت ہے | ۲۹۹ |
| آیت ۳۴ - ۳۵ | ۳۰۱ |
| موت سب کے لیے ہے | ۳۰۱ |


Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| آیت ۳۶ تا ۴۰ | ۳۰۴ |
| انسان جلد باز مخلوق ہے | ۳۰۵ |
| چند اہم نکات | ۳۰۷ |
| ۱۔ جلد باز کر جلد بازی سے ممانعت | ۳۰۷ |
| ۲۔ "بل تأتیھم بغتۃ فتبھتھم" کا مفہوم | ۳۰۷ |
| آیت ۴۱ تا ۴۵ | ۳۰۸ |
| کان دھر کے سنو اگر تمہارے کان ...... | ۳۰۹ |
| آیت ۴۶ - ۴۷ | ۳۱۲ |
| قیامت میں عدل کے ترازو | ۳۱۲ |
| آیت ۴۸ - ۵۰ | ۳۱۵ |
| انبیا کی کچھ داستان | ۳۱۵ |
| آیت ۵۱ - ۵۸ | ۳۱۸ |
| ابراہیمؑ بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناتے ہیں۔ | ۳۱۹ |
| چند اہم نکات | ۳۲۲ |
| ۱۔ بت پرستی کی مختلف شکلیں | ۳۲۲ |
| ۲۔ بت پرستوں کی گفتگو اور ابراہیمؑ کا جواب | ۳۲۳ |
| آیت ۵۹ تا ۶۷ | ۳۲۴ |
| ابراہیمؑ کی دندان شکن دلیل | ۳۲۴ |
| آیت ۶۸ تا ۷۰ | ۳۲۹ |
| آگ گلزار ہوگئی | ۳۲۹ |
| چند اہم نکات | ۳۳۲ |
| ۱۔ سبب سازی و سبب سوزی | ۳۳۲ |
| ۲۔ بہادر نوجوان | ۳۳۳ |
| ۳ ابراہیمؑ اور نمرود کے مابین معرکہ | ۳۳۴ |
| آیت ۷۱ تا ۷۳ | ۳۳۴ |
| بت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیمؑ کی ہجرت | ۳۳۵ |
| آیت ۷۴ - ۷۵ | ۳۳۹ |
| بروں کے علاقوں سے لوطؑ کی نجات | ۳۳۹ |
| آیت ۷۶ | ۳۴۰ |
| آیت ۷۷ | ۳۴۱ |
| متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں سے نوحؑ کی نجات | ۳۴۱ |
| ایک نکتہ | ۳۴۳ |
| آیت ۷۸ تا ۸۰ | ۳۴۳ |
| داؤدؑ اور سلیمانؑ کا فیصلہ | ۳۴۳ |
| ایک نکتہ | ۳۴۷ |
| آیت ۸۱ - ۸۲ | ۳۴۸ |
| ہوائیں سلیمان کے زیر فرمان | ۳۴۸ |
| آیت ۸۳ - ۸۴ | ۳۵۱ |
| حضرت ایوبؑ کی مشکلات سے نجات | ۳۵۲ |
| چند نکات | ۳۵۳ |
| ۱۔ حضرت ایوبؑ کی مختصر داستان | ۳۵۳ |
| ۲۔ "اتیناہ اھلہ ومثلھم معھم" کی تفسیر | ۳۵۴ |
| آیت ۸۵ - ۸۶ | ۳۵۵ |
| اسماعیلؑ، ادریسؑ اور ذاالکفلؑ | ۳۵۵ |
| ادریسؑ اور ذاالکفلؑ | ۳۵۶ |
| آیت ۸۷ - ۸۸ | ۳۵۷ |
| یونسؑ کی وحشت ناک زندان سے رہائی | ۳۵۷ |
| چند اہم نکات | ۳۵۸ |
| ۱۔ یونسؑ کی سرگزشت | ۳۵۸ |




Marfat.com

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| ٢. یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں ؟ | ٣٥٩ |
| ٣. یونسؑ نے کونسا ترکِ اولیٰ کیا تھا | ٣٥٩ |
| ٤. کردار ساز سبق | ٣٥٩ |
| آیت ٨٩ - ٩٠ | ٣٦٠ |
| زکریاؑ تنہا نہ رہے | ٣٦١ |
| آیت ٩١ | ٣٦٢ |
| مریمؑ پاک دامن خاتون | ٣٦٣ |
| چند اہم نکات | ٣٦٣ |
| ١. ایک ابہام کی وضاحت | ٣٦٤ |
| ٢. "روحنا" سے کیا مراد ہے ؟ | ٣٦٤ |
| ٣. ماں بیٹا ایک معجزہ | ٣٦٤ |
| آیت ٩٢ تا ٩٤ | ٣٦٥ |
| ایک اُمّت | ٣٦٥ |
| آیت ٩٥ تا ٩٧ | ٣٦٨ |
| کفار قیامت کے آستانے پر | ٣٦٨ |

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| چند الفاظ کے لغوی معنی | |
| آیت ٩٨ تا ١٠٣ | ٣٧١ |
| جہنم کا ایندھن | ٣٧٢ |
| آیت ١٠٤ | ٣٧٥ |
| جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جانے گا | ٣٧٥ |
| آیت ١٠٥ - ١٠٦ | ٣٧٧ |
| زمین کی حکومت صالحین کے لیے ہوگی | ٣٧٨ |
| چند اہم نکات | ٣٨٠ |
| ١. قیامِ مہدیؑ کے سلسلہ میں روایات | ٣٨٠ |
| ٢. مزامیرِ داؤد میں صالحین کی حکومت کی بشارت | ٣٨١ |
| ٣. صالحین کی حکومت ایک قانونِ آفرینش ہے | ٣٨٢ |
| آیت ١٠٧ تا ١١٢ | ٣٨٤ |
| عالمین کے لیے پیغمبرِ رحمتؐ | ٣٨٥ |
| سُورہ انبیاء کا اختتام | ٣٨٩ |




Marfat.com

# تفسیر نمونہ

## جلد ۱۳

کا آغاز
سورہ مریمؑ سے ہوتا ہے
جس میں
حضرت یحییٰؑ کی پیدائش، نبوت اور شہادت، حضرت مریمؑ کی زندگی کے دشوار لمحوں، حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں کچھ ذکر حضرت موسیٰؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ادریسؑ کا بھی ہے۔
اس کے بعد
سورۂ طٰہٰ کی تفسیر ہے
جو حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور پر اولین بار جانے کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ پھر معجزات اور ایک ساتھی ہارونؑ کے ملنے کا تذکرہ ہے۔ پھر فرعون سے معرکہ آرائی کی ایک جھلک ہے۔ فرعون کی تباہی کا بیان ہے۔ سامری کی سازش اور اس کے انجام کا بھی ذکر ہے۔
آخر میں
سورۂ انبیاءؑ کی تفسیر ہے
اس میں
مبدأ و معاد کے مسائل کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤد، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ذاالکفلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کا ذکر ہے۔ آخر میں صالحین کی عالمی حکومت کی بشارت بھی دی گئی ہے۔

یہ تفسیر--- قرآن پاک پر ایک تازہ تحقیق ہے جس میں عصر حاضر کی ضروریات، تقاضوں، سوالات اور مختلف مکاتب خیال کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔



Marfat.com

# سُورۂ مریم

① مکہ میں نازل ہوئی
② اس کی ۹۸ آیات ہیں



Marfat.com

# اِس سُورہ کے مضامین

یہ سورہ مضامین کے لحاظ سے چند اہم حصوں کی حامل ہے:۔

۱۔ اس سورہ کا اہم ترین حصہ جناب زکریاؑ، حضرت مریمؑ، حضرت عیسٰیؑ، حضرت یحیٰیؑ اور توحید کے ہیرو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ، حضرت ادریسؑ اور خداوند تعالیٰ کے بعض دوسرے بزرگ انبیا کے کچھ حالات پر مشتمل ہے کہ جو خاص تربیتی نکات کا حامل ہے۔

۲۔ اس سورہ کا دُوسرا حصہ کہ جو پہلے حصہ کے بعد سب سے اہم ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت، مجرموں کی سزا، پرہیزگاروں کی جزا اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کے ساتھ مربوط ہے۔

۳۔ ایک اور حصہ مواعظ و نصائح کا ہے کہ جو فی الحقیقت گزشتہ حصوں کی تکمیل کرتا ہے۔

۴۔ آخری حصہ قرآن، خداوند تعالیٰ سے اولاد کی نفی اور مسئلہ شفاعت سے مربوط اشارے ہیں کہ جو مجموعی طور پر نفوس انسانی کو ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف راہنمائی کے لیے ایک مؤثر تربیتی پروگرام پر مشتمل ہے۔

# اِس سُورہ کی فضیلت

پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:۔

جو شخص اس سورہ کو پڑھے اُسے ان اشخاص کی تعداد کے برابر کہ جنہوں نے زکریاؑ کی تصدیق یا تکذیب کی ہے اور اسی طرح سے یحیٰیؑ، مریمؑ، عیسٰیؑ، موسٰیؑ، ہارونؑ، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اسمٰعیلؑ (کی تصدیق یا تکذیب کی ہے) ان میں سے ہر ایک کی تعداد سے دس گنا نیکیاں خداوند تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں درج کر دے گا۔ اسی طرح ان اشخاص کی تعداد کہ جو (جھوٹ اور تہمت کے طور پر) خدا کے لیے اولاد کے قائل ہوتے ہیں اور ان اشخاص کی تعداد کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل نہیں ہوتے سے دس گنا نیکیاں عطا کرے گا۔[۱]

حقیقت میں یہ حدیث دو مختلف خطوط میں تحقیق اور کوشش کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ ان میں سے ایک انبیاء، معصومین اور نیک لوگوں کی حمایت کا خط ہے اور دوسرا مشرکین منحرفین اور گنہگاروں کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اتنے عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں دیئے جائیں گے

۱۔ مجمع البیان ذیل آیہ۔



Marfat.com

کہ جو صرف الفاظ کو پڑھ لیں اور اس کے مطابق عمل نہ کریں بلکہ یہ مقدس الفاظ تو عمل کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :۔

جو شخص اس سورہ کو مسلسل پڑھتا رہے وہ اس دنیا سے نہیں جائے گا مگر یہ کہ خداوند تعالیٰ اس سورہ کی برکت سے اُسے جان و مال اور اولاد کے لحاظ سے بے نیاز کر دے گا۔[1]

یہ غنا اور بے نیازی انسان کے اس سورہ کے مفاہیم کو جان و دل سے اپنانے کا نتیجہ ہے اور یہ در اصل اس کے مفاہیم ہیں جو اس کے اعمال و گفتار کے اندر منعکس ہو رہے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ۔



Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ كٓهٰيٰعٓصٓ ۚ
۲۔ ذِكۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّكَ عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا ۖۚ
۳۔ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ○
۴۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّىۡ وَاشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَيۡبًا وَّلَمۡ اَكُنۡ
بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ○
۵۔ وَاِنِّىۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِىَ مِنۡ وَّرَآءِىۡ وَكَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِىۡ
مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ○
۶۔ يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ ۖ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا ○

## ترجمہ

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ كٓهٰيٰعٓصٓ
۲۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت کی اس کے بندے زکریا کے بارے میں ایک یاد ہے۔
۳۔ اُس وقت جبکہ اُس نے (عبادت کی) خلوت گاہ میں اپنے پروردگار کو پکارا۔
۴۔ اس نے کہا پروردگارا! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور بڑھاپے کے شعلے نے میرے تمام سر کو گھیر لیا ہے اور میں تجھ سے دُعا کرکے
کبھی بھی محروم نہیں رہا ہوں۔
۵۔ اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے خوفزدہ ہوں (کہ وہ تیرے دین کی پاسداری کا حق ادا نہیں کریں گے) اور میری بیوی
بانجھ ہے پس تُو اپنی قدرت سے مجھے جانشین عطا فرما۔
۶۔ کہ جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کا بھی وارث بنے اور اس کو تو اپنی رضا و پسندیدگی سے نواز۔



Marfat.com

# تفسیر

## حضرت زکریا کی پُر اثر دُعا :

پھر ایک دفعہ اس سورہ کی ابتداء میں ہمیں حروفِ مقطعہ کا سامنا ہے "کٓھٰیٰعٓصٓ" اور چونکہ ہم سابقاً قرآن کی تین مختلف سورتوں (سورہ بقرہ۔ آل عمران اور اعراف) کی ابتدا میں ان حروفِ مقطعہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں لہذا ہم یہاں پر تکرار کی ضرورت نہیں سمجھتے [1]

جس بیان کی اس مقام پر ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی منابع و مصادر میں اس سورہ کے حروفِ مقطعہ کے بارے میں دو قسم کی روایات نظر آتی ہیں :۔

پہلی روایات تو وہ ہیں کہ جو ان حروفِ مقطعہ میں سے ہر ایک کو خداوند تعالیٰ کے عظیم اسماء حسنیٰ میں سے ایک ایک اسم کی طرف اشارہ قرار دیتی ہیں "کاف" اشارہ ہے "کافی" کی طرف کہ جو خداوند تعالیٰ کا ایک عظیم نام ہے اور "ھ" اشارہ ہے "ھادی" کی طرف اور "یاء" اشارہ ہے "ولی" اور "عین" اشارہ ہے "عالم" کی طرف اور "ص" اشارہ ہے "صادق الوعد" (وہ جو اپنے وعدہ کا سچا ہے) کی طرف [2]

دوسری قسم ان روایات کی ہے کہ جو ان حروفِ مقطعہ کی کربلا میں امام حسینؑ کے قیام کی داستان کے ساتھ تفسیر کرتی ہیں ان کے مطابق "کاف" اشارہ ہے "کربلا" کی طرف "ھاء" اشارہ ہے خاندانِ پیغمبر کے ہلاک اور شہید ہونے کی طرف اور "یا" "یزید کی طرف اور "عین" "مسئلہ عطش (پیاس) کی طرف اور "ص" امام حسینؑ اور ان کے جانباز یار و انصار کے "صبر" و استقامت کی طرف۔ [2]

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن مجید کی آیات مختلف معانی کی حامل ہو سکتی ہیں اور بعض اوقات گزشتہ اور آیندہ کے مفاہیم بیان کرتی ہیں کہ جو متنوع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتے جبکہ اگر معنی کو ایک تفسیر میں منحصر کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم آیت کی وضع کیفیت نزول اور اس کے زمانے کے لحاظ سے کئی ایک اشکالات میں گرفتار ہو جائیں۔

٭ ٭ ٭

حروفِ مقطعہ کے ذکر کے بعد سب سے پہلی بات حضرت زکریاؑ کی داستان سے شروع ہوتی ہے۔ خدا فرماتا ہے :۔ یہ یاد ہے اُس رحمت کی جو تیرے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر کی (ذکر رحمة ربك عبده زكريا) [3]

اس وقت جبکہ وہ کوئی فرزند نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان اور غمناک تھے تو انہوں نے درگاہِ خدا کی طرف رُخ کیا، اس وقت خلوت گاہ میں اور وہاں پر کہ جہاں کوئی اُن کی آواز نہیں سُن رہا تھا اپنے پروردگار کو پکارا اور اُس سے دُعا کی (اذ نادٰی ربه ندآءً خفیًا)۔

"اس نے کہا پروردگارا! میری ہڈیاں جو میرے جسم کا ستون اور میرے بدن کا محکم ترین اعضاء ہیں، کمزور ہو گئی ہیں" (قال رب انی وھن العظم منی)۔ اور بڑھاپے کے شعلوں نے میرے سر کے تمام بالوں کو گھیر لیا ہے (واشتعل الرأس شیبًا)۔ بڑھاپے کے آثار کو ایسے شعلے سے تشبیہ دینا کہ جو

---

[1] ۔ تفسیر نمونہ پہلی جلد سورہ بقرہ کی ابتداء اور دوسری جلد سورہ آل عمران کی ابتداء اور چھٹی جلد سورہ اعراف کی ابتدا کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] ۔ نور الثقلین جلد ۳ ص ۳۲۰۔

[3] ۔ در حقیقت لفظ "ذکر" محذوف مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر اس کی اس طرح ہے :۔

"ھذا ذکر رحمة ربك"۔



Marfat.com

تمام سر کو گھیر لے ایک جاذب نظر اور عمدہ تشبیہ ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو آگ کے شعلہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جلدی پھیل جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اطراف میں ہو اسے گھیر لیتا ہے اور دوسری طرف آگ کے شعلے ایک خاص قسم کی روشنی اور چمک کے حامل ہوتے ہیں اور دُور سے توجہ مبذول کراتے ہیں اور تیسری طرف جس وقت آگ کسی جگہ کو گھیرتی ہے تو جو چیز اُس سے باقی رہ جاتی ہے وہ وہی خاکستر ہی ہوتی ہے۔

حضرت زکریاؑ نے بڑھاپے کے گھیر لینے اور سر کے تمام بالوں کی سفیدی کو آگ کے شعلہ در ہونے اور اُس کے چمکنے اور سفید خاکستر کو اس کی جگہ پر باقی رہنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بہت ہی رسا اور زیبا تشبیہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتے ہیں :۔ پروردگارا! میں ہرگز ان دعاؤں میں، جو میں نے تیری بارگاہ میں کبھی کی ہیں محروم نہیں پلٹا (ولم اکن بدعائك رب شقیًّا)۔ گزشتہ زمانے میں تو نے مجھے ہمیشہ دعاؤں کی اجابت وقبولیت کا عادی بنایا ہے اور کبھی مجھے محروم نہیں کیا۔ اب جبکہ میں بوڑھا اور ناتواں ہو گیا ہوں تو اب اور بھی زیادہ اس بات کا حقدار ہوں کہ تو میری دعا قبول فرمائے اور مجھے نا اُمید نہ پلٹائے۔

حقیقت میں " شقاوت " یہاں پر تعب اور رنج وتکلیف کے معنی میں ہے۔ یعنی میں کبھی اپنی درخواستوں میں تجھ سے زحمت ومشقت میں نہیں پڑا، کیونکہ وہ بہت جلد تیری بارگاہ میں قبول ہو جایا کرتی تھیں۔

۞ ۞ ۞ ۞

اس کے بعد اپنی حاجت کی اس طرح تشریح کرتے ہیں: پروردگارا! میں اپنے بعد اپنے عزیز واقارب سے خوفزدہ ہوں (ہو سکتا ہے وہ فتنہ و فساد سے اپنے ہاتھ آلودہ کریں) اور میری بیوی بانجھ ہے، تو اپنی طرف سے مجھے ولی اور جانشین بخش دے۔

(وانی خفت الموالی من ورائی وكانت امرأتی عاقرًا فهب لی من لدنك ولیًّا)۔

ایسا جانشین کہ جو میرا بھی وارث بنے اور اسی طرح آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ پروردگارا! میرے اس جانشین کو اپنا پسندیدہ بنا۔

(یرثنی و یرث من آل یعقوب واجعله رب رضیًّا)۔

## چند نکات :

**۱۔ یہاں میراث سے کیا مراد ہے؟** مفسرین اسلام نے اس سوال کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ ایک گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ یہاں ارث سے مراد مال کی میراث ہے، اور ایک گروہ اسے مقام نبوت کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے، کہ اس سے ایک ایسا جامع معنی مراد ہے جس میں دونوں مفاہیم شامل ہیں۔

بہت سے شیعہ علماء نے پہلے معنی کو انتخاب کیا ہے جبکہ علماء اہل سنت کی ایک جماعت نے دوسرے معنی کو، اور بعض نے جیسا کہ سید قطب نے " فی ظلال " میں اور آلوسی نے " روح المعانی " میں تیسرے معنی کو انتخاب کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے ارثِ مال میں منحصر سمجھا ہے۔ انہوں نے یہ معنی مراد لینے میں لفظ " ارث " کے ظاہر سے استناد کیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ جب تک دوسرے قرائن سے خالی ہو تو ارث مال ہی کے معنی دیتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی چند ایک آیات میں یہ لفظ معنوی امور میں استعمال ہوا ہے۔ تو یہ ان میں موجود قرائن کی بنا پر ہے: مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ :۔

ثم اورثنا الكتاب الذین اصطفینا من عبادنا



Marfat.com

ہم نے آسمانی کتاب کو اپنے برگزیدہ بندوں کی طرف بطور ارث منتقل کیا ہے ؛

علاوہ ازیں چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل بہت سے ہدایا اور نذریں " احبار " (علماء یہود) کے لیے لاتے تھے اور حضرت زکریاؑ احبار کے سردار تھے[1]

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے ، کہ حضرت زکریاؑ کی زوجہ جو کہ حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ کی اولاد میں سے تھیں ، حضرت سلیمانؑ اور داؤدؑ کی مالی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ، اُنھوں نے بہت سے اموال میراث میں پائے تھے ۔

حضرت زکریاؑ اس بات سے خوفزدہ تھے ، کہ مبادا یہ مال غیر صالح ، مطلب پرست ، ذخیرہ اندوز یا فاسق و فاجر افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے اور وہ معاشرے میں بُرائی کی ترویج کریں ۔ لہٰذا اپنے پروردگار سے صالح اور نیک بیٹے کی درخواست کی تاکہ وہ اُن اموال کی نگرانی کرے اور انہیں بہترین طریقہ سے خرچ کرے ۔

وہ مشہور روایت ، کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی پاک بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ سے فدک لینے کے سلسلے میں خلیفۂ اول کے سامنے ، اس آیت سے استدلال کے بارے میں نقل ہوئی ہے ، خود اس دعوے کی ایک شاہد ہے ۔

مرحوم طبرسی کتاب احتجاج میں بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ : جس وقت خلیفۂ اول نے فدک کو جناب فاطمہؑ سے چھین لینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور یہ خبر اس بی بی تک پہنچی تو آپ اس کے پاس آئیں اور اس طرح فرمایا : اے ابا بکر !

افی کتاب اللّٰہ ان ترث اباک ولا ارث ابی لقد جئت شیئاً فریاً ؟ افعلی عمد ترکتم کتاب اللّٰہ ونبذتموہ وراء ظھورکم ؟ اذ یقول فیما اقتص من خبر یحیٰی بن زکریا اذ قال رب ھب لی من لدنک ولیاً یرثنی و یرث من اٰل یعقوب

" کیا یہ بات کتاب خدا میں لکھی ہوئی ہے کہ تُو تو اپنے باپ کی میراث پائے اور میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں یہ تو عجیب وغریب چیز ہے ۔ کیا تم لوگوں نے جان بُوجھ کر کتاب خدا کو چھوڑ دیا ہے اور اسے پس پُشت ڈال دیا ہے ؟ جبکہ وہ یحیٰی بن زکریا کے قصہ میں کہتا ہے کہ زکریا نے کہا کہ خداوندا ! تو مجھے اپنی طرف سے جانشین عطا فرما تاکہ وہ میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے "[2]

لیکن وہ لوگ کہ جن کا یہ نظریہ ہے ، کہ یہاں پر وہی معنوی معنی مراد ہے تو اُنہوں نے ایسے قرائن سے ، کہ جو خود آیت میں یا اس سے باہر ہیں تمسک کیا ہے ۔ مثلاً :۔

۱ ۔ یہ کہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ حضرت زکریاؑ جیسے عظیم پیغمبر اس سن و سال میں اپنی ثروت کے وارثوں کے بارے میں اس قدر فکر مند ہوں خصوصاً جبکہ " یرثنی و یرث من اٰل یعقوب " کے جملے کے ذکر کرنے کے بعد اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں ( واجعلہ رب رضیاً ) " خداوندا اُسے اپنا پسندیدہ بنا " اس میں شک نہیں کہ یہ جملہ اس وارث کی معنوی صفات کی طرف اشارہ ہے ۔

۲ ۔ آیندہ آیات میں جہاں خداوند تعالیٰ انہیں یحیٰی کے پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے وہاں عظیم معنوی مقامات کے منجملہ مقام نبوت کا اس کے لیے

---

[1] نور الثقلین ، جلد ۳ ، ص نمبر ۳۲۳ ۔

[2] نور الثقلین ، جلد ۳ ، صفحہ نمبر ۳۲۴ ۔



Marfat.com

ذکر کرتا ہے ۔

۳ ۔ سورہ آل عمران کی آیہ ۳۹ میں جبکہ خداوند تعالٰی زکریاؑ کی طرف سے فرزند کے تقاضے کی تشریح میں یہ اشارہ کرتا ہے ۔ کہ وہ اس وقت اس سوچ میں پڑے کہ جب انہوں نے جناب مریمؑ کے مقامات اور مراتب کا مشاہدہ کیا کہ پروردگار کے لطف و کرم سے جنت کے کھانے اور پھل ان کی محراب عبادت پر آجاتے تھے ۔

ھنالك دعا زکریا ربه قال رب ھب لی من لدنك ذریة طیبة انك سمیع الدعاء

۴ ۔ چند ایک احادیث میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مطلب نقل ہوا ہے جو اس بات کی تائید کرتا ہے کہ میراث یہاں معنوی پہلو کی طرف اشارہ ہے ۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادقؑ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ بن مریمؑ ایک ایسی قبر کے نزدیک سے گزرے کہ جس میں موجود شخص عذاب میں گرفتار تھا ۔

اگلے سال بھی آپ کا گزر وہاں سے ہوا تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ وہ صاحب قبر عذاب میں مبتلا نہیں ہے ۔ تو انہوں نے اپنے پروردگار سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کی طرف خداوند تعالٰی کی طرف سے وحی ہوئی کہ صاحب قبر کا ایک نیک بیٹا تھا اُس نے ایک راستہ درست کیا تھا اور ایک یتیم کو پناہ دی تھی خداوند تعالٰی نے اسے اس کے بیٹے کے عمل کی وجہ سے بخش دیا ہے ۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

خداوند تعالٰی کی اس کے مومن بندے کے لیے میراث یہ ہے کہ اسے ایسا بیٹا دے کہ جو اُس کے بعد حکم خُدا کا مطیع و فرمانبردار ہو ۔

اس کے بعد حضرت امام صادقؑ نے اس حدیث کے نقل کرنے کے موقع پر حضرت زکریاؑ سے متعلق آیت کی تلاوت فرمائی :

ھب لی من لدنك ولیًّا یرثنی و یرث من اٰل یعقوب واجعله رب رضیًّا[1]

اور اگر یہ کہا جائے کہ لفظ ارث کا ظاہری معنی وہی میراث اموال ہے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ یہ ظاہری معنی قطعی و یقینی نہیں ہے کیونکہ قرآن میں بارہا معنوی ارث میں استعمال ہوا ہے (مثلاً سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ اور سورہ مومن کی آیہ ۵۳) ۔

علاوہ ازیں اگر فرض کریں کہ خلاف ظاہر ہو تو قرائن بالا کے ہوتے ہوئے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی ۔

لیکن پہلے نظریے والے استدلالات کا جواب دے سکتے ہیں کہ خداوند تعالٰی کے یہ عظیم پیغمبر اموال کے بارے میں ذاتی غرض سے پریشان نہ تھے بلکہ وہ اسے معاشرے کے لیے برائی کا منبع نہیں بننے دینا چاہتے تھے ان کی غرض یہ تھی کہ یہ صلاح و درستی کے راستے میں استعمال ہو کیونکہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے ، کہ ( بنی اسرائیل ) احبار و علما کے لیے بہت زیادہ ہدیے اور نذریں لاتے تھے کہ جو حضرت زکریاؑ کے سپرد ہوتی تھیں اور شاید بہت سے اموال ان کی بیوی کی طرف سے بھی کہ جو حضرت سلیمانؑ کی اولاد میں سے تھی باقی رہ گئے تھے ۔ اب یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ ان ( اموال ) کے اُوپر ایک غیر صالح شخص کا ہونا عظیم مفاسد کا سبب ہوتا ۔ اور یہی چیز تھی کہ جس نے حضرت زکریاؑ کو پریشان کر رکھا تھا ۔

باقی رہیں حضرت یحیٰیؑ کے لیے معنوی صفات کہ جو اس آیت میں اور دوسری آیات قرآن میں ذکر ہوئی ہیں ، وہ نہ صرف یہ کہ اس بات کے منافی نہیں بلکہ وہ اس سے ہم آہنگ بھی ہیں ۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ عظیم ثروت ایک مرد خدا پرست اور برگزیدہ الٰہی کے ہاتھ میں جائے اور وہ اس سے معاشرے کو سعادت کی راہ پر چلانے کے لیے استفادہ کرے ۔

---

[1] نور الثقلین ، جلد ۳ ص ۳۲۳ ، ۳۲۴ ۔



Marfat.com

لیکن ہمارے نظریے کے مطابق اگر ہم اُوپر کی مجموعی بحث سے یہ نتیجہ نکالیں کہ لفظ "ارث" یہاں پر وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں ارثِ اموال بھی شامل ہے اور مقامات معنوی کی میراث بھی تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہر طرف کے لیے قرائن موجود ہیں اور قبل و بعد کی آیات اور تمام تر روایات کی طرف توجہ کرنے سے یہ تفسیر کامل طور پر صحیح مفہوم کے قریب نظر آتی ہے۔

باقی رہا (انی خفت الموالی من ورائی) "مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں کا ڈر ہے" کا جملہ تو وہ دونوں معانی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اگر فاسد اور بُرے لوگ ان اموال میں صاحبِ اختیار ہو جاتے تو واقعاً یہ پریشان کرنے والی بات تھی۔ اور اگر رہبری و ہدایت غیر صالح افراد کے ہاتھ جا پڑتی تو بہت ہی پریشانی اور مصیبت کا سبب بنتی۔ اس بناء پر حضرت زکریاؑ کا خوف دونوں صُورتوں میں قابلِ توجیہ ہے۔

بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ کی مشہور حدیث بھی اس معنی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

۲۔ **اذ نادی ربہ نداءً خفیًّا کا مفہوم**: اس جملہ میں مفسرین کے لیے یہ سوال سامنے آیا ہے کہ "نادی" بلند آواز سے دعا کرنے کے معنی میں ہے جبکہ "خفی" آہستہ و مخفی کے معنی میں ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے کہ "خفی" آہستہ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ پوشیدہ اور مخفی کے معنی میں ہے، اس بناء پر یہ بات ممکن ہے کہ حضرت زکریاؑ نے اپنی خلوت گاہ میں کہ جہاں اُن کے علاوہ کوئی دوسرا موجود نہیں تھا خداوند تعالیٰ کو بلند آواز میں پکارا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی یہ درخواست رات کی تاریکی اور وسطِ شب میں تھی کہ جس وقت لوگ خوابِ غفلت میں آرام کر رہے تھے[1]

نیز بعض نے (فخرج علی قومہ من المحراب) "زکریاؑ اپنی محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے" کے جملہ کو، کہ جو آیندہ کی آیات میں آئے گا اس دعا کے خلوت گاہ میں ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔[2]

۳۔ **ویرث من آل یعقوب کا مطلب**: "مجھے ایسا فرزند عنایت کر جو آلِ یعقوب کا وارث بنے"، کا جملہ اس بناء پر ہے، کہ زکریاؑ کی بیوی حضرت عیسیٰؑ کی والدہ جناب مریمؑ کی خالہ تھیں اور اس خاتون کا نسب حضرت یعقوب تک پہنچتا تھا، کیونکہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے تھیں جو "یہودا" فرزند یعقوب کی اولاد میں سے تھے[3]

۷۔ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ○

۸۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○

۹۔ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ○

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۶ ذیل آیہ محل بحث۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ذیل آیہ۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۶ ذیل آیہ۔



Marfat.com

١٠۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ○

١١۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا ○

## ترجمہ

٧۔ اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحیٰی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے کوئی لڑکا اس کا ہم نام قرار نہیں دیا۔

٨۔ اُس نے کہا پروردگارا! میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بہت زیادہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔

٩۔ فرمایا: اسی طرح تیرے پروردگار نے کہا ہے (اور ارادہ کیا ہے؟) یہ میرے لیے آسان ہے اور میں نے تجھے پہلے خلق کیا تھا جبکہ تو کوئی چیز نہیں تھا۔

١٠۔ عرض کیا پروردگارا! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے۔ کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین شبانہ روز (لوگوں سے) بات نہیں کرسکے گا (جبکہ تیری زبان سالم ہے)

١١۔ وہ اپنی محراب عبادت سے لوگوں کی طرف نکلا اور اشارہ کے ساتھ اُنہیں کہا (کہ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر) صبح شام خدا کی تسبیح کرو۔

## تفسیر

### زکریاؑ کی آرزو پوری ہوگئی:

یہ آیات حضرت زکریاؑ کی دعا کی بارگاہ پروردگار میں قبولیت کو بیان کر رہی ہیں یہ ایسی استجابت و قبولیت تھی جو اُس کے مخصوص لطف و عنایت سے آمیختہ تھی فرمایا گیا ہے: اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں کہ جس کا نام یحیٰی ہے۔ ایسا لڑکا کہ جس کا پہلے کوئی ہم نام نہیں ہوا۔
(یا زکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحییٰ لم نجعل له من قبل سمیًّا)۔

کس قدر جاذب اور عمدہ چیز ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا اس طرح قبول کرے۔ اور بشارت دے کہ اس کی دعا کے نتیجے سے اُسے آگاہ کرے اور فرزند کی درخواست کے جواب میں ایک بیٹا عنایت کرے اور اس کا نام بھی خود ہی رکھ دے۔ اور مزید کہے کہ یہ فرزند کئی جہات سے منفرد ہے اور اس سے پہلے کوئی ایسا نہیں ہوا۔

کیونکہ (لم نجعل له من قبل سمیًّا) کا جملہ اگرچہ ظاہراً اس معنی میں ہے کہ اب تک کوئی اس کا ہم نام نہیں تھا۔ لیکن چونکہ محض نام کسی کی شخصیت کی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسم مسمّٰی کی طرف اشارہ ہے یعنی اس جیسی امتیازی خصوصیات کا حامل اس سے پہلے کوئی نہیں ہوا جیسا کہ راغب نے مفردات میں صراحت کے ساتھ یہ معنی بیان کیا ہے۔



Marfat.com

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحییٰ سے پہلے بہت سے بزرگ پیغمبر گزرے ہیں جو اُن سے بالاتر اور افضل تھے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یحییٰ کچھ ایسی امتیازی خصوصیات رکھتے ہوں کہ جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوں۔ جیسا کہ بعد میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔

لیکن حضرت زکریاؑ چونکہ ایسے مطلوب تک پہنچنے کے لیے ظاہری اسباب کو کارآمد نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے بارگاہ پروردگار میں وضاحت کا تقاضا کیا۔

انہوں نے کہا پروردگارا یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے کوئی بیٹا نصیب ہو۔ جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی سن و سال کے لحاظ سے اس حد کو پہنچ گیا ہوں کہ بالکل بوڑھا اور ناکارہ ہوگیا ہوں (قال رب انّٰی یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقرا وقد بلغت من الکبر عتیّا)۔

"عاقر" اصل میں عقر کے مادہ سے جڑ اور بنیاد کے معنی میں یا حبس یعنی بند ہوجانے کے معنی میں ہے اور یہ جو بانجھ عورتوں کو "عاقر" کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اولاد کے قابل نہیں رہی ہوتیں یا یہ کہ ان کے بچہ کی پیدائش بند ہوگئی ہوتی ہے۔

"عتی" اس شخص کو کہتے ہیں کہ زیادہ عمر ہوجانے کے سبب سے جس کا بدن خشک ہوگیا ہو۔ وہی حالت جو بہت زیادہ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے انسان میں پیدا ہوجاتی ہے۔

لیکن بہت جلدی حضرت زکریاؑ کو اُن کے سوال کے جواب میں بارگاہ خداوندی سے یہ پیغام مل گیا" فرمایا: معاملہ اسی طرح ہے کہ جیسا تیرے پروردگار نے کہا ہے اور یہ میرے لیے آسان بات ہے (قال کذالك قال ربك ھو علی ھین)[1]

یہ مسئلہ کوئی عجیب و غریب نہیں ہے کہ تجھ جیسے بوڑھے مرد اور ظاہراً بانجھ بیوی سے بچہ پیدا ہو اور میں نے تجھے پہلے پیدا کیا تھا جبکہ تو کچھ بھی نہیں تھا (وقد خلقتك من قبل ولم تك شیئا)۔

وہ خدا جو یہ قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ بغیر کسی چیز کے تمام چیزوں کو پیدا کرے یہ کونسی تعجب کی بات ہے کہ اس سن و سال میں اور ان حالات میں تجھے فرزند عنایت کردے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پہلی آیت میں بشارت دینے والا اور کلام کرنے والا خداوند عالم ہے۔ لیکن یہ کہ تیسری زیر بحث آیت (قال کذالك قال ربك) میں گفتگو کرنے والا کون ہے۔ بعض اسے فرشتوں کی گفتگو سمجھتے ہیں کہ جو زکریاؑ کو بشارت دینے کا ذریعہ بنے تھے اور سورہ آل عمران کی آیت ۳۹ کو اس کا گواہ سمجھا جاسکتا ہے:۔

فنادته الملائكة وهو قائم يصلی فی المحراب ان الله يبشرك بيحيٰی

فرشتوں نے زکریاؑ کو ندا دی جبکہ وہ محراب میں کھڑے ہوئے تھے اور مشغول نماز تھے کہ خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان تمام جملوں کا کہنے والا خدا ہے اور کوئی دلیل ایسی نہیں ہے کہ ہم اس کے ظاہر کے خلاف معنی کریں۔ اگر فرشتے بشارت دینے کے واسطے تھے تو بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ اصل پیغام کو اپنی طرف نسبت دے، خصوصاً جبکہ ہم اسی سورہ آل عمران کی آیہ ۴۰ میں یہ پڑھتے ہیں:

قال كذالك الله يفعل ما يشاء

خدا اسی طرح سے جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

---

[1] مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "کذالك" کا جملہ تقدیر میں (الامر کذالك) تھا یعنی مطلب اسی طرح ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ کذالك کا تعلق بعد والے جملے کے ساتھ ہو اور اس کا مفہوم یہ ہو کہ اس طرح تیرے پروردگار نے کہا ہے۔



Marfat.com

بہرحال حضرت زکریاؑ بہت ہی مسرور ہوئے، نورِ اُمید نے اُن کے سراپا کو گھیر لیا، لیکن یہ پیغام اُن کی نظر میں بہت ہی اہم اور ان کے مستقبل کو روشن کرنے والا تھا، لہذا خداوند تعالیٰ سے اس کام کے لیے کسی نشانی کا تقاضا کیا اور "کہا پروردگارا! میرے لیے کوئی نشانی قرار دے"۔ (قال رب اجعل لی اٰیۃ)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت زکریاؑ خدائی وعدہ پر ایمان رکھتے تھے اور وہ بالکل مطمئن تھے۔ لیکن جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے جو معاد پر ایمان کامل رکھتے تھے زیادہ سے زیادہ اطمینانِ قلب کی خاطر اسی زندگی میں معاد کی صورت کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا کیا تھا، اسی طرح زکریاؑ نے بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ اطمینان کے لیے اس قسم کی نشانی کا تقاضا کیا تھا۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تمہاری زبان صحیح و سالم ہے۔ تم مکمل تین دن رات لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکو گے اور تمہاری زبان صرف ذکرِ خدا اور اُس سے مناجات کر سکے گی (قال اٰیتك ان لا تكلم الناس ثلاث ليال سويًا)۔

لیکن یہ کتنی عجیب و غریب نشانی تھی۔ یہ ایک ایسی نشانی تھی کہ جو ایک طرف تو اس کی مناجات و دعا کے ساتھ ہم آہنگ تھی اور دوسری طرف اس کو تمام مخلوق سے منقطع کر رہی تھی اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق قائم کر رہی تھی تا کہ اس حال میں اس عظیم نعمت کا شکر بجا لائے اور اسے زیادہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا پر آمادہ کرے۔

یہ ایک واضح اور آشکار نشانی ہے کہ انسان صحیح و سالم زبان رکھتے ہوئے اور پروردگار کے ساتھ ہر قسم کی مناجات و حمد و ثنا کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس بشارت اور اس واضح نشانی کے بعد حضرت زکریاؑ اپنی محراب عبادت سے لوگوں کے پاس آئے اور انہیں اشارہ کے ساتھ اس طرح کہا: صبح شام پروردگار کی تسبیح کرو (فخرج علی قومه من المحراب فاوحی الیهم ان سبحوا بكرة وعشيًا)۔

کیونکہ وہ عظیم نعمت جو خداوند تعالیٰ نے زکریاؑ کو عطا فرمائی تھی، اس کی وسعت پوری قوم کے لیے تھی اور اُن سب کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ اسی بنا پر اس لائق تھی کہ اس نعمت کے شکرانے میں سب کے سب خداوند تعالیٰ کی تسبیح کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور خداوند تعالیٰ کی مدح و ثنا کریں۔

اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ یہ عطا کہ جو ایک معجزہ تھی افرادِ بشر کے دلوں میں ایمان کی جڑیں راسخ کر سکتی تھی۔ یہ بھی ایک اور نعمت تھی۔

❖ ❖ ❖

## چند نکات:

**۱۔ یحییٰؑ، عشقِ الٰہی میں سرشار پیغمبر:** حضرت یحییٰؑ کا نام سورہ آلِ عمران، انعام، مریم اور انبیاء میں مجموعی طور پر پانچ مرتبہ آیا ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بچپن میں مقامِ نبوت پر فائز ہوئے۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں اس سن و سال میں ایسی روشن عقل اور اتنی تابناک فہم و فراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

اس پیغمبر کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک کے بارے میں قرآن نے سورہ آلِ عمران کی آیہ ۳۹ میں اشارہ کیا ہے۔ اور ان کی "حصور" کے ساتھ توصیف و تعریف ہے۔ جیسا کہ ہم نے اُسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ "حصور"، "حصر" کے مادہ سے اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو کسی جہت سے محاصرہ میں قرار پائے، اور اس مقام پر بعض روایات کے مطابق شادی سے اجتناب کرنے کے معنی میں ہے۔



Marfat.com

یہ کام ان کے لیے اس لحاظ سے امتیاز تھا کہ یہ ان کی انتہائی عفت و پاکیزگی کو بیان کرتا ہے یا وہ زندگی کے مخصوص حالات کی بناء پر دینِ الٰہی کی تبلیغ کیلیے متعدد سفروں پر جانے پر مجبور تھے اور حضرت عیسٰی مسیحؑ کی طرح مجرد زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

یہ تفسیر بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں "حصور" سے مراد وہ شخص ہے کہ جس نے دنیاوی خواہشات اور ہوا و ہوس کو ترک کر دیا ہو اور درحقیقت یہ زہد کا ایک اعلیٰ مرحلہ ہو[1]۔

بہرحال منابع اسلامی اور منابع مسیحی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحیٰیؑ حضرت عیسٰیؑ کی خالہ کے بیٹے تھے۔

منابع مسیحی میں تصریح ہوئی ہے، کہ حضرت یحیٰیؑ نے حضرت عیسٰیؑ کو غسل تعمید دیا اور اسی لیے انہیں "یحیٰی تعمید دہندہ" کے نام سے پکارتے ہیں (غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اُسے گناہ سے پاک کرتا ہے) اور جب حضرت مسیحؑ نے اعلانِ نبوت کیا تو حضرت یحیٰیؑ ان پر ایمان لائے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت یحیٰیؑ کوئی خاص آسمانی کتاب نہیں رکھتے تھے اور یہ جو بعد کی آیات میں ہم پڑھتے ہیں :-

یا یحیٰی خذ الکتاب بقوۃ

اے یحیٰی ! کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔

یہ حضرت موسٰیؑ کی کتاب تورات کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ کچھ لوگ حضرت یحیٰیؑ کے پیرو ہیں وہ ان کی طرف ایک کتاب کی نسبت بھی دیتے ہیں اور شاید "موحد صابئین" حضرت یحیٰیؑ کے پیرو ہیں[2]۔

حضرت یحیٰیؑ اور حضرت عیسٰیؑ میں بعض چیزیں قدرِ مشترک تھیں۔ انتہائی زیادہ زہد و تقویٰ، مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر ترک ازدواج، معجزانہ طور پر پیدا ہونا اور اسی طرح بہت ہی زیادہ قریبی نسب۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت یحیٰیؑ میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں، لہٰذا امام علی بن الحسین زین العابدینؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خرجنا مع الحسین بن علی (ع) فما نزل منزلا و لا رحل منه الا ذکر یحیٰی بن زکریا و قتله، وقال و من هوان الدنیا علی الله ان رأس یحیٰی بن زکریا اهدی الی بغی من بغایا بنی اسرائیل

ہم امام حسینؑ کے ساتھ (کربلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جس منزل میں نزول اجلال فرماتے یا اُس سے کوچ کرتے تو یحیٰیؑ اور ان کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک دُنیا کی بے قدری کے لیے یہی کافی ہے کہ یحیٰی بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کے پاس ہدیہ کے طور پر لایا گیا[3]۔

---

[1] اس بارے میں کہ محض ترک ازدواج اکیلا باعث فضیلت نہیں ہو سکتا اور قانونِ اسلام نے ازدواج کے سلسلے میں تاکید کی ہے۔ تفسیر نمونہ کی دوسری جلد صفحہ ۳۱۴ (اُردو ترجمہ) میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

[2] اعلام قرآن صفحہ ۶۶۔

[3] نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۳۲۴۔



Marfat.com

حضرت امام حسینؑ کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰؑ کی شہادت کی مانند تھی۔ (حضرت یحییٰؑ کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسینؑ کا نام بھی حضرت یحییٰؑ کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (اور پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت شکم مادر میں تھے، معمول کی نسبت بہت کم تھی۔

۲۔ **محراب** : یہ ایک ایسی مخصوص جگہ ہوتی ہے کہ جو عبادتگاہ میں امام یا پیش نماز کے لیے مخصوص کردی جاتی ہے اور اس کا نام رکھنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ یہ مادہ " حرب " سے جو جنگ کے معنی میں ہے لیا گیا ہے۔ کیونکہ محراب درحقیقت شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ مبارزہ اور جنگ کرنے کی جگہ ہے۔

دوسرے یہ کہ محراب لغت میں مجلس کے سب سے بلند مقام کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کی جگہ عبادت گاہ کے اُوپر والے حصہ میں ہوتی تھی لہٰذا اُسے یہ نام دیا گیا۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ، جو کچھ ہمارے ہاں معمول ہے، اُس کے برعکس بنی اسرائیل میں " محراب " سطح زمین سے کچھ اُوپر ہوتی تھی اور اس میں کچھ سیڑھیاں ہوتی تھیں اور اس کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوئی ہوتی تھی، اس طرح سے کہ جو لوگ محراب میں ہوتے تھے وہ باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ فخرج علی قومه من المحراب " کا جملہ جو ہم نے مذکورہ بالا آیات میں پڑھا ہے لفظ " علیٰ " پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو عام طور پر اُوپر کی سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

۱۲۔ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۚ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝

۱۳۔ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۚ وَكَانَ تَقِيًّا ۝

۱۴۔ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝

۱۵۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

## ترجمہ

۱۲۔ اے یحییٰ ! (اللہ کی) کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور ہم نے فرمانِ نبوت (اور کافی عقل و شعور) اسے بچپن میں عطا کی۔

۱۳۔ اور اُسے اپنی بارگاہ سے رحمت و محبت عطا کی اور (رُوح و عمل کی) پاکیزگی بھی اور وہ پرہیزگار تھا۔

۱۴۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے نیکوکار تھا اور جبّار (و متکبر) اور عاصی و نافرمان نہیں تھا۔

۱۵۔ اور اُس پر سلام ہے، اُس دن جبکہ وہ پیدا ہوا اور اُس دن جبکہ وہ مرے گا اور اُس دن جبکہ وہ زندہ کرکے اُٹھایا جائے گا۔



Marfat.com

# تفسیر

## حضرت یحییٰؑ کی عمدہ صفات:

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے کس طرح حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں حضرت یحییٰؑ کا سا فرزند سعید مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد ہم ان آیات میں خداوند تعالیٰ کا اہم فرمان یحییٰؑ سے خطاب کی صورت میں پڑھتے ہیں: اسے یحییٰ! کتاب خدا کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو (یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ)۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد "تورات" ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس سلسلے میں اجماع و اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔[1]

لیکن بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود ایک مخصوص کتاب رکھتے تھے۔ (داؤد کی زبور کی طرح) البتہ وہ ایسی کتاب نہیں تھی کہ جو کسی نئے دین یا جدید مذہب کو پیش کرتی ہو۔[2]

بہر حال کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ آسمانی کتاب تورات اور اس کے مطالب و احکام کا اجرا مکمل اور قطعی صورت میں عزم راسخ اور آہنی ارادہ کے ساتھ کریں، اس ساری کتاب پر عمل کریں، اسے عام کرنے کے لیے ہر قسم کی مادی و روحانی اور انفرادی و اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھائیں۔ اصولی طور پر کسی کتاب اور کسی مکتب و مسلک کو اس کے پیروکاروں کی قوت، طاقت اور قاطعیت کے بغیر جاری نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام مومنین اور اللہ کی راہ کے تمام راہیوں کے لیے ایک درس ہے۔

اس حکم کے بعد ان دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰؑ کو عطا فرمائی تھیں یا انہوں نے توفیق الٰہی سے کسب کی تھیں:

۱۔ ہم نے اسے بچپن میں فرمانِ نبوت اور عقل و ہوش و درایت عطا کی (واٰتینٰہ الحکم صبیًا)۔

۲۔ ہم نے اپنی طرف سے اسے بندوں کے لیے رحمت و محبت بخشی (وحنانًا من لدنا)۔ "حنان" اصل میں رحمت، شفقت، محبت اور لوگوں کے ساتھ تعلق و میلان کے اظہار کے معنی میں ہے۔

۳۔ ہم نے اسے روح و جان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی (وزکوۃً)۔

مفسرین نے "زکوٰۃ" کے مختلف معانی کیے ہیں۔ بعض نے اس کی عمل صالح سے بعض نے اطاعت و اخلاص سے، بعض نے ماں باپ سے نیکی کرنے سے، بعض نے حسن شہرت سے اور بعض نے پیروکاروں کی پاکیزگی سے تفسیر کی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ لفظ زکات ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام پاکیزگیاں شامل ہیں۔

۴۔ وہ پرہیزگار تھے اور جو بات فرمان پروردگار کے خلاف ہوتی تھی اس سے دوری اختیار کرتے تھے۔ (وکان تقیًا)۔

۵۔ اسے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گفتار، نیکوکار اور محبت کرنے والا پایا۔ (وبرًا بوالدیہ)۔

۶۔ وہ خلق خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم و متکبر نہیں تھا (ولم یکن جبارًا)۔

---

[1] تفسیر "آلوسی" اور تفسیر "قرطبی" کی طرف زیر بحث آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔

[2] تفسیر "المیزان" کی طرف زیر بحث آیہ کے ذیل میں رجوع کریں۔



Marfat.com

۷۔ وہ معصیت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا (عصیًا)

۸، ۹، ۱۰۔ اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہذا جس دن وہ پیدا ہوا اُس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے قبر سے اُٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر ہمارا درود و سلام ہو، (وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت و یوم یبعث حیًا)

# چند نکات

**۱۔ آسمانی کتاب کو قوت و طاقت کے ساتھ پکڑلو:** جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "یا یحیٰی خذ الکتاب بقوۃ" کے جملے میں لفظ "قوۃ" مکمل طور پر ایک وسیع معنی رکھتا ہے جس میں تمام مادی و معنوی اور رُوحانی وجسمانی قوتیں جمع ہیں اور یہ چیز خود اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ دین الٰہی اور اسلام و قرآن کی حفاظت کمزوری، سُستی و کاہلی، لنگڑے لُولے بن کر پڑے رہنے اور غفلت شعاری کے ساتھ ممکن نہیں ہے، بلکہ یہ قوت و طاقت اور قاطعیت کے طاقتور قلعے کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔

اگرچہ یہاں پر مخاطب حضرت یحیٰیؑ ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے دوسرے مواقع پر یہ تعبیر دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی صادق آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے: سورہ اعراف کی آیہ ۱۴۵ میں حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ تورات کو قوت کے ساتھ پکڑیں

فخذھا بقوۃ

اور سورہ بقرہ کی آیہ ۶۳ اور ۹۳ میں یہی خطاب تمام بنی اسرائیل کے لیے ہے:

خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے جو سب کے لیے ہے نہ کہ کسی خاص شخص یا اشخاص کے لیے۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہی مفہوم دوسرے لفظوں میں سورہ انفال کی آیہ ۶۰ میں تمام مسلمانوں کے لیے بیان ہوا ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ

جس قدر قوت و طاقت تمہارے بس میں ہو دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے فراہم کرو۔

بہرحال یہ آیہ اُن سب لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ کمزوری اور ضعف کے ساتھ بھی کوئی کام سرانجام دیا جا سکتا ہے یا جو یہ چاہتے ہیں کہ تمام حالات میں حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہوئے مشکلات کو حل کریں۔

**۲۔ انسان کی سرنوشت کے تین مشکل دن:** "سلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیًا" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی زندگی کی تاریخ میں اور اس کے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے میں تین دن بہت سخت ہیں:

ا۔ اس دنیا میں قدم رکھنے کا دن (یوم ولد)

ب۔ موت اور عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کا دن (یوم یموت)

ج۔ اور دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے کا دن (ویوم یبعث حیًا)

اور چونکہ ان تین انتقالی دنوں میں فطرتاً کئی طرح کے بحرانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا خداوند تعالیٰ ان میں اپنے مخصوص بندوں کو سلامتی اور عافیت عطا



Marfat.com

فرماتا ہے اور انہیں ان تینوں طوفانی مرحلوں میں اپنی حمایت کے جلو میں لے لیتا ہے۔

اگرچہ قرآن مجید میں یہ تعبیر صرف دو مقام پر آئی ہے۔ ایک حضرت یحییٰ کے بارے میں اور دوسرے حضرت عیسیٰ کے بارے میں لیکن حضرت یحییٰ کے بارے میں قرآن مجید کی یہ تعبیر ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، کیونکہ یہاں اس بات کا کہنے والا خدا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ کے لیے کہنے والے خود حضرت عیسیٰ ہیں۔

یہ بات بغیر کسے واضح و روشن ہے کہ جو لوگ اپنے حالات میں ان دونوں بزرگواروں سے مشابہت رکھتے ہیں وہ بھی اس سلامتی میں شامل سمجھے جائیں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہم السلام سے منقول ایک روایت میں ہے کہ:

ان اوحش مایقوم علی هذا الخلق فی ثلاث مواطن: یوم یلد ویخرج من بطن امه فیری الدنیا، ولیوم یموت فیعاین الاٰخرة واهلها، ولیوم یبعث حیًا، فیری احکامًا لم یرها فی دار الدنیا وقد سلّم الله علی یحییٰ فی هذه المواطن الثلاث وآمن روعته فقال وسلام علیه ... ...

انسان کے لیے وحشت ناک ترین مرحلے تین ہیں:-

"اول" وہ دن کہ جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی نظر دنیا پر پڑتی ہے۔

"دوسرے" وہ دن کہ جس میں وہ مرتا ہے اور آخرت اور اہل آخرت کو دیکھتا ہے۔

"تیسرے" وہ دن کہ جس میں وہ قبر سے زندہ کرکے اٹھایا جائے گا اور وہ ایسے احکام و قوانین دیکھے گا کہ جو اس جہان میں حکم فرما نہیں تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان تینوں مرحلوں میں سلامتی کو حضرت یحییٰ کے شامل حال کیا ہے اور انہیں وحشتوں کے مقابلے میں امن و امان اور راحت و آرام دیا اور فرمایا:

وسلام علیه[1] ...

بارالہا! ان تینوں حساس اور بحرانی مراحل میں ہمیں بھی سلامتی مرحمت فرما۔

۲۔ **بچپن میں نبوت**: یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقاء کا دور عام طور پر ایک خاص حد پر ہوتا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانوں میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں۔ تو اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ خداوند تعالیٰ (عقل کے ارتقاء کے) اس دور کو بعض بندوں کے لیے کچھ مصالح کی بنا پر زیادہ مختصر کر دے اور کم سے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے۔ جیسا کہ بچوں کے لیے بولنا سیکھنے کے لیے عام طور پر ایک دو سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پُر معنی تھی، اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افراد کے شایان شان تھی جیسا کہ، انشاء اللہ، آیندہ آیات کی تفسیر میں بیان ہوگا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض آئمہ کے بارے میں کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقام امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، ج ۳، ص



Marfat.com

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ :

میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جبکہ آپ کا سن بہت چھوٹا تھا) میں ان کے قد وقامت میں گم ہوگیا تاکہ اُسے اپنے ذہن میں بٹھالوں اور جب میں واپس مصر لوٹ کر جاؤں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم وکیف کو بیان کروں۔ عین اُسی وقت جب کہ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رُخ کیا اور فرمایا اے علی بن اسباط! خداوند تعالیٰ نے مسئلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اُسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے وہ فرماتا ہے :-

وآتیناه الحکم صبیًّا

"ہم نے یحییٰ کو بچپن میں فرمانِ نبوت وعقل و دانش عطا کی۔

اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے ،

حتّٰی اذا بلغ اشده وبلغ اربعین سنة .. .. ..

"جس وقت انسان کامل عقل کی حدِ بلوغ، چالیس سال کو پہنچ گیا .. .. ..

بنا بریں جس طرح یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی انسان کو حکمت و دانائی بچپن میں عطا فرما دے اسی طرح اس کی قدرت میں ہے کہ چالیس سال کی عمر میں دے [1]

ضمنی طور پر یہ آیت اُن اعتراض کرنے والوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مردوں میں سے پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے والے پہلے شخص نہیں تھے کیونکہ وہ تو اُس وقت دس سال کے بچے تھے اور دس سالہ بچے کا ایمان قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی یہاں پر غیر مناسب نہیں ہوگا۔ کہ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے :

آپ کے بچپن کے زمانہ میں کچھ بچے آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہا :

اذهب بنا نلعب

ہمارے ساتھ آؤ تاکہ ہم مل کر کھیلیں۔

تو آپ نے جواب میں فرمایا :

ما للعب خلقنا

ہم کھیلنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔

اسی سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے : وآتیناه الحکم صبیًّا

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں "لعب" سے مراد بیہودہ اور فضول قسم کی سرگرمیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بیہودہ مشاغل میں مشغول ہونا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیل کود کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ایسا مقصد کہ جو منطقی وعقلی ہو تو مسلّمہ طور پر ایسے کھیل کود اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ ، ص ۳۲۵۔



Marfat.com

۴۔ **حضرت یحییٰؑ کی شہادت** : نہ صرف حضرت یحییٰؑ کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی۔ اکثر مسلمان مؤرخین اور اسی طرح مشہور مسیحی منابع اُن کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگرچہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے):

حضرت یحییٰؑ اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بنا پر شہید ہوئے۔ ہوا یہ کہ ہیرودیس فلسطین کا ہوس پرست بادشاہ تھا۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی "ہیرودیا" پر عاشق ہوگیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے حُسن نے اِس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی۔ بادشاہ نے اُس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کرلیا۔

یہ خبر جب خداوند تعالیٰ کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰؑ کو پہنچی تو اُنھوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور تورات کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کروں گا۔

اس مسئلہ کی تمام شہر میں شہرت ہوگئی، اور یہ خبر اُس لڑکی "ہیرودیا کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ وہ حضرت یحییٰؑ کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی۔ اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ کسی مناسب موقع پر اُن سے انتقام لے گی اور اپنی ہوا و ہوس کی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹا دے گی۔ اُس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ و رسم میں اضافہ کردیا اور اپنے حُسن و جمال کو اس کے لیے ایک جال بنادیا اور اُس پر اس طرح سے اثر انداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اُس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔

ہیرودیا نے کہا: مَیں یحییٰ کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اُس نے مجھے اور تجھے بدنام کرکے رکھ دیا ہے۔ تمام لوگ ہماری عیب جوئی کر رہے ہیں۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہیئے۔

ہیرودیس جو اُس عورت کا دیوانہ تھا انجام پر غور کیے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہوگیا۔ اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰؑ کا سر اُس بدکار عورت کو پیش کردیا۔ لیکن آخر کار اس کے لیے اس کام کے ہولناک نتائج نکلے[1]

اسلامی روایات میں ہے کہ سالارِ شہیداں امام حسین علیہ السلام فرماتے تھے:

> دُنیا کی پستیوں میں سے یہ امر ہے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کے لیے ہدیہ کے طور پر لے جایا گیا۔

یعنی میرے اور یحییٰ کے حالات اس لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کیونکہ میرے قیام کا ایک ہدف میرے زمانے کے طاغوت یزید کے شرمناک اعمال کے خلاف قیام ہے۔

۱۶۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝

۱۷۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۪ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

---

[1] بعض اناجیل اور کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس نے اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ کہ جو تورات کے مطابق ممنوع تھی شادی کرلی تھی اور حضرت یحییٰؑ نے اُسے اس کام پر سخت لعنت ملامت کی۔ اس کے بعد اس عورت نے اپنی بیٹی کے حُسن و جمال کے ذریعے ہیرودیس کو حضرت یحییٰ کے قتل کرنے پر اکسایا۔ (انجیل متی باب ۱۴، انجیل مرقس باب ۶ بند ۱۷ اور اس کے بعد تک)۔



Marfat.com

۱۸۔ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ○

۱۹۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ○

۲۰۔ قَالَتْ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ○

۲۱۔ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً
مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ○

## ترجمہ

۱۶۔ اس کتاب (قرآن) میں مریم کو یاد کرو، اس وقت جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے جدا ہوئی اور مشرق کی جانب (ایک مقام پر جاکر ٹھہرگئی

۱۷۔ اور اپنے اور ان کے درمیان پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی خلوتگاہ ہر لحاظ سے عبادت کے لیے ہو) اُس وقت ہم نے اپنی رُوح اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب و نقص انسانی شکل میں مریم کے سامنے حاضر ہوئی۔

۱۸۔ (وہ بہت ڈری اور) اُس نے کہا: میں خدائے رحمٰن کی طرف تجھ سے پناہ مانگتی ہوں، اگر تو پرہیزگار ہے۔

۱۹۔ اُس نے کہا: میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں (میں اس لیے آیا ہوں) تاکہ تجھے ایک پاک و پاکیزہ بیٹا بخشوں۔

۲۰۔ اُس نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہو حالانکہ اب تک مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار عورت بھی نہیں ہوں۔

۲۱۔ اُس نے کہا: بات یہی ہے کہ تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لیے نشانی قرار دیں اور وہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور یہ فیصلہ شدہ امر ہے (اور اس میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے)

## تفسیر

### حضرت عیسیٰؑ کی ولادت :

حضرت یحییٰؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی داستان اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا قصہ شروع کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں قصوں کے درمیان بہت قریبی تعلق ہے۔ اگر حضرت یحییٰؑ کی پیدائش ایک ایسے بوڑھے اور ضعیف باپ سے اور ایک ایسی ماں سے جو بانجھ بھی عجیب تھی تو حضرت عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے ماں سے پیدا ہو جانا اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔

اگر بچپن میں عقل اور نبوت کے مقام تک پہنچنا حیرت انگیز ہے، تو گہوارے میں گفتگو کرنا اور وہ بھی کتاب و نبوت کے بارے میں اس سے



Marfat.com

بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔

بہرحال یہ دونوں خداوند تعالیٰ کی ایسی نشانیاں ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایسے اشخاص کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جو نسب کی حیثیت سے بہت ہی قریبی رشتہ رکھتے تھے۔ کیونکہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کی والدہ کی بہن تھی اور یہ دونوں خواتین بانجھ اور عقیم تھیں اور دونوں صالح اور نیک فرزند کی آرزو میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔

پہلی زیر بحث آیت کہتی ہے : آسمانی کتاب قرآن مجید میں مریم کی بات کرو کہ جس وقت اُس نے اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر مشرقی حصہ میں قیام کیا۔

(واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اهلها مکانا شرقیا)۔

درحقیقت وہ ایک ایسی خالی اور فارغ جگہ چاہتی تھی جہاں پر کسی قسم کا کوئی شور و غل نہ ہو تاکہ وہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہ سکے اور کوئی چیز اُسے یادِ محبوب سے غافل نہ کرے، اسی مقصد کے لیے اس نے عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کی مشرقی سمت کو جو شاید زیادہ آرام و سکون کی جگہ تھی یا سورج کی روشنی کے لحاظ سے زیادہ پاک وصاف اور زیادہ مناسب تھی، انتخاب کیا۔

لفظ "انتبذت"، "نبذ" کے مادہ سے ہے۔ راغب کے قول کے مطابق، جو چیزیں ناقابلِ ملاحظہ ہوں انہیں دُور پھینکنے کے معنی میں ہے اور مذکورہ بالا آیت میں یہ تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مریمؑ نے متواضعانہ اور گمنامی کی صورت میں اور ہر قسم کے ایسے کام سے خالی ہو کر، جو توجہ کو اپنی طرف لے جائے، سب سے کنارہ کشی اختیار کی اور خانۂ خدا کی اس جگہ کو عبادت کے لیے چُنا۔

❁ ❁ ❁

اس وقت مریم نے " اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ ڈال لیا " تاکہ اس کی خلوت گاہ ہر لحاظ سے کامل ہو جائے۔

(فاتخذت من دونهم حجابا)۔

اس جملے میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئی کہ یہ پردہ کس مقصد کے لیے کیا گیا تھا۔ آیا اس مقصد کے لیے تھا کہ زیادہ یکسوئی کے ساتھ شور و غل سے یکسوئی کے ساتھ پروردگار کی عبادت اور اُس سے راز و نیاز کر سکے یا اس لیے تھا کہ نہائیں دھوئیں اور غسل کریں، آیت اس لحاظ سے خاموش ہے۔

بہرحال اس وقت ہم نے اپنی " رُوح " ( جو بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے ) اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں مریم کے سامنے ظاہر ہوئی ( فارسلنا الیها روحنا فتمثل لها بشرا سویا)۔

ظاہر ہے ایسے موقع پر مریم کی کیا حالت ہوگی۔ وہ مریم کہ جس نے ہمیشہ پاکدامنی کی زندگی گزاری، پاکیزہ افراد کے دامن میں پرورش پائی اور تمام لوگوں کے درمیان عفت و تقویٰ کی ضرب المثل تھی، اس پر اس قسم کے منظر کو دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ ایک خوبصورت اجنبی آدمی اس کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس پر بڑی وحشت طاری ہوئی۔ فوراً پکاریں کہ میں خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھے تجھ سے بچائے۔ اگر تو پرہیزگار ہے۔

(قالت انی اعوذ بالرحمٰن منك ان کنت تقیا)۔

اور یہ خوف ایسا تھا کہ جس نے مریم کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدائے رحمان کا نام لینا اور اس کی رحمتِ عامہ کے ساتھ توصیف کرنا ایک طرف اور اُسے تقویٰ اور پرہیزگاری کی تشویق کرنا دوسری طرف، یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اگر وہ اجنبی آدمی کوئی بُرا ارادہ رکھتا ہو تو اس پر کنٹرول کرے



Marfat.com

اور سب سے بڑھ کر خدا کی طرف پناہ لینا، وہ خدا کہ جو انسان کے لیے سخت ترین حالات میں سہارا اور جائے پناہ ہے اور کوئی قدرت اس کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

❖ ❖ ❖

حضرت مریمؑ یہ بات کہنے کے ساتھ اس اجنبی آدمی کے ردِ عمل کی منتظر تھیں۔ ایسا انتظار جس میں بہت پریشانی اور وحشت کارنگ تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی، اُس اجنبی نے گفتگو کے لیے زبان کھولی اور اپنی عظیم ذمہ داری اور ماموریت کو اس طرح سے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں (قال انما انا رسول ربكِ)۔

اس جملے نے اُس پانی کی طرح جو آگ پر چھڑکا جائے حضرت مریمؑ کے پاکیزہ دل کو سکون بخشا۔ لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ اُس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا لڑکا بخشوں جو جسم و رُوح اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو (لاهب لك غلامًا زكيًّا)۔

❖ ❖ ❖

یہ بات سُنتے ہی مریمؑ کانپ اُٹھیں وہ پھر ایک گہری پریشانی میں ڈوب گئیں اور" کہا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہو حالانکہ کسی انسان نے اب تک مجھے چھُوا تک نہیں اور میں ہرگز کوئی بدکار عورت بھی نہیں ہوں" (قالت انّٰی یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اك بغيًّا)۔

وہ اس حالت میں صرف معمول کے اسباب کے مطابق سوچ رہی تھیں کیونکہ کوئی عورت صاحب اولاد ہو، اس کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو وہ شادی کرے یا بدکاری اور انحراف کا راستہ اختیار کرے میں تو خود کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پر جانتی ہوں، نہ تو ابھی تک میرا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی میں کبھی منحرف عورت رہی ہوں۔ اب تک تو یہ بات ہرگز سننے میں نہیں آئی کہ کوئی عورت ان دونوں صُورتوں کے سوا صاحبِ اولاد ہوئی ہو۔

❖ ❖ ❖

لیکن جلدی ہی اس نئی پریشانی کا طوفان بھی پروردگارِ عالم کے قاصد کی ایک دوسری بات سننے سے تھم گیا اس نے مریم سے صراحت کے ساتھ کہا: "مطلب تو یہی ہے کیونکہ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام میرے لیے سہل اور آسان ہے" (قال كذالكِ قال ربكِ هو علی هين)۔

تُو تو اچھی طرح میری قدرت سے آگاہ ہے۔ تُو نے تو بہشت کے وہ پھل جو دنیا میں اس فصل میں ہوتے ہی نہیں اپنے محراب عبادت کے پاس دیکھے ہیں، تو نے تو فرشتوں کی وہ آوازیں سُنی ہیں جو تیری پاکیزگی کی شہادت کے لیے تھیں۔ تجھے تو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے جدّ امجد آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے۔ پھر یہ کیسا تعجب ہے کہ جو تجھے اس خبر سے ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اُس نے مزید کہا: ہم چاہتے ہیں کہ اُسے لوگوں کے لیے آیت اور ایک معجزہ قرار دیں۔ (ولنجعله اٰية للناس)۔

اور ہم چاہتے ہیں کہ اُسے اپنے بندوں کے لیے اپنی طرف سے رحمت قرار دیں (و رحمة منا)۔ بہرحال یہ فیصلہ شدہ امر ہے اور اس میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے (وكان امرًا مقضيًّا)۔



Marfat.com

# چند نکات :

۱۔ رُوحِ خُدا سے کیا مُراد ہے ؟ تقریباً تمام مشہور مفسرین نے یہاں پر رُوح کی خداوند تعالیٰ کے بزرگ فرشتے جبرئیل سے تفسیر کی ہے اور اسے رُوح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو حیات بخش ہے۔ چونکہ وہ انبیاء و مرسلین کے پاس خداوند تعالیٰ کی رسالت کا پہنچانے والا ہے لہذا تمام لائق انسانوں کے لیے حیات بخش ہے اور یہاں پر رُوح کی خدا کی طرف اضافت اس رُوح کی عظمت و شرافت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اضافت کی ایک قسم اضافتِ تشریفیہ ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل کا نازل ہونا انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ البتہ شریعت اور کُتب آسمانی لانے کے لیے وحی کے عنوان سے صرف اُنہیں کے اُوپر نازل ہوا کرتا تھا لیکن دوسرے پیغامات پہنچانے کے لیے (جیسا کہ مذکورہ بالا پیغام حضرت مریمؑ کو پہنچایا) کوئی مانع نہیں ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسروں کے سامنے بھی ظاہر ہو۔

❖ ❖ ❖

## ۲۔ "تمثل" کیا ہے ؟

"تمثل" اصل میں مادہ مثول سے کسی شخص یا چیز کے سامنے کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، اور تمثل اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس بناء پر "فتمثل لها بشرا سويًا" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خدائی فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ جبرئیل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتے جیسی تھی، لیکن حضرت مریمؑ کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ خبر نہیں تھی لہذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

اسلامی روایات اور تواریخ میں "تمثل" اس لفظ کے وسیع معنی میں بہت نظر آتا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ: جس دن مشرکین مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نابود کرنے کے لیے سازش کر رہے تھے تو ابلیس ایک خیراندیش و خیرخواہ بوڑھے آدمی کے لباس میں ظاہر ہوا اور سردارانِ قریش کو بہکانے میں مشغول ہو گیا۔

یا دوسری روایت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی باطنی حالت حضرت علی علیہ السلام کے سامنے ایک حسین و جمیل دلربا عورت کی شکل میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ آپ پر کچھ بھی اثر نہ کر سکی۔ یہ واقعہ مفصل اور مشہور ہے۔

تیسرے روایات میں یہ بھی ہے کہ انسان کا مال و اولاد اور عمل موت کے وقت مختلف اور مخصوص چہروں میں اس کے سامنے مجسم ہوتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ انسان کے اعمال قبر میں اور قیامت کے دن مجسم ہو کر ظاہر ہوں گے اور ہر عمل ایک خاص شکل میں ظاہر ہو گا۔ ان تمام مواقع پر "تمثل" کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز یا کوئی شخص ظاہری طور پر دوسرے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کا باطن یا اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ صفحہ ۳۹۔



Marfat.com

۲۲۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝

۲۳۔ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝

۲۴۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝

۲۵۔ وَهُزِّىْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝

۲۶۔ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْۤ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝

## ترجمہ

۲۲۔ آخرکار (مریم) حاملہ ہوگئی اور وہ اسے دُور دراز مقام کی طرف لے گیا۔

۲۳۔ دردِ زہ کی تکلیف اسے ایک کھجور کے تنے کی طرف لے گئی (وہ اس قدر پریشان ہوئی کہ) اُس نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل فراموش ہوگئی ہوتی۔

۲۴۔ اچانک اس کے پاؤں کے نیچے کی طرف سے (کسی نے) اسے پکار کر کہا کہ غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے (خوشگوار) پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔

۲۵۔ اور کھجور کے اس درخت کو ہلا تاکہ تر و تازہ کھجوریں تجھ پر گریں۔

۲۶۔ اس (لذیذ غذا) میں سے کھا اور اس (خوشگوار پانی) میں سے پی اور اپنی آنکھوں کو (اس ننھے مولود سے) روشن رکھ۔ اور جب تو انسانوں میں سے کسی کو دیکھے تو اشارے سے کہہ دے کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے اور میں آج کسی کے ساتھ بات نہیں کروں گی۔ (یہ نومولود خود ہی تیرا دفاع کرے گا)۔

## تفسیر

### مریمؑ سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں:

"سرانجام مریم حاملہ ہوگئی" اور اُس موعود بچے نے اس کے رحم میں جگہ پائی (فحملتہ)۔



Marfat.com

اس بارے میں کہ یہ بچہ کس طرح وجود میں آیا، کیا جبرئیل نے مریم کے پیراہن میں پھونکا یا ان کے منہ میں، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

بہرحال اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دُور دراز مقام پر چلی گئی (فانتبذت به مکانًا قصيًّا)۔

وہ اس حالت میں ایک امید وبیم کے درمیان پریشانی وخوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی، کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ آخرکار یہ حمل ظاہر ہو جائے گا۔ مانا کہ چند دن یا چند مہینے اُن لوگوں سے دُور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کرلوں گی مگر آخرکار کیا ہوگا؟ کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی۔ سوائے اس کے کہ اس کا دامن آلودہ ہو، میں اس اتہام کے مقابلہ میں کیا کروں گی۔ واقعاً وہ لڑکی کہ جو سالہا سال سے پاکیزگی وعفت اور تقویٰ و پرہیزگاری کی علامت تھی اور خدا کی عبادت وبندگی میں نمونہ تھی جس کے بچپنے میں کفالت کرنے پر بنی اسرائیل کے زاہد وعابد فخر کرتے تھے۔ اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیرنظر پرورش پائی تھی، خلاصہ یہ ہے کہ جس کے اخلاق کی دھوم اور پاکیزگی کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی اُس کے لیے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اُس کا یہ سب معنوی سرمایہ خطرے میں پڑگیا ہے اور وہ ایک ایسی تہمت کے گرداب میں پھنس گئی ہے کہ جو بدترین تہمت شمار ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا لرزہ تھا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔ یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا، وہ خدا کہ جس نے مجھے ایسے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے معجزانہ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتہام کے مقابلہ میں میرا دفاع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف وکرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دستِ رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریمؑ کی مدتِ حمل کس قدر تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ قرآن میں سربستہ طور پر بیان ہوا ہے (پھر بھی) بعض نے اُسے ایک گھنٹہ، بعض نے نو گھنٹے بعض نے چھ ماہ بعض نے سات ماہ بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کہا ہے لیکن یہ موضوع اس واقعے کے مقصد پر اثر نہیں رکھتا۔ روایات بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ "قصی" (دُور دراز) کہاں تھی، بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ شہر "ناصرہ" تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھر ہی میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

❊ ❊ ❊

جو کچھ بھی تھا مدتِ حمل ختم ہوئی اور مریم کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہوگئے انہیں سخت دردِ زہ کا آغاز ہوگیا۔ ایسا درد جو انہیں آبادی سے بیابان کی طرف لے گیا۔ ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی، خشک اور بے آب تھا۔ جہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اگرچہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزہ کی پناہ لیتی ہیں تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں، لیکن مریم کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع حمل کو دیکھے لہٰذا دردِ زہ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: وضع حمل کا وہ درد اسے کھجور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا۔ (فاجائها المخاض الى جزع النخلة)۔

"جذع النخلة" کی تعبیر: اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ "جزع" درخت کے تنہ کے معنی میں ہے، یہ نشاندہی کرتی ہے کہ:



Marfat.com

اس درخت کا صرف تنہ باقی رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا[1]

اس حالت میں غم و اندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریمؑ کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا ہے ایسا لحظہ کہ جس میں وہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا جو اب تک چھپا ہوا ہے اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تہمت کے تیروں کی بارش شروع ہو جائے گی یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہو کر بولیں، اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل بھلا دی جاتی۔ (قالت یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیًا منسیًّا)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریمؑ کو صرف آئندہ کی تہمتوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جو ان کے دل کو بے چین کیے ہوتے تھا۔ بلکہ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کا تھا کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدم و مددگار کے بغیر وضع حمل۔ سنسان بیابان میں بالکل تنہائی۔ آرام کے لیے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لیے پانی اور کھانے کے لیے غذا کا فقدان اور نومولود کے لیے نگہداشت کے کسی وسیلے کا نہ ہونا یہ ایسے امور تھے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔

"اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند تعالیٰ کے اتنے لطف و کرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ " اے کاش میں مر گئی ہوتی اور فراموش ہو چکی ہوتی " انہوں نے اس وقت میں جناب مریمؑ کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور اگر وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہو جائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں بھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی بھی خبر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور اُمید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا چمکنے لگا۔ یکایک ایک آواز ان کے کانوں میں آئی جو اُن کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہو رہی تھی اور واضح طور پر کہہ رہی تھی کہ غمگین نہ ہو۔ ذرا غور سے دیکھ تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (فناداھا من تحتھا ان لا تحزنی قد جعل ربك تحتك سریًّا)۔

❁ ❁ ❁

ایک نظر اپنے سر کے اُوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہ بارآور کھجور کے درخت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے اور اس کھجور کے درخت کو ہلاؤ تاکہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں (وھزی الیك بجذع النخلة تساقط علیك رطبا جنیًّا)

اس لذیذ اور قوت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس خوشگوار پانی میں سے پیو (فکلی واشربی)۔

اور اپنی آنکھوں کو اس نومولود سے روشن رکھو (وقری عینًا)۔

اور اگر آئندہ کے حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو۔ جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اُس سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی (فاما ترین من البشر احدًا فقولی انی نذرت للرحمٰن صومًا فلن اکلم الیوم انسیًّا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپ اپنا دفاع کرو۔ وہ ذات کہ جس نے یہ مولود تمہیں عطا کیا ہے اس نے تیرے دفاع کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد کر دی ہے اس لیے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم و اندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دو

---

[1] "جزع" بروزن "ذبح" اصل میں "جذع" (بروزن منع) سے ہے جس کا معنی کاٹنا اور قطع کرنا ہے۔



Marfat.com

ان پے در پے واقعات نے جو ایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے، ان کے دل کو پوری طرح روشن کر دیا تھا اور انہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

## چند اہم نکات :

۱۔ **حضرت مریمؑ کی مشکلات میں تربیت :** وہ حادثات جو اس مختصر سی مدت میں حضرت مریمؑ پر گزرے اور لطف خدا کے لیے حیرت انگیز مناظر جو ان کے سامنے آئے، وہ مسلمہ طور پر انہیں ایک اولوالعزم پیغمبر کی پرورش کے لیے تیار کر رہے تھے۔ تاکہ وہ اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے اپنی مادری ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے ادا کر سکیں۔

حادثات کی رفتار انہیں مشکلات کے آخری مرحلہ تک لے گئی یہاں تک کہ انہیں اپنے اور زندگی کے اختتام کے درمیان ایک قدم سے زیادہ فاصلہ دکھائی نہ دیتا۔

لیکن اچانک ورق اُلٹ جاتا اور تمام چیزیں ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑتیں اور وہ ہر لحاظ سے آرام و سکون اور مطمئن ماحول میں قدم رکھ دیتیں "ھزی الیك بجذع النخلة" کا جملہ کہ جو حضرت مریمؑ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ کھجور کے درخت کو ہلائیں تاکہ اُس کے پھل سے فائدہ اُٹھائیں۔ انہیں اور تمام انسانوں کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ زندگی کے سخت ترین لمحات میں بھی تلاش اور کوشش سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

یہ بات اُن لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ سوچتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ مریمؑ اس حالت میں کہ انہیں ابھی ابھی وضع حمل ہوا تھا، اُٹھیں اور کھجور کے درخت کو ہلائیں؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ خدا جس کے حکم سے خشک درخت بھی بار آور ہو گیا تھا، ہوا کو بھیج دیتا تاکہ وہ درخت کی شاخوں کو ہلاتی اور مریمؑ کے گرداگرد کھجوریں گراتی۔ یہ کیا ہوا کہ جب مریمؑ صحیح و سالم تھیں تو جنت کے پھل ان کی محراب کے پاس آجاتے لیکن اس وقت جبکہ وہ اس شدید مشکل میں گرفتار تھیں تو انہیں خود پھل چُننے پڑے؟

ہاں! مریمؑ کو خداوند تعالیٰ کا یہ حکم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب تک ہماری طرف سے حرکت نہیں ہوگی کوئی برکت نہیں ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو مشکلات کے وقت زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اور اس کے علاوہ جو باتیں اس کی قدرت و طاقت سے باہر ہیں ان کے لیے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دعا کرے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

برخیز و فشاں درخت خرما ۔۔۔ تا سیر شوی رسی بیارش

کان مریم تا درخت نفشاند ۔۔۔ خرما نفتاد در کنارش

۲۔ **مریمؑ نے موت کی تمنا کیوں کی؟** اس میں شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ سے موت کا تقاضا کرنا اچھا کام نہیں ہے لیکن کبھی انسان کی زندگی میں ایسے سخت حادثات بھی پیش آجاتے ہیں کہ جس سے زندگی کا ذائقہ بالکل تلخ اور ناگوار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مواقع پر کہ جہاں انسان مقدس مقاصد یا اپنے شرف و حیثیت کو خطرے میں دیکھتا ہے اور دفاع کی طاقت نہیں رکھتا، ایسے مواقع پر بعض اوقات رُوحانی اذیت سے رہائی کے لیے موت کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اس قسم کے افکار جو کہ شاید بہت ہی مختصر سی مدت کے لیے صورت پذیر ہوئے تھے زیادہ دیر تک نہ رہے اور خداوند تعالیٰ کے دو معجزات یعنی پانی کا چشمہ پھوٹنے اور کھجور کا خشک درخت بارآور ہوتے دیکھا تو یہ تمام افکار برطرف ہو گئے، اور اطمینان و سکون کا نور ان کے دل پر



Marfat.com

چھا گیا۔

**۳۔ ایک سوال کا جواب:** بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر معجزہ انبیاؑ اور آئمہؑ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر جناب مریمؑ کے لیے ایسے معجزات کیونکر ظہور پذیر ہوئے۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب کے لیے ان کو حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں سے قرار دیا ہے کہ جو تمہید کے طور پر وقوع پذیر ہوئے تھے اور وہ انہیں "**ارھاص**" سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ارھاص مقدمہ کے طور پر ظاہر ہونے والے معجزے کے معنی میں ہے)۔

لیکن اس قسم کے جوابات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ معجزات کا ظہور انبیاء اور آئمہ کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مانع نہیں رکھتا۔ یہ وہی چیز ہے کہ جسے ہم کرامت کہتے ہیں۔

معجزہ وہ ہے کہ جس میں "**تحدّی**" یعنی چیلنج ادّعائے نبوّت و امامت کے ساتھ ہو۔

٭ ٭ ٭

**۴۔ خاموشی کا روزہ:** مذکورہ بالا آیات کا ظاہری مفہوم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ ایک خاص مصلحت کی خاطر خاموشی پر مامور تھیں اور خداوند تعالیٰ کے حکم سے اس خاص مدّت میں بات کرنے سے اجتناب کر رہی تھیں تاکہ ان کا نومولود بچہ عیسیٰؑ بات کرنے کے لیے لب کشائی کرے اور ان کی پاکیزگی کا دفاع کرے، کیونکہ یہ بات ہر لحاظ سے مؤثر تر اور بہت سے امور پر محیط تھی۔

لیکن آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ **نذر سکوت** (خاموشی کے روزے کی منت ماننا) اُس قوم اور جمعیت کے لیے ایک جانا پہچانا کام تھا، اسی وجہ سے اس کام کے لیے انہوں نے جناب مریمؑ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن اس قسم کا روزہ شریعت اسلام میں مشروع اور جائز نہیں ہے۔

حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے:

صوم السکوت حرام

خاموشی کا روزہ حرام ہے۔ [۱]

یہ بات ظہور اسلام کے زمانے اور اُس زمانے کی شرائط میں اختلاف اور فرق کی وجہ سے ہے۔

ہاں البتہ اسلام میں کامل روزہ کے آداب میں سے ایک بات یہ ہے کہ انسان روزے کی حالت میں اپنی زبان کو گناہ اور مکروہات کی آلودگی سے بچائے اور اسی طرح اپنی آنکھوں کو ہر قسم کی آلودگی سے بند رکھے، جیسا کہ ہم امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

ان الصوم لیس من الطعام والشراب وحدہ، ان مریم قالت انی نذرت للرحمٰن صوماً، ای صمتاً، فاحفظوا السنتکم وغضوا ابصارکم ولا تحاسدوا ولا تنازعوا:

روزہ صرف کھانے اور پینے سے ہی نہیں ہے، حضرت مریمؑ نے کہا: کہ میں نے خدائے رحمٰن

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد ۷، صفحہ ۳۹۰۔



Marfat.com

کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے یعنی خاموش رہنے کی، اس بنا پر (جب تم روزہ کی حالت میں ہو تو) اپنی زبان کی حفاظت کرو، اپنی آنکھوں کو ہر اُس چیز سے کہ جس میں گناہ ہو بند رکھو ـــــ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور جھگڑا نہ کرو۔[1]

**۵۔ ایک قوت بخش غذا:** اس بات سے کہ مذکورہ بالا آیات میں صراحت کے ساتھ یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے لیے نومولود کی پیدائش کے وقت اُن کی غذا رطب (کھجور) کو قرار دیا ہے، مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عورتوں کے لیے وضع حمل کے بعد بہترین غذاؤں میں سے ایک رطب (تازہ کھجور) ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی اس مطلب کی طرف صراحت کے ساتھ اشارہ ہوا ہے:

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل فرمایا ہے:

لیکن اول ما تأکل النفساء الرطب فان اللّٰہ عزّ وجل قال لمریم وھزّی الیك بجزع النخلۃ تساقط علیك رطباً جنیّاً۔

پہلی چیز جو وضع حمل کے بعد عورت کو کھانی چاہیئے وہ رطب (تازہ کھجور) ہے کیونکہ خدائے عزّوجل نے مریمؑ سے فرمایا خرمے کے درخت کو ہلا تاکہ تازہ کھجوریں تجھ پر گریں۔[2]

اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس غذا کا کھانا نہ صرف ماں کے لیے مؤثر ہے بلکہ اس کے دُودھ کے لیے بھی مفید ہے۔

یہاں تک کہ چند ایک روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حاملہ عورت کے لیے بہترین غذا اور اس کی دوا رطب ہے:

ما تأکل الحامل من شیء ولا تتداوی بہ افضل من الرطب۔[3]

لیکن مسلمہ طور پر ہر چیز میں اور اسی طرح اس موضوع میں بھی اعتدال کو ملحوظِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ بعض روایات میں بھی بیان ہوا ہے، جو اسی بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

نیز یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تازہ کھجوریں نہ مل سکیں تو پھر عام کھجوروں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

غذاؤں پر تحقیقات کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے: کھجور میں جو بکثرت شکر پائی جاتی ہے وہ ہر قسم کی شکر کی نسبت کامل تر ہے یہاں تک کہ بہت سے مواقع پر شوگر کے مریض بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

یہی ماہرین کہتے ہیں کہ انہوں نے کھجور میں ۱۳ حیاتی اجزاء، اور پانچ قسم کے وٹامن معلوم کیے ہیں کہ جنہوں نے مجموعی طور پر کھجور کو ایک بھرپور غذائی منبع کی صورت دے دی ہے۔[4]

نیز یہ بات ہم جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں عورتوں کو قوت بخش اور وٹامن سے بھرپور غذاؤں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

علم طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دوا کی حیثیت سے کھجور کی اہمیت بھی ثابت ہو گئی ہے۔ کھجور میں کیلشیم موجود ہے کہ جو ہڈیوں کی مضبوطی کا اصل عامل ہے نیز اس میں فاسفورس بھی پایا جاتا ہے کہ جو مغز کو تشکیل دینے والے اصلی عناصر میں سے ہے اور اعصاب کے ضعف اور خستگی کو دُور

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ طبق نقل تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، صہ ۳۲۲۔

[2] [3] نور الثقلین، جلد ۳، صہ ۳۳۰۔ ایضاً

[4] اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر، جلد ۷، ص ۶۵۔



Marfat.com

کرنے والا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں پوٹاشیم بھی موجود ہے جس کی بدن میں کمی کو زخم معدہ کا حقیقی سبب سمجھا جاتا ہے۔[1]

۲۷۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ○

۲۸۔ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ
اُمُّكِ بَغِيًّا ۖ○

۲۹۔ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ○

۳۰۔ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۙ○

۳۱۔ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ۖ○

۳۲۔ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِىْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا ○

۳۳۔ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ○

# ترجمہ

۲۷۔ مریم اُسے گود میں لیے ہوئے اپنی قوم کی طرف آئیں تو انہوں نے کہا کہ اے مریم تُو نے تو بہت عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے۔

۲۸۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ ہی بُرا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔

۲۹۔ (مریم نے) اُس کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ ہم اس بچّے کے ساتھ کہ جو ابھی گہوارہ میں ہے کیسے بات کریں؟

۳۰۔ (اچانک عیسیٰؑ بول اُٹھے اور) کہا کہ مَیں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے آسمانی کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

۳۱۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے برکتوں والا بنایا ہے اور مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔

۳۲۔ اور مجھے میری ماں کے لیے نیکوکار قرار دیا ہے اور جبّار و شقی قرار نہیں دیا۔

۳۳۔ اور مجھ پر (خدا کا) سلام ہے اس دن جبکہ میں پیدا ہوا اس دن جبکہ میں مروں گا اور اُس دن جب کہ مَیں زندہ ہو کر

---

[1] ۔ اوّلین دانشگاہ و آخرین پیغمبر، جلد ۷، صفحہ ۶۵۔



Marfat.com

اُٹھایا جاؤں گا۔

# تفسیر

## حضرت مسیحؑ کی گہوارے میں باتیں :

آخرکار حضرت مریمؑ اپنے بچے کو گود میں لیے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ داروں کے پاس آئیں۔ (فأتت به قومها تحمله)۔

جونہی انہوں نے ایک نومولود بچہ ان کی گود میں دیکھا تعجب کے مارے اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ لوگ کہ جو مریمؑ کی پاکدامنی سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے تقویٰ و کرامت کی شہرت کو سُن چکے تھے سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے کچھ تو شک و شبہ میں پڑ گئے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انہوں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بدکاری کے ساتھ تمہارے روشن ماضی پر بہت افسوس ہے اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا۔ کہنے لگے اے مریمؑ تو نے یقیناً بہت ہی عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے۔

(قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریاً) [1]

بعض نے ان کی طرف رُخ کیا اور کہا : " اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی "۔

(یا اخت هٰرون ما کان ابوك امرأ سوء و ما کانت امك بغیاً)۔

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں۔ تو نے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے چلن میں کونسی بُرائی دیکھی تھی کہ تُو نے اُس سے رُوگردانی کر لی !

یہ بات کہ جو انہوں نے مریمؑ سے کہی کہ " اے ہارون کی بہن " مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے، لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک و صالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔

وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے۔ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے [2]

ایک اور حدیث میں کہ جو کتاب " سعد السعود " میں آئی ہے اس میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغیرہ کو (عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے) نجران بھیجا تو عیسائیوں کی ایک جماعت نے قرآن پر اعتراض کے طور پر کہا : کیا تم اپنی کتاب میں یہ نہیں پڑھتے ہو " یا اخت هارون " حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہارون سے مراد حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہیں تو مریم اور ہارون کے درمیان تو بہت فاصلہ تھا۔

مغیرہ چونکہ جواب نہ دے سکا۔ لہذا اُس نے اس بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، تو آپؐ نے فرمایا :

تُو نے اُن کے جواب میں یہ کیوں نہ کہا کہ بنی اسرائیل کے درمیان یہ معمول تھا کہ نیک افراد کو انبیاء اور صالحین

---

[1] فری۔ کتاب مفردات میں راغب کے قول کی بنا پر عظیم یا عجیب کے معنی میں ہے اور اصل میں فری کے مادہ سے چمڑے کی چادر خراب کرنے کیلئے پارہ پارہ کرنے کے معنی میں ہے۔

[2] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۲۳۔



Marfat.com

کے ساتھ نسبت دیا کرتے تھے۔[1]

اس وقت جناب مریمؑ نے خداوند تعالیٰ کے حکم سے خاموشی اختیار کی، صرف ایک کام جو انہوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے نومولود بچے عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا (فاشارت الیہ)۔

لیکن اس کام نے اُن کے تعجب کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کو ان کے ساتھ ٹھٹھہ کرنے پر محمول کیا اور وہ غصّے میں آکر بولے : اے مریم! ایسا کام کرکے تو اپنی قوم کا مذاق بھی اُڑا رہی ہے۔

بہرحال اُنہوں نے اُس سے کہا : ہم ایسے بچے کے ساتھ کہ جو ابھی گہوارہ میں ہے کیسے باتیں کریں۔ (قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیًّا)۔

مفسرین نے لفظ "کان" کے بارے میں کہ جو ماضی پر دلالت کرتا ہے اس مقام پر بہت بحث کی ہے لیکن ظاہرًا یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر یہ لفظ موجود وصف کے ثبوت ولزوم کے لیے ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں انہوں نے جناب مریمؑ سے یہ کہا کہ ہم اس بچے سے کہ جو ابھی تک گہوارے میں ہے کیسے بات کریں؟

قرآن مجید کی دوسری آیات اس معنی پر شاہد ہیں مثلاً :

کنتم خیر اُمّۃ اخرجت للناس

"تم بہترین اُمت ہو کہ جو انسانی معاشرے کے فائدہ کے لیے وجود میں آئے ہو" (آل عمران - ۱۱۰)

مسلمہ طور پر لفظ "کنتم" (تم تھے) یہاں پر ماضی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی معاشرے کے لیے ان صفات کے تسلسل اور ثبوت کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے "مھد" (گہوارہ) کے بارے میں بھی بحث کی ہے، کہ ابھی تک حضرت عیسیٰؑ گہوارہ تک نہیں پہنچے تھے، بلکہ آیات کا ظاہر یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے اُس جمعیت کے پاس پہنچتے ہی، جبکہ حضرت عیسیٰؑ اُن کی آغوش میں تھے، اُن کے اور لوگوں کے درمیان باتیں ہوئیں۔

لیکن لغت عربی میں لفظ "مھد" کے معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

لفظ "مھد" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے ایسی جگہ کے معنی میں ہے کہ جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ چاہے وہ گہوارہ ہو یا ماں کی گود یا بستر اور مھد اور مھاد دونوں ہی لغت میں (المکان الممھد الموطاٗ) : "(آرام اور سونے کے لیے) تیار کی ہوئی اور بچھی ہوئی جگہ کے معنی میں"۔

بہرحال وہ لوگ اس کی یہ بات سُن کر پریشان ہوگئے، بلکہ شاید غضب ناک ہوگئے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس کا تمسخر اور استہزاء کرنا، جادۂ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لیے زیادہ سخت اور سنگین تر ہے

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ کیونکہ اس نومولود بچے نے بات کرنے کے لیے زبان کھولی اور کہا : میں اللہ کا بندہ ہوں (قال انی عبداللہ)۔ اُس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے (اٰتانی الکتاب)۔ اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے۔ (وجعلنی نبیًّا)۔

اور خدا نے مجھے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں۔ میرا وجود بندوں کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہے۔ (وجعلنی مبارکا اینما کنت)۔

---

[1] نورالثقلین، ج ۳، ص ۳۲۳



Marfat.com

اور اس نے مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے۔ (واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیًا)۔

۞ ۞ ۞

اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدردانی کرنے والا اور خیرخواہ قرار دیا ہے (و برًا بوالدتی)[۱]

اور اس نے مجھے جبار و شقی قرار نہیں دیا ہے (ولم یجعلنی جبارًا شقیًا)۔

"جبار" اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے لیے تو لوگوں پر ہر قسم کے حقوق کا قائل ہو۔ لیکن کسی دوسرے کے لیے اپنے اُوپر کسی بھی حق کا قائل نہ ہو۔ اس کے علاوہ "جبار" اُس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو غیض و غضب کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو۔ اور فرمانِ عقل کی پیروی نہ کرتا ہو۔ زیادہ یہ چاہتا ہو کہ اپنی کمی اور نقص کو تکبر اور بڑائی کے دعوے کے ذریعے پورا کرے۔ یہ ساری کی ساری صفات ایسی ہیں جو ہر زمانے کے طاغوتوں اور متکبرین سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں[۲]۔

"شقی" اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو معصیت و بلا اور سزا کے اسباب اپنے لیے فراہم کرتا ہے اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسا شخص ہے جو نصیحت قبول نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:

میرا دل نرم ہے اور میں اپنے آپ کو اپنے نزدیک چھوٹا سمجھتا ہوں[۳]۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات جبار و شقی کا نقطۂ مقابل ہیں۔

۞ ۞ ۞

آخر میں یہ نومولود کہتا ہے: "خدا کا مجھ پر سلام و درود ہو اس دن کہ جب میں پیدا ہوا اور اُس دن کہ جب میں مروں گا اور اُس دن کہ جب میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا" (والسلام علیّ یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیًا)۔

جیسا کہ ہم نے حضرت یحییٰؑ سے مربوط آیات کی شرح میں بیان کیا ہے، یہ تین دن انسان کی زندگی میں ــــ زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں کہ جن میں سوائے لطف خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی۔ اسی لیے حضرت یحییٰؑ کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے بارے میں بھی۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوند تعالیٰ نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت مسیحؑ نے یہ تقاضا کیا ہے۔

## چند اہم نکات:

۱۔ **قرآن کا حُسنِ بیان اور ولادتِ عیسیٰؑ:** قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اس قسم کے اہم مسائل میں خصوصیت کے ساتھ دیکھی

---

۱۔ "بَر" (باء پر زبر کے ساتھ) نیکوکار شخص کے معنی میں ہے جبکہ "بِر" (باء کی زیر کے ساتھ) نیکوکاری کی صفت کے معنی میں ہے۔ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ لفظ اُوپر والی آیت میں مبارکا پر عطف ہے نہ کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ پر اور فی الواقع معنی اس طرح ہے "جعلنی برًا بوالدتی" (مجھے اپنی والدہ کے لیے نیکوکار قرار دیا ہے)۔

۲۔ جبار کے بارے میں مزید وضاحت اور اس سوال کے جواب کے لیے کہ کس طرح خدا کی ایک صفت جبار ہے۔ تفسیر نمونہ کی جلد نہم ص۱۴۳ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ تفسیر فخر الدین رازی ذیل آیہ زیر بحث۔



Marfat.com

جا سکتی ہے۔ دیکھیئے کس طرح قرآن اس قدر خرافات سے مخلوط اہم مسئلے کو مختصر، گہری، زندہ، پُرمعنی، منہ بولتی اور ناطق عبارتوں کے ساتھ پیش کرتا ہے اس طرح سے کہ ہر قسم کی خرافات اور بیہودہ باتوں کو اس سے علیحدہ اور دُور کر دیتا ہے۔

جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں سات نمایاں صفات، دو اعمال اور ایک دعا کا ذکر ہوا ہے۔

سات صفات کی تفصیل یہ ہے:

**پہلی صفت** : خدا کا بندہ ہونا کہ جس کا ذکر تمام اوصاف کی ابتداء میں ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کا عظیم ترین مقام مقامِ عبودیت ہی ہے۔

**دُوسری صفت** : اُس کے بعد کتاب آسمانی کا حامل ہونا ہے۔

**تیسری صفت** : مقامِ نبوّت ہے۔ (البتہ ہم جانتے ہیں کہ مقامِ نبوّت کے لیے یہ بات لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ آسمانی کتاب کا حامل ہو)۔

**چوتھی صفت** : مقامِ عبودیت و رہبری کے بعد مبارک ہونے کا بیان ہے یعنی معاشرے کی حالت کے لیے مفید ہونے کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مبارک کا معنی نفّاع ہے (یعنی زیادہ نفع مند ہونا)۔

**پانچویں صفت** : ماں کے لیے نیکوکاری بیان کی گئی ہے۔

**چھٹی اور ساتویں صفت** : جبّار و شقی نہ ہونا اور ان کے بجائے متواضع، حق شناس اور سعادت مند ہونا ہے۔

تمام کاموں میں سے صرف دو یعنی پروردگارِ عالم کی طرف سے نماز و زکوٰۃ کی وصیّت کے بیان پر انحصار کرتے ہیں اور یہ ان دونوں پروگراموں اور کاموں کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں کام خالق و مخلوق کے ساتھ ارتباط کی رمز ہیں۔ ایک لحاظ سے تمام مذہبی پروگراموں کو انہیں دو میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض انسان کا رشتہ مخلوق سے اور بعض خالق سے جوڑتے ہیں۔

اَب رہ گئی وہ دعا کہ جو وہ اپنے لیے کرتے ہیں اور وہ التجا جو وہ اپنی زندگی کے آغاز میں خدا سے کرتے ہیں یہ ہے: بارِ خدایا! ان تین دنوں کو میرے لیے سلامتی والا قرار دے اوّل ولادت کا دن، دوسرے موت کا دن اور تیسرے وہ دن جبکہ قیامت میں مجھے زندہ ہونا ہے اور مجھے ان تینوں حساس مرحلوں میں امن و امان مرحمت فرما۔

**۲۔ ماں کا مقام** : اگرچہ حضرت عیسیٰؑ پروردگارِ عالم کے نافذ کردہ فرمان سے ماں سے، بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ بات کہ مذکورہ بالا آیت میں وہ اپنے افتخارات کو گنتے ہوئے ماں کے لیے نیکوکاری کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات ماں کے مقام اور رُتبہ کی اہمیت پر ایک روشن دلیل ہے ضمنی طور پر یہ اس بات کی بھی نشاندہی ہے کہ یہ نومولود بچہ ایک معجزہ کے مطابق لب اُٹھاتا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ جو صرف ماں سے پیدا ہوا ہے اور اس میں باپ کا دخل نہیں ہے۔

بہرحال اگرچہ آج کی دنیا میں ماں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ (سال میں) ایک دن کو روزِ مادر (ماں کا دن) کے نام سے مخصوص کر دیا گیا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مشینی تمدن کی وضع کچھ ایسی ہے کہ یہ ماں باپ کا اولاد سے ربط بہت ہی جلدی منقطع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ بڑا ہونے کے بعد اولاد میں یہ رابطہ احساس بہت ہی کم باقی رہتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام میں حیرت انگیز روایات ہیں جو مسلمانوں کو ماں کے مقام و مرتبہ کی اہمیت کے بارے میں بہت زیادہ وصیت کرتی ہیں۔



Marfat.com

تاکہ صرف زبانی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس سلسلے میں کوشش کریں۔

ایک حدیث۔ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ :

یا رسول اللہ من ابر؟ قال امك، قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من قال امك، قال ثم من قال اباك۔

اے پیغمبر خداؐ! میں کس کے ساتھ نیکی کروں۔ آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں سے۔ عرض کیا اس کے بعد کس سے؟ پھر فرمایا اپنی ماں سے۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر عرض کیا اس کے بعد کس سے؟ فرمایا اپنی ماں سے۔ چوتھی مرتبہ جب اس نے اس سوال کو دہرایا تو آپؐ نے فرمایا : اپنے باپ سے۔[۱]

ایک اور حدیث میں یہ منقول ہے کہ ایک نوجوان جہاد میں شرکت کے لیے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا (چونکہ جہاد واجب عینی نہیں تھا اس لیے) رسول اللہؐ نے فرمایا :

الك والدة قال نعم قال فالزمها فان الجنة تحت قدمها

کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا : جی ہاں۔ فرمایا : ماں کی خدمت میں رہو کیونکہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔[۲]

اس میں شک نہیں کہ اگر ہم اُن بے شمار زحمتوں کو، جو ماں حمل کے زمانے میں، وضع حمل تک پھر دُودھ پلانے کے زمانے میں اور دیکھ بھال کرنے میں اس کے بڑے ہونے تک برداشت کرتی ہے اور طرح طرح کے رنج اور دکھ میں راتوں کو جاگنے اور اس کی بیماریوں میں فرزند کے لیے کھلی آغوش کے ساتھ لگی رہنے کو۔ دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انسان اس راہ میں جس قدر بھی کوشش کرے پھر بھی وہ ماں کے حقوق کے بارے میں قرضدار ہے۔

جاذب نظر بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ جناب اُم سلمہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا :

تمام افتخارات تو مردوں کے حصے میں آگئے۔ بیچاری عورتوں کا ان اعزازات میں کیا حصہ ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

بلی اذا حملت المرئة كانت بمنزلة الصائم القائم المجاهد بنفسه وماله في سبيل الله فاذا وضعت كان لها من الاجر ما لا يدرى احد ما هو لعظمته، فاذا ارضعت كان لها بكل مصة كعدل عتق محرر من ولد اسمعيل. فاذا فرغت من رضاعه ضرب ملك كريم على جنبها وقال استأنفي العمل فقد غفر لك :

ہاں (عورتیں بھی بہت سے اعزاز رکھتی ہیں) جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے تو وہ تمام مدت حمل

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد ۱۵، ص ۲۰۷۔
[۲] جامع السعادات، جلد ۲، ص ۲۶۱۔



Marfat.com

ہیں روزہ دار، شب زندہ دار اور جان و مال کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی منزلت ہیں ہوتی ہے اور جس وقت اس کا وضع حمل ہوتا ہے، اللہ اسے اس قدر اجر دیتا ہے کہ کوئی شخص عظمت کی بناء پر اس کی حد کو نہیں جانتا اور جس وقت وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو خداوند تعالیٰ بچے کی طرف سے ہر چوسنے کے مقابلے میں اولادِ اسمٰعیلؑ میں سے ایک غلام آزاد کرنے کا اجر اُسے عطا کرتا ہے۔ اور جس وقت بچے کے دودھ پلانے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے خدا کے مکرم فرشتوں میں سے ایک اس کے پہلو پر ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے اعمال کو نئے سرے سے شروع کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تیرے سب گناہ بخش دیئے ہیں۔ (گویا تیرا نامۂ عمل نئے سرے سے شروع ہو رہا ہے)[1]

تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس سلسلہ کی کچھ بحثیں کی ہیں۔

٭ ٭ ٭

**۲۔ باکرہ سے بچہ پیدا ہونا** : مذکورہ بالا آیات سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ کے بغیر بچہ پیدا ہو۔ کیا حضرت عیسیٰؑ کا صرف اکیلی ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ، اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا بہت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

"ڈاکٹر الکسیس کارل" مشہور فرانسیسی فزیالوجسٹ اور حیات شناس اپنی کتاب "انسان موجودِ ناشناختہ" میں لکھتا ہے :

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں کہ تولید مثل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں "لوب" اور "باتائیون" کے تجربوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ قورباغہ کے بارور نہ ہوتے ہوئے چھوٹے سے تخم کو سپرماٹوزا کے دخل کے بغیر ہی خاص ٹکنیک کے ذریعہ ایک جدید قورباغہ کو وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کیمسٹری یا فزکس کے ایک عامل کو "نر سیل" کا جانشین بنا دیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل مادہ کا وجود ضروری ہے۔

اس بناء پر وہ چیز کہ جو سائنسی لحاظ سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ (اوول) کا وجود ہے۔ ورنہ نر کے نطفہ (اسپرماٹوزا) کی جگہ پر دوسرا عامل اس کا جانشین بنایا جا سکتا ہے۔ اسی بناء پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں کے نزدیک قابلِ قبول قرار پا چکی ہے، اگرچہ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ خداوند تعالیٰ کے قوانین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۱۸۵۔



Marfat.com

ان مثل عیسٰی عند اللّٰہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون :

عیسٰیؑ کی مثال خدا کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہوجا تو وہ بھی ایک کامل موجود ہوگیا۔ (آل عمران - ۵۹)

یعنی یہ خارق عادت اُس خارق عادت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

۴۔ نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے ؟ یہ بات کچھ کہے بغیر ظاہر ہے کہ معمول یہ ہے کہ کوئی نوزائیدہ بچہ تولد کے ابتدائی گھنٹوں یا دنوں میں بات نہیں کرتا۔ کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشوونما اور اس کے بعد زبان وحنجرہ کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے مختلف اعضا کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے۔ اور ان امور کے لیے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تاکہ یہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بچوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے۔ صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اسی قسم کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں نہ کہ محال عقلی۔ اس امر کی تشریح ہم نے انبیاءؑ کے معجزات کی بحث میں کردی ہے۔

۳۴۔ ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ○

۳۵۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحٰنَهٗ إِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُنْ فَيَكُونُ ○

## ترجمہ

۳۴۔ یہ ہے عیسٰی ابن مریم ، وہ حق بات کہ جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

۳۵۔ خداوند تعالیٰ کے لیے ہرگز یہ بات لائق نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ وہ منزہ ہے۔ جس وقت وہ کسی کام (کے کرنے) کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے ہوجا۔ پس وہ ہوجاتا ہے۔

## تفسیر

### کیا خدا کا بیٹا ممکن ہے؟

قرآن مجید سابقہ آیات میں عیسٰیؑ کی پیدائش کے واقعہ کی بہت ہی عمدہ اور روشن و واضح تصویر کشی کرنے کے بعد ان شرک آمیز باتوں



Marfat.com

اور خرافات کی نفی کرتے ہوئے جو اُن لوگوں نے عیسیٰؑ کے بارے میں کہی ہیں اس طرح کہتا ہے: یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم " (ذالک عیسی ابن مریم)۔ اس عبارت میں ان کے مریم کا بیٹا ہونے پر خصوصیت کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔ تاکہ یہی بات خدا کا بیٹا ہونے کی نفی کی تمہید اور مقدمہ بن جائے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ " یہ وہ قولِ حق ہے کہ جس میں انہوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور ہر ایک نے انحراف کی راہ اختیار کرلی ہے" (قول الحق الذی فیہ یمترون)[1]

یہ عبارت درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تمام گزشتہ مطالب کی صحت پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ان مطالب میں تھوڑی سی بھی غلطی نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قرآن جو یہ کہتا ہے کہ: وہ اس بارے میں شک و شبہ میں ہیں، یہ حضرت مسیحؑ کے دوستوں اور دشمنوں یا دوسرے الفاظ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک طرف سے ایک گمراہ گروہ نے ان کی والدہ کی پاکیزگی میں شک و شبہ کیا، اور دوسری طرف سے ایک گروہ نے ان کے ایک انسان ہونے میں اظہارِ شک کیا۔ یہاں تک کہ پھر یہی گروہ مختلف شعبوں اور قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ بعض نے انہیں صراحت کے ساتھ خدا کا بیٹا سمجھ لیا (روحانی و جسمانی اعتبار سے حقیقی بیٹا، نہ کہ مجازی بیٹا) اور اس کے ساتھ تین خداؤں اور تثلیث کا مسئلہ اٹھا۔ بعض نے مسئلہ تثلیث کو عقلی طور پر ناقابلِ فہم کہہ کر یہ اعتقاد رکھ لیا کہ اسے تعبداً قبول کر لیا جائے اور بعض نے اس کی منطقی توجیہ کے لیے بے بنیاد باتوں پر ہاتھ مارا۔ خلاصہ یہ کہ جب وہ حقیقت کو نہ پا سکے، یا جب انہوں نے حقیقت کو اختیار کرنا نہ چاہا۔ تو افسانے کی راہ پر چل نکلے[2]

⁂

اگلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے: خدا کے لیے یہ امر ہرگز شائستہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، وہ ایسی باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔ (ماکان للّٰہ ان یتخذ من ولد سبحانہ)۔

بلکہ وہ تو جس وقت بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے تو کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔ (اذا قضٰی امرًا فانما یقول لہ کن فیکون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ فرزند ہونا ——— جیسا کہ عیسائی خدا کے بارے میں خیال کرتے ہیں ——— پروردگارِ عالم کے مقامِ مقدس سے مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک طرف تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس کا جسم ہو، دوسری طرف سے محدودیت اور تیسری طرف سے احتیاج۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کے عقیدے کا نتیجہ خداوند تعالیٰ کو اس کے مقامِ مقدس سے کھینچ کر عالمِ مادہ کے قوانین کے ماتحت لانا اور اُسے ایک

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے، لیکن ادبی لحاظ سے اور گزشتہ آیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "قول الحق" مفعول ہے فعل محذوف کا اور "الذی فیہ یمترون" اُس کی صفت ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا: "اقول قول الحق الذی فیہ یمترون" ——— میں حق کی بات کہتا ہوں جس میں وہ شک کرتے ہیں۔

[2] نصاریٰ کی تثلیث اور اس بارے میں جو خرافات انہوں نے گھڑے ہیں ان کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد، سورہ نساء کی آیہ ۱۷۱۔ صفحہ ۱۷۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔



Marfat.com

ضعیف و محدود مادی وجود کے زمرہ میں قرار دینا ہے۔

وہ خدا کو جو اس قدر قدرت و توانائی رکھتا ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو اس وسیع و عریض عالم کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں کی مانند ہزارہا عالم محض اس کے ایک فرمان اور صرف اشارہ سے عالم ظہور میں آجائیں۔ کیا یہ بات شرک نہیں ہے اور اصول توحید و خدا شناسی سے انحراف نہیں ہے کہ ہم اُسے ایک انسان کی طرح صاحب فرزند سمجھ لیں اور وہ بیٹا بھی ایسا بیٹا کہ جو باپ کا ہم مرتبہ اور ہم پلہ ہو۔

"کُن فیکون" کی تعبیر جو قرآن مجید کی آیات میں آٹھ مواقع پر آئی ہے، امر خلقت میں خداوند تعالیٰ کی قدرت کی وسعت اور اس کے تسلّط و حاکمیت کی بہت ہی عمدہ تصویر ہے۔ فرمان "کن" کی تعبیر سے زیادہ مختصر کا تصور نہیں ہو سکتا اور کوئی "نتیجہ" "فیکون" سے زیادہ جامع نظر نہیں آتا۔ خصوصاً "فاء تفریع" کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس مقام پر فوری عمل درآمد کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس مقام پر فاء تفریع فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق تاخر زمانی پر بھی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ اسی تاخر رتبی کو بیان کرتی ہے جو معلول کے علت پر ترتب میں پائی جاتی ہے (غور کیجئے گا)

## فرزند کی نفی یعنی خدا سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی:

اصولی طور پر زندہ موجودات کو اولاد و فرزند کی احتیاج کس لیے ہوتی ہے؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کی عمر محدود ہوتی ہے اور اس غرض سے کہ ان کی نسل منقطع نہ ہو اور ان کی حیات نوعی جاری و ساری رہے لہٰذا ضرورت ہے اس بات کی کہ ان سے اولاد پیدا ہو۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے، ایسے کام جن میں انسانی قوت کے اکٹھا مل کر سرانجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس بات کا زیادہ سبب بنتی ہے کہ انسان کا تعلق فرزند کے ساتھ قائم رہے۔

اس کے علاوہ جذباتی و نفسیاتی ضرورتیں اور تنہائی کی وحشت کو دُور کرنے کی احتیاج اُسے اس کام کی دعوت دیتی ہے۔

لیکن اُس خدا کے بارے میں کہ جو ازلی و ابدی ہے، جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ جذباتی و نفسیاتی احتیاج کا مسئلہ اس کی پاک ذات کے لیے کوئی مفہوم رکھتا ہے، کیا یہ امور تصور کیے جا سکتے ہیں؟

اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ لوگ جو خدا کے لیے فرزند کے قائل ہیں، انہوں نے اُس کا اپنے اُوپر قیاس کر لیا ہے اور انہوں نے اُس میں بھی وہی باتیں سمجھ لی ہیں کہ جن باتوں کو وہ اپنے اندر سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری کوئی بھی چیز خدا کی مانند نہیں ہے (لیس کمثلہ شیء)[۱]

## پہلی ہجرت کے بارے میں ایک اہم تاریخی نکتہ:

پہلی ہجرت جو اسلام میں واقع ہوئی وہ مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے گروہ کی حبشہ کی طرف ہجرت تھی۔ یہ گروہ چند مردوں اور چند عورتوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے مشرکین قریش کے چنگل سے رہائی پانے اور اسلام کے آئندہ کے پروگراموں پر عمل درآمد اور زیادہ سے زیادہ تیاری کرنے کے لیے

---

۱۔ "کُن فیکون" کے معنی کے بارے میں اور خدا سے نفی فرزند کے دلائل سے متعلق ہم جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۶ اور ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں۔



Marfat.com

حبشہ کے قصد سے مکّہ کو چھوڑ دیا ، اور جیسا کہ ان کا اندازہ تھا ، وہاں پر انہیں یہ موقع مل گیا کہ امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور اسلامی پروگراموں اور خود سازی کے کاموں میں مشغول ہوسکیں ۔

یہ خبر مکّہ میں قریش کے سرداروں تک بھی پہنچ گئی ۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اپنے لیے خطرے کا الارم سمجھا ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ حبشہ مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن جائے گا اور شاید وہ قوت وطاقت حاصل کرنے کے بعد مکّہ کی طرف پلٹ آئیں ، اور ان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں ۔

صلاح ومشورہ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فعال مردوں میں سے دو افراد کو منتخب کرکے نجاشی کے پاس بھیجیں تاکہ وہ وہاں پر مسلمانوں کے وجود کے خطرات کے بارے میں نجاشی کو تفصیل سے آگاہ کریں ۔ اور انہیں اس اطمینان وسکون کی سرزمین سے باہر نکال دیں ۔

قریش نے **عمرو بن عاص اور عبداللہ ابن ابی ربیعہ** کو نجاشی اور اس کے لشکر کے بڑے بڑے افسروں کے لیے بہت سے ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ روانہ کیا ۔

**اُم سلمہ** زوجۂ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتی ہیں کہ ہم جب سرزمین حبشہ میں پہنچے تو ہم نے نجاشی کا حُسن سلوک دیکھا ۔ ہمیں کسی قسم کی مذہبی پابندی نہیں تھی ، کوئی ہمیں تکلیف نہیں پہنچاتا تھا ، لیکن قریش نے اس مسئلہ سے آگاہ ہونے کے بعد دو آدمیوں کو بہت سے ہدایا وتحائف کے ساتھ بھیج کر انہیں یہ حکم دیا تھا کہ خود نجاشی سے ملاقات کرنے سے پہلے اس کے بڑے بڑے منصب داروں سے ملاقات کرنا اور ان کے ہدیے اور تحائف انہیں پیش کرنا ، اس کے بعد نجاشی کے ہدایا اور تحائف کو اُس کی خدمت میں پیش کرنا اور اُس سے یہ تقاضا کرنا کہ مسلمانوں کو اُن سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سپرد کر دیں ۔

انہوں نے اس پروگرام پر پُورا پُورا عمل کیا ۔ پہلے نجاشی کے منصب داروں سے مل کر اُنہیں یہ بتایا کہ : چند بے وقوف جوانوں کے ایک گروہ نے تمہاری سرزمین میں پناہ لے لی ہے ، اُنہوں نے اپنا دین وآئین ترک کر دیا ہے اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ۔ انہوں نے ایک نئے دین کو بدعت کے طور پر جاری کیا ہے ۔ جو ہمارے اور تمہارے لیے غیر معروف ہے ۔

اشرافِ قریش نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم ان کے شر کو اس ملک سے کم کر دیں اور انہیں ان کی قوم کی طرف واپس لوٹا دیں ۔

انہوں نے منصب داروں سے یہ وعدہ لے لیا کہ جس وقت نجاشی اُن سے مشورہ کرے تو وہ اس نظریے کی تائید کریں گے اور اُس سے یہ کہیں گے کہ ان کی قوم ان کے حالات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہے ۔

اس کے بعد انہوں نے نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور وہی پُر فریب باتیں اُس سے بھی کہیں ۔

ان کا یہ پروگرام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور ان کی یہ پُر فریب باتیں اُن بکثرت ہدایا وتحائف کے ساتھ سبب بنیں کہ نجاشی کے مصاحبین نے بھی ان کی تائید وتصدیق کر دی ۔

اچانک ورق اُلٹا اور نجاشی سخت غضب ناک ہوا اور کہنے لگا خدا کی قسم مَیں ایسا کام نہیں کروں گا ۔ یہ ایک ایسا گروہ ہیں کہ جنہوں نے میری پناہ لی ہے ، اور انہوں نے میرے ملک کو اس کے امن وامان کی وجہ سے دوسرے ملکوں پر ترجیح دی ہے ۔ جب تک مَیں انہیں دعوت نہ دے لوں اور تحقیق نہ کرلوں میں تمہاری اس تجویز پر عمل نہیں کروں گا ۔

اگر واقعاً معاملہ اسی طرح ہوا کہ جیسے یہ کہتے ہیں تو پھر میں انہیں ان دو افراد کے حوالے کر دوں گا اور انہیں اپنے ملک سے نکال دوں گا



Marfat.com

ورنہ میری پناہ محبت میں خیر و خوبی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

جناب اُم سلمہ فرماتی ہیں کہ نجاشی نے کسی کو مسلمانوں کے پاس بھیجا۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ نجاشی سے کیا کہیں ؟ اُن سب کی رائے یہ ٹھہری کہ وہ صحیح صحیح حقیقت بیان کر دیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور اسلام کے پروگرام کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیں پھر جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہے۔

وہ دن کہ جو اس دعوت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، ایک عجیب و غریب دن تھا۔ عیسائی بزرگ اور مسیحی علما بھی جو اپنے ہاتھوں میں مقدس کتابیں لیے ہوئے تھے اس مجلس میں مدعو کیے گئے تھے۔

نجاشی نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا اور اُن سے پُوچھا، یہ کونسا دین ہے کہ تم اپنی قوم سے بھی الگ ہو گئے ہو اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو ؟

جناب جعفر بن ابی طالب نے سلسلہ کلام شروع کیا اور کہا : اے بادشاہ ! ہم ایک ایسا گروہ تھے جو جہالت اور بے خبری میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے اور بُرے اور سنگین کام انجام دیتے تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بدی کرتے تھے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے، خلاصہ یہ کہ ہماری بدبختی بہت زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا کہ جس کے نسب کو ہم اچھی طرح سے پہچانتے تھے، اور اس کی صداقت، امانت اور پاکیزگی پر ہم ایمان رکھتے تھے۔ اُس نے ہمیں خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور ہمیں حکم دیا کہ ہم پتھر اور لکڑی کی پرستش کو جنہیں ہمارے بڑے پُوجا کرتے تھے چھوڑ دیں۔

اُس نے ہمیں سچ بولنے، ادائے امانت، صلہ رحمی، ہمسایوں سے نیکی کرنے کی ہدایت کی اور محرمات، خونریزی، بُرے اور شرمناک اعمال، جھوٹی گواہی، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورتوں کو تہمت لگانے سے منع کیا۔

اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم خدائے یگانہ کی پرستش کریں، کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں، نماز اور روزہ بجا لائیں اور زکوٰۃ ادا کریں ۔۔۔۔۔۔

ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اس کے احکام پر ہو بہو عمل کیا ہے۔ لیکن ہماری قوم نے ہم پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی، ہمیں تکلیفیں اور رنج پہنچائے اور اصرار کیا کہ ہم توحید کا عقیدہ چھوڑ کر شرک کی طرف پلٹ جائیں اور اپنی اسی سابقہ گناہ آلود زندگی میں مشغول ہو جائیں۔

جب انہوں نے ہمیں ہر طرح سے تنگ کیا اور ستایا تو ہم آپ کے ملک کی طرف آ گئے اور ہم نے اس بات کو پسند کیا کہ ہم آپ کے ہمسائے بن جائیں، اس اُمید کے ساتھ کہ کوئی شخص یہاں ہم پر ظلم و ستم نہیں کرے گا۔

نجاشی سخت فکر میں پڑ گیا۔ جعفر کی طرف رُخ کیا اور کہا : کیا اس شخص کی آسمانی کتاب کی کوئی چیز تجھے یاد ہے ؟

جناب جعفر نے کہا : ہاں !

نجاشی نے کہا : مجھے سناؤ۔

جناب جعفر نے جو عقل و دانش اور دولتِ ایمان سے مالا مال تھے، قرآن مجید کے مناسب ترین حصہ کو جو کہ سورۂ مریم کی ہی ابتدائی آیات تھیں منتخب کیا۔ اور نجاشی اور تمام حاضرین کے لیے، کہ جو سب کے سب دین مسیح کے پیرو تھے، تلاوت کیا۔



Marfat.com

کھیعص - ذکر رحمة ربك عبده زکریا ۔۔ ۔۔ ۔۔ واذکر فی الکتاب
مریم اذ انتبذت من اهلها مکانا شرقیا ۔۔۔ ۔۔ ۔۔

جس وقت جناب جعفرؑ نے ان آیات کی بہترین لحن اور پاک دل کے ساتھ قرات کی تو اس کا نجاشی اور بزرگ مسیحی علما کی رُوح پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں اور ان کے رخساروں پر گرنے لگیں۔

نجاشی نے ان کی طرف رُخ کیا اور کہا : خدا کی قسم ! جو کچھ عیسٰی مسیحؑ لے کر آئے تھے وہ اور یہ آیات ان سب کا ایک ہی سرچشمہ اور ایک ہی منبعِ نُور ہے۔ جاؤ اور راحت اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرو، خدا کی قسم میں ہرگز آپ لوگوں کو ان دو افراد کے حوالے نہ کروں گا۔

اس کے بعد قریش کے قاصدوں نے نجاشی کو مسلمانوں کی طرف سے بدگمان کرنے کے لیے اور تدبیریں بھی کیں لیکن وہ اس کی بیدار رُوح پر اثرانداز نہ ہوسکیں تو وہ مایوس اور نااُمید ہو کر وہاں سے پلٹ آئے، ان کے ہدیے انہیں واپس کر دیئے اور اُن سے معذرت چاہی[1]۔

۳۶۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○

۳۷۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۳۸۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

۳۹۔ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۴۰۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ○

## ترجمہ

۳۶۔ اور اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

۳۷۔ لیکن (اس کے بعد) اس کے پیروکاروں میں سے کئی گروہوں نے اختلاف کیا، کافروں پر وائے ہے، ان کے اس حال پر کہ جب وہ (قیامت کے) عظیم دن کا مشاہدہ کریں گے۔

---

[1] اقتباس از سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۵۶ - ۳۶۱ ۔



Marfat.com

۳۸ ۔ اس روز ان کے کیسے سننے والے کان اور کیسی دیکھنے والی آنکھیں ہوں گی جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں گے، لیکن آج یہ ستمگر کھلی گمراہی میں ہیں۔

۳۹ ۔ (قیامت کا دن کہ جو سب کے لیے مایۂ تاسف ہے) انہیں اس یوم حسرت سے ڈرا، وہ دن کہ جس میں ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔

۴۰ ۔ ہم زمین کے بھی اور اس پر موجود تمام لوگوں کے بھی وارث ہو جائیں گے۔ اور سب کے سب ہماری طرف ہی لوٹ کر آئیں گے۔

# تفسیر

## قیامت، حسرت کا دن :

مذکورہ صفات کے ساتھ اپنا تعارف کرانے کے بعد حضرت عیسیٰ نے مسئلہ توحید پر خاص طور پر عبادت کے سلسلے میں تاکید کی اور کہا : خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت و پرستش کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (وان الله ربی و ربکم فاعبدوہ ھٰذا صراط مستقیم)[1]

اس طرح حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی کی ابتداء سے ہی ہر قسم کے شرک اور دو یا دو سے زیادہ خداؤں کی عبادت و پرستش سے مبارزہ کیا اور ہر جگہ توحید پر تاکید کی۔ اس بناء پر تثلیث کے عنوان سے عیسائیوں کے درمیان آج جو کچھ نظر آتا ہے یہ قطعی طور پر حضرت عیسیٰؑ کے بعد پیدا ہونے والی بدعت ہے۔ ہم اس کی تفصیل سورہ نساء کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[2]

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان ہوا ہو اس معنی میں کہ خدا انہیں اس آیت میں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو توحید فی العبادۃ کی دعوت دو اور اس کا صراطِ مستقیم کے عنوان سے تعارف کراؤ۔

لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ حضرت عیسیٰؑ کی گفتگو اور ان کی گزشتہ باتوں کا آخری حصہ ہے۔ سورۂ زخرف کی آیہ ۶۳ تا ۶۴ میں ہم پڑھتے ہیں :

" ولما جاء عیسٰی بالبینات قال قد جئتکم بالحکمة ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیه فاتقوا الله واطیعون ان الله ھو ربی وربکم فاعبدوہ ھٰذا صراط مستقیم"۔

" اور جس وقت عیسٰی ان کے لیے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے تو کہا کہ میں تمہارے لیے حکمت و دانش لے کر آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ جن باتوں میں تم اختلاف رکھتے ہو اُن میں سے بعض امور کی تمہارے لیے وضاحت کروں، پس تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"

---

[1] جملہ بندی اور ترکیب کے لحاظ سے یہ جملہ حضرت عیسیٰؑ کی گزشتہ باتوں پر عطف ہے جو "قال انی عبد اللہ" سے شروع ہوئی ہیں اور اس جملہ پر ختم۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۱۶۱ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔



Marfat.com

خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

یہاں ہم تقریباً عین وہی جملہ دیکھ رہے ہیں کہ جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ (اسی قسم کا مضمون سورہ آلِ عمران کی آیہ ۵۰ و ۵۱ میں بھی آیا ہے)۔

❖ ❖ ❖

لیکن اس تمام تاکید کے باوجود کہ جو حضرت عیسیٰؑ توحید اور خدائے یگانہ کی پرستش کے بارے میں کیا کرتے تھے "اُن کے بعد اُن کے پیروکاروں میں سے کئی گروہوں نے مختلف راستے اختیار کر لیے" (اور خاص طور پر عیسیٰؑ کے بارے میں بھی اُنہوں نے کئی قسم کے عقائد تراش لیے، (فاختلف الاحزاب من بینھم)۔ قیامت کے عظیم دن کے مشاہدے سے ان کی حالت پر کہ جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی وائے ہے۔ (فویل للذین کفروا من مشهد یوم عظیم)۔

مسیحیت کی تاریخ بھی اس بات کی اچھی طرح گواہی دیتی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے بارے میں اور مسئلہ توحید کے بارے میں کس حد تک اختلاف کیا۔ یہ اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ "قسطنطین" شہنشاہ روم نے "اسقفوں" (مسیحیت کے بڑے بڑے علماء) کا ایک اجتماع بلایا کہ جو ان کے تین مشہور تاریخی اجتماعات میں سے ایک تھا کہ جس کے ارکان کی تعداد دو ہزار ایک سو ستر تک جا پہنچی یہ سب کے سب اُن کے بزرگوں میں سے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بحث شروع ہوئی تو موجود علماء نے اس کے بارے میں بالکل مختلف نظریات کا اظہار کیا اور ہر گروہ کا اپنا ایک الگ ہی عقیدہ تھا۔

اُن میں سے بعض نے کہا کہ وہ خدا ہے کہ جو زمین پر نازل ہوا ہے۔ ایک گروہ کو اُس نے زندہ کیا اور بہت سے لوگوں کو موت دے دی۔ اس کے بعد آسمان کی طرف صعود کر گیا ہے۔

بعض دوسروں نے کہا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔

بعض نے کہا کہ وہ تین اقانیم (تین مقدس ذوات میں سے) ایک تھا، باپ، بیٹا اور رُوح القدس (باپ خدا۔ بیٹا خدا اور رُوح القدس)۔

بعض نے یہ کہا کہ وہ ان تین میں کا تیسرا ہے۔ خدا معبود ہے، وہ بھی معبود ہے اور اس کی ماں بھی معبود ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بندۂ خدا ہے اور اس کا بھیجا ہوا رسول ہے۔

دوسرے فرقوں نے بھی الگ الگ باتیں کیں۔ اس طرح سے کہ ان عقائد میں سے کسی پر بھی اتفاقِ نظر حاصل نہ ہوا۔ سب سے بڑی تعداد ایک عقیدے کے طرفداروں کی ۳۰۸ تھی کہ جس کو بادشاہ نے نسبتاً اکثریت کے عقیدہ کے عنوان سے قبول کر لیا اور اس کا قانونی و رسمی عقیدے کے عنوان سے دفاع کرنا شروع کر دیا اور باقی عقیدوں کو چھوڑ دیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ جس کے طرفداروں کی تعداد بہت ہی کم تھی اقلیت میں قرار پایا۔[1]

چونکہ اصلِ توحید سے انحراف، عیسائیوں کا سب سے بڑا انحراف شمار ہوتا ہے، مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ہم نے دیکھا کہ خداوند تعالیٰ اُنہیں کس طرح سے تہدید کر رہا ہے، کہ وہ قیامت کے عظیم دن میں، سب لوگوں کی موجودگی میں اور پروردگار کی عدالت عادلہ کے سامنے بہت بُرے اور دردناک انجام سے دوچار ہوں گے۔[2]

---

[1] تفسیر فی ظلال، جلد ۵ ص۴۳۶۔

[2] "مشهد" اوپر والی آیت میں ممکن ہے کہ مصدر میمی "شہود" کے معنی میں ہو یا اسم مکان یا اسم زمان، محل یا زمانہ شہود کے معنی میں ہو ہر چند ان کے معانی مختلف ہیں لیکن نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔



Marfat.com

بعد والی آیت میدانِ قیامت میں ان کی حالت کو بیان کر رہی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ "اُس دن جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ان کے کیسے سننے والے کان اور کیسی دیکھنے والی آنکھیں ہو جائیں گی۔ لیکن یہ ظالم آج جبکہ دنیا میں ہیں تو کھلی گمراہی میں ہیں (اسمع بھو والبصر یوم یأتوننا لکن الظالمون الیوم فی ضلالٍ مبین)۔

یہ بات واضح ہے کہ نشاۃ آخرت میں آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے، اور کانوں کی سُننے کی صلاحیت بہت زیادہ ہو جائے گی کیونکہ وہاں حق کے آثار دنیا کی نسبت کئی گنا زیادہ واضح و آشکار ہوں گے۔ اصولی طور پر اس عدالت اور اعمال کے آثار کا مشاہدہ انسان کی آنکھوں اور کانوں سے غفلت کے پردے دُور کر دے گا۔ یہاں تک کہ دل کے اندھے بھی آگاہ اور دانا ہو جائیں گے۔ لیکن کیا فائدہ کیونکہ یہ بیداری اور آگاہی ان کی حالت کے لیے مفید نہ ہوگی۔

بعض مفسرین نے "لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین" کے جملہ میں لفظ "الیوم" قیامت کے دن کے معنی میں لیا ہے کہ جس سے آیت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے: وہ وہاں بینا و شنوا ہو جائیں گے لیکن یہ بینائی اور شنوائی اس دن ان کی حالت کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی اور وہ واضح گمراہی میں ہوں گے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے[1]۔

٭ ٭ ٭

ایک مرتبہ پھر اس روز بے ایمان اور ستمگر لوگوں کے انجام کو مدِنظر رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان دل کے اندھوں کو، جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے روزِ حسرت (قیامت کے دن) سے کہ جس میں تمام چیزیں اختتام کو پہنچ جائیں گی اور تلافی اور بازگشت کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوگا، ڈرا (وانذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر وھم فی غفلۃ وھم لا یؤمنون)۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں قیامت کے دن کے کئی نام ہیں۔ ان میں سے ایک "یوم الحسرۃ" ہے کیونکہ اس دن نیکوکار بھی افسوس کریں گے کہ اے کاش ہم زیادہ سے زیادہ نیک اعمال بجا لائے ہوتے اور بدکار بھی افسوس کریں گے۔ کیونکہ نظروں کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جائیں گے اور۔ ہر شخص پر اعمال کے حقائق اور ان کے نتائج آشکار ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اذ قضی الامر" کے جملے کو قیامت کے دن حساب و کتاب، جزا و سزا اور تکلیف و ذمہ داری کے پروگراموں کے اختتام پذیر ہونے سے مربوط سمجھا ہے اور بعض اسے دنیا کے فنا ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوگا: انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ وہ وقت جب کہ دنیا ان کی غفلت اور ایمان نہ لانے کی حالت میں اختتام کو پہنچ جائے گی (لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، خاص طور پر جبکہ ایک روایت میں "اذ قضی الامر" کی تفسیر امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوئی ہے:

ای قضی علی اھل الجنۃ بالخلود فیھا، وقضی علی اھل النار بالخلود فیھا

یعنی خداوند عالم اہلِ جنت کے لیے (جنت میں) اور اہلِ جہنم کے لیے (جہنم میں) ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا حکم صادر فرمائے گا۔[2]

---

[1] "الف و لام" "الیوم" میں "عہد" کا الف لام ہے لیکن پہلی تفسیر کے مطابق عہد حضوری "اور دوسری تفسیر کے مطابق" عہد ذکری" ہے۔

[2] مجمع البیان آیہ بالا کے ذیل میں۔



Marfat.com

آخری زیرِ بحث آیت تمام ظالموں اور ستمگروں کو خبردار کر رہی ہے کہ یہ اموال جو ان کے قبضے میں ہیں، ہمیشہ ان کے پاس نہیں رہیں گے جیسا کہ خود ان کی زندگی جاودانی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے بلکہ ان سب کا اصلی مالک خدا ہے لہٰذا فرماتا ہے: ہم زمین کے بھی اور تمام ان لوگوں کے بھی جو اس پر رہتے ہیں وارث ہو جائیں گے۔ اور آخر کار وہ سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔ (انا نحن نرث الارض ومن علیھا والینا یرجعون) [1]

حقیقت میں یہ آیت سورۂ مومن کی آیہ ۱۶ کی ہم وزن ہے کہ جو کہتی ہے:

لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار

آج (قیامت کے دن) کس کی ملکیت و حکومت ہے، ایک اکیلے غالب و مسلط خدا کی۔

اگر کوئی شخص اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا معتقد ہو، تو پھر وہ کس لیے اُن اموال اور تمام مادی چیزوں کے لیے کہ جو چند روز کے لیے ہمیں امانت کے طور پر سپرد کی گئی ہیں، اور بہت جلدی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی، ظلم و ستم کرے گا اور حقیقت یا دوسرے لوگوں کے حقوق کو پامال کرنے کو جائز سمجھے گا۔

❁ ❁ ❁

۴۱۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○

۴۲۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ○

۴۳۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ

---

[1] آیا یہ آیت قیامت کی طرف اشارہ ہے یا دنیا کے فنا ہونے کے وقت کی طرف؟ اگر یہ قیامت کی طرف اشارہ ہو تو یہ "والینا یرجعون" (ہماری طرف پلٹائے جائیں گے) کے جملے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اگر دنیا کے ختم ہونے کے وقت کی طرف اشارہ ہو تو "ومن علیھا" (وہ کہ جو زمین کے اُوپر ہیں) کے جملہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ دنیا کے ختم ہونے کے وقت تو زمین پر کوئی زندہ نہیں ہوگا کہ جس کے بارے میں "من علیھا" کی تعبیر درست ہو۔ شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے اس جملہ کا یہ معنیٰ کیا ہے۔
"انا نحن نرث عنھم الارض" ہم ان کی طرف سے زمین کے وارث ہوں گے، لیکن یہ تفسیر بھی کچھ خلافِ ظاہر ہے کیونکہ "من علیھا" کا واؤ کے ساتھ عطف ہوا ہے۔ ایک اور احتمال جو اس مقام پر موجود ہے وہ یہ ہے کہ "نرث" کا مفعول کبھی تو وہ شخص ہوتا ہے جو مال چھوڑ جاتا ہے، مثلاً: "وورث سلیمان داؤد" اور کبھی وہ اموال ہوتے ہیں کہ جو میراث کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً: "نرث الارض" اور اُوپر والی آیت میں دونوں تعبیریں آئی ہیں۔



Marfat.com

صِرَاطًا سَوِيًّا ۝

۴۴۔ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝

۴۵۔ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

## ترجمہ

۴۱۔ اس کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، وہ خدا کا بہت ہی سچا نبی تھا۔

۴۲۔ جب اس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! تو ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتا ہے کہ جو نہ سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور تیری کوئی مشکل بھی حل نہیں کرتی۔

۴۳۔ اے بابا! مجھے ایسا علم و دانش عطا ہوا ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوا لہٰذا تو میری پیروی کر تاکہ میں تجھے سیدھے راستے کی ہدایت کروں۔

۴۴۔ اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔

۴۵۔ اے بابا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ پر کوئی عذاب نازل ہو جائے۔ جس کے نتیجے میں تو شیطان کا دوست ٹھہرے۔

## ابراہیم (ع) کی مؤثر منطق:

حضرت عیسیٰؑ کی سرگزشت کے کچھ حصے کا تعلق ان کی والدہ جناب مریمؑ کی زندگی کے ساتھ تھا۔ گزشتہ آیات میں اس کا ذکر تھا۔ اس کے بعد زیر بحث آیات اور آگے آنے والی آیات میں توحید کے ہیرو ابراہیم خلیلؑ کی زندگی کے کچھ حصے کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں تاکید کی گئی ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی دعوت بھی — تمام رہبرانِ الٰہی کی دعوت کی طرح — نقطۂ توحید ہی سے شروع ہوئی ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم کو یاد کرو (واذکر فی الکتاب ابراهیم)۔

کیونکہ وہ بہت ہی سچا مرد تھا، خدا کی تعلیمات و فرامین کی تصدیق کرنے والا تھا اور خدا کا پیغمبر تھا (انه کان صدیقا نبیًّا)۔

لفظ "صدیق" صدق سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں، جو بہت ہی سچا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو، یا اس سے بالاتر، جو جھوٹ بول ہی نہ سکتا ہو کیونکہ —— اس نے ساری عمر سچ بولنے کی عادت بنالی ہے۔ نیز بعض اسے ایسے شخص کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس کا عمل اس کے قول اور اعتقاد کی تصدیق



Marfat.com

کرتا ہو۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام معانی تقریباً ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہرحال یہ صفت اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اُوپر والی آیت میں صفت نبوّت سے بھی پہلے بیان ہوئی ہے۔ گویا یہ نبوّت کو قبول کرنے کی لیاقت پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبروں اور وحی الٰہی کے حاملین میں جو عمدہ ترین اور بہترین صفت ہونی چاہیئے وہ یہی ہے کہ وہ خداوند تعالےٰ کے فرمان کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچا دیں۔

اس کے بعد ان کی اپنے باپ آزر کے ساتھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔ (یہاں باپ سے مراد چچا ہے اور لفظ "ابا" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عربی لغت میں کبھی باپ کے معنی میں اور کبھی چچا کے معنی میں آتا ہے)[1]

قرآن کہتا ہے: اُس وقت جبکہ اُس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! تو ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو تو سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے (اذ قال لابیہ یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئًا)۔

یہ مختصر اور زوردار بیان شرک اور بُت پرستی کی نفی کرنے والی دلیلوں میں سے ایک بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کو پروردگار عالم کی معرفت کے بارے میں اُبھارنے والی چیزوں میں سے ایک نفع و نقصان کا احتمال ہے اسے علمائے عقائد "دفع ضرر محتمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ تو ایسے معبود کی طرف کیوں جاتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ تیری کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ تو اصلاً سننے اور دیکھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

دوسرے لفظوں میں عبادت ایسی ہستی کی کرنی چاہیئے کہ جو مشکلات حل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، اپنے عبادت کرنے والے اور اس کی حاجات و ضروریات کو جانتی ہو۔ دیکھ سُن سکتی ہو لیکن ان بتوں میں یہ تمام باتیں مفقود ہیں۔

درحقیقت ابراہیمؑ یہاں اپنی دعوت اپنے چچا سے شروع کرتے ہیں، کیونکہ قریبی رشتہ داروں میں اثر و نفوذ پیدا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ پہلے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں جیسا کہ سُورۂ شعراء کی آیہ ۲۱۴ میں ہم پڑھتے ہیں:

وانذر عشیرتك الاقربین۔

یعنی اپنے قریبیوں کو خوفِ خدا دلاؤ۔

⁂

اس کے بعد ابراہیمؑ واضح منطق کے ساتھ اُسے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس امر میں ان کی پیروی کرے۔ فرماتے ہیں: اے بابا! مجھے وہ علم و دانش ملی ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوئی۔ اس بنا پر تو میری پیروی کر اور میری بات سُن (یا ابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یأتك فاتبعنی)۔

میری پیروی کر تاکہ میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں (اھدك صراطًا سویًّا)۔

میں نے وحی الٰہی کے ذریعہ سے بہت علم و آگہی حاصل کی ہے اور میں پُورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں خطا کے راستے

---

[1] اس بارے میں تفصیلی بحث پانچویں جلد صفحہ ۲۴۸ تفسیر نمونہ (اُردو ترجمہ) سورہ انعام کی آیہ ۷۴ میں ہو چکی ہے۔



Marfat.com

پر نہیں چلوں گا۔ تجھے بھی ہرگز غلط راستے کی دعوت نہیں دوں گا۔ میں تیری خوش بختی و سعادت کا خواہاں ہوں تو میری بات مان لے تاکہ فلاح و نجات حاصل کر سکے اور اس صراطِ مستقیم کو طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس اثباتی پہلو کو منفی پہلو اور ان آثار کے ساتھ ملاتے ہوئے، کہ جو اس دعوت پر مترتب ہوتے ہیں کہتے ہیں: اے بابا! شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان ہمیشہ خدائے رحمٰن کا نافرمان رہا ہے۔ ( یاابت لاتعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمٰن عصیًّا)۔

البتہ ظاہر ہے کہ یہاں عبادت سے مراد شیطان کے لیے سجدہ کرنے اور نماز روزہ بجالانے والی عبادت نہیں ہے بلکہ اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کرنے کے معنی میں ہے اور یہ بات خود ایک قسم کی عبادت شمار ہوتی ہے۔

عبادت و پرستش کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ کسی کی باتوں کو عمل کرنے کی نیت سے سننا تک بھی اس کے معنی میں شامل ہے اور کسی کے قانون کو قابلِ نفاذ سمجھنا بھی اس کی ایک طرح کی عبادت و پرستش شمار ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے:

من اصغی الی ناطق فقد عبدہ، فان کان الناطق عن اللہ عزّوجل فقد عبد اللہ وان کان الناطق عن ابلیس فقد عبد ابلیس:

جو شخص کسی بات کرنے والے کی بات کی طرف کان لگائے (تسلیم و رضا کے ساتھ) تو اس نے اس کی پرستش کی ہے۔ اگر یہ بولنے والا خدا کی طرف سے بول رہا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر بولنے والا ابلیس کی طرف سے بول رہا ہے تو (پھر اس سننے والے نے) ابلیس کی عبادت کی ہے۔[۱]

بہرحال ابراہیمؑ اپنے چچا کو اس حقیقت کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں بغیر کسی قانون یا راستے کے نہیں چل سکتا۔ (اب قانون یا راستے صرف دو ہی ہیں) یا قانونِ الٰہی اور صراطِ مستقیم ہے اور یا نافرمان و گمراہ شیطان کا قانون اور راستہ ہے۔ چاہیئے کہ انسان اس سلسلے میں ٹھیک طرح سے سوچ بچار کرے اور اپنے لیے ہمیشگی کو اختیار کرے، اور اپنی خیر و صلاح کو تعصبات اور اندھی تقلید سے دور رہتے ہوئے نظر میں لائے۔

٭ ٭ ٭

ایک مرتبہ پھر اسے شرک اور بت پرستی کے برے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے بابا! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تیری اختیار کردہ شرک و بت پرستی کے سبب خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ پر عذاب آئے اور تو اولیائے شیطان میں سے ہو جائے۔

(یاابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمٰن فتکون للشیطان ولیًّا)۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی اپنے چچا آذر کے سامنے یہ تعبیر بہت ہی جاذبِ نظر اور عمدہ ہے کہ ایک طرف اسے مسلسل "یاابت" (اے بابا)

[۱] سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ ۱۱۵ (مادہ عبد)۔



Marfat.com

کے خطاب سے کہ جو ادب و احترام کی نشانی ہے مخاطب کیے جا رہے ہیں اور دوسری طرف "انی اخاف ان یمسك" کا جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ ابراہیمؑ آزر کو معمولی سی تکلیف پہنچنے سے بے چین و پریشان ہیں، تیسری طرف سے "عذاب من الرحمٰن" کی تعبیر اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تیرا معاملہ اس شرک و بُت پرستی کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ سب چیزوں پر چھائی ہوئی ہے تجھ پر ناراض ہے اور وہ تجھے عذاب دے گا، اب تو ہی دیکھ کہ تو کس قسم کا وحشت ناک کام انجام دے رہا ہے۔

چوتھی طرف سے اسے متوجہ کیا کہ تیرا یہ ایک ایسا کام ہے کہ جس کا انجام شیطان کی دوستی کے زیر سایہ قرار پانا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

## چند نکات :

**۱۔ دُوسروں پر اثر انداز ہونے کا طریقہ :** روایات کے مطابق آزر ایک بُت پرست، بُت تراش اور بُت فروش آدمی تھا اور اس ماحول میں فساد کا ایک عظیم عامل شمار ہوتا تھا ــــ حضرت ابراہیمؑ کی اس سے گفتگو کی کیفیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ منحرف افراد پر اثر انداز ہونے کے لیے خشونت اور سختی اختیار کرنے سے پہلے منطق و دلیل کے طریقے سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ منطق بھی ایسی جو احترام، محبت، شفقت اور ہمدردی کے انداز میں ہو اور ساتھ ساتھ اس میں قاطعیت بھی ہو ــــ کیونکہ اس طریقہ سے بہت سے گروہ حق کے آگے سرِتسلیم خم کر دیں گے، اگرچہ کچھ لوگ اس روش کے اختیار کرنے کے باوجود بھی اپنے مؤقف پر اڑے رہیں گے۔ یقیناً ان کا معاملہ الگ ہو گا اور اُن کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرنا چاہیئے۔

**۲۔ عالم کی پیروی کرنے کی اپیل :** ہم نے اُوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آزر کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا چچا سن و سال کے اعتبار سے قاعدتاً ان سے بہت بڑا تھا اور اُس معاشرے کا نہایت معروف آدمی تھا۔ چچا کی طرف سے اپنی پیروی کے لیے وہ یہ دلیل دیتے ہیں: میں ایسے علوم کا حامل ہوں کہ جو تیرے پاس نہیں ہیں (قد جائنی من العلم مالم یأتك)۔

یہ تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی قانون ہے کہ جن امور سے وہ آگاہ اور باخبر نہیں ہیں اُن میں وہ ان کی پیروی کریں جو آگاہ و باخبر ہیں۔ یہ بات حقیقتاً ہر فن میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کی طرف رجوع کرنے کو واضح کر رہی ہے اور ان میں سے ایک فروعِ احکام اسلامی میں مجتہد کی تقلید کا مسئلہ بھی ہے البتہ حضرت ابراہیمؑ کی بحث فروعِ دین کے مسائل سے مربوط نہیں تھی بلکہ وہ اصولِ دین کے سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن اس قسم کے مسائل تک میں بھی علماء اور دانشمندوں کی رہنمائی سے ہی استفادہ کرنا چاہیئے، تاکہ صراط سوی (درست راستے) کی طرف ہدایت حاصل ہو ۔ وہ صراط سوی کہ جو صراطِ مستقیم ہی ہے۔

**۳۔ رحمت اور یاد آوری کی سُورت :** اس سورہ میں حضرت مریمؑ اور بزرگ پیغمبروں کا قصہ شروع کرتے وقت پانچ مرتبہ "اذکر" (یاد کرو) آیا ہے اور اس بنا پر اس سُورہ کو یاد آوری کا سورہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ پیغمبروں اور عظیم مردوں اور عورتوں کی یاد آوری ہے اور توحید کے بارے میں ان کی جدوجہد اور شرک و بُت پرستی اور ظلم و بیدادگری کے خلاف ان کی سعی و کوشش کی یاد آوری ہے۔

چونکہ عام طور پر ذکر، بھول جانے کے بعد یاد دلانے کے معنی میں ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس واقعیت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ توحید کی بنیادوں اور مردانِ حق کا عشق اور راہِ حق میں ان کی جدوجہد پر ایمان لانا، ہر انسان کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور ان کی باتیں



Marfat.com

کرنا واقعاً ایک طرح کا ذکر اور یاد آوری ہے۔

خداوند تعالیٰ کی "رحمٰن" کے عنوان سے توصیف اس سورہ میں سولہ مرتبہ آئی ہے، کیونکہ یہ سورہ اپنے آغاز سے ہی رحمت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ خدا کی زکریا پر رحمت، خدا کی مریم اور مسیح پر رحمت، اور اس سورہ کا اختتام بھی اسی رحمت کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے خدائے رحمٰن ان کی محبت کو اپنے بندوں کے دل میں قرار دے دیتا ہے۔

۴۶۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ○

۴۷۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ○

۴۸۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ○

۴۹۔ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ○

۵۰۔ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ○

## ترجمہ

۴۶۔ اس نے کہا اے ابراہیم! کیا تو میرے خداؤں سے رُوگرداں ہے، اگر تو (اس کام سے) دستبردار نہ ہوا، تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، تُو مجھ سے ایک طویل مدت کے لیے دُور ہو جا۔

۴۷۔ (ابراہیم نے) کہا: تجھ پر سلام ہو، میں عنقریب اپنے پروردگار سے تیرے لیے عفو (بخشش) کی درخواست کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔



Marfat.com

۴۸۔ اور میں تم سے بھی اور جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو ان سے بھی کنارہ کشی کرتا ہوں اور میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری دعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

۴۹۔ جس وقت (ابراہیم نے) خود اُن سے اور جن جن چیزوں کی وہ خدا کے علاوہ پرستش کرتے تھے اُن سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تو ہم نے اُسے اسحٰق (سا بیٹا) اور یعقوب (سا پوتا) عطا فرمایا اور ہم نے (ان میں سے) ہر ایک کو بزرگ پیغمبر قرار دیا۔

۵۰۔ اور ان پر اپنی رحمت کی ارزانی کی اور انہیں ہم نے نیک نام (تمام امتوں کے درمیان) اور مقبول و پسندیدہ مقام عطا کیا۔

# تفسیر

## شرک اور مشرکین سے دُوری کا نتیجہ :

گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی ان کے چچا کی ہدایت کے سلسلے میں منطقی باتیں جو خاص لطف و محبت کی آمیزش رکھتی تھیں گزر چکی ہیں۔ اب آزر کے جوابات بیان کرنے کی نوبت ہے تاکہ ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے حقیقت اور واقعیت ظاہر ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ صرف ابراہیمؑ کی دل سوزیاں اور ان کا مدلّل بیان آزر کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکا بلکہ وہ ان باتوں کو سُن کر سخت برہم ہوا، اور اُس نے کہا :

"اے ابراہیم کیا تُو میرے خداؤں سے رُوگردان ہے۔ (قال اراغب انت عن الھتی یا ابراھیم)۔

اگر تُو اِس کام سے باز نہیں آئے گا تو میں ضرور ضرور تجھے سنگسار کروں گا۔ (لئن لم تنته لارجمنك)۔

" اور تو اب مجھ سے دُور ہو جا میں پھر تجھے نہ دیکھوں (واھجرنی ملیًا)۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اولاً آزر یہ تک کہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ بُتوں کے انکار یا مخالفت اور ان کے بارے میں بدگوئی کا ذکر زبان پر لائے، بلکہ بس اتنا کہا : کیا تُو بتوں سے روگردان ہے؟ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بتوں کے حق میں جسارت ہو جائے۔ ثانیاً ابراہیمؑ کو تہدید کرتے وقت اسے سنگسار کرنے کی تہدید کی۔ وہ بھی اُس تاکید کے ساتھ کہ جو "لام" اور "نون" تاکید ثقیلہ سے جو " لارجمنک " میں وارد ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ سنگسار کرنا قتل کرنے کی ایک بدترین قسم ہے۔ ثالثاً اس مشروط تہدید اور دھمکی پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس حالت میں جناب ابراہیمؑ کو ایک ناقابلِ برداشت وجود شمار کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ تُو ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے دُور ہو جا (ملیًا)۔ مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق " إملا " کے مادہ سے طولانی مہلت دینے کے معنی میں ہے اور یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ طولانی مدت کے لیے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تُو مجھ سے دُور ہو جا۔

یہ تعبیر بہت ہی توہین آمیز ہے، کہ جسے سخت مزاج افراد اپنے مخالفین کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور فارسی زبان میں اس کی جگہ "گورت راگم کن" کہتے ہیں، یعنی نہ صرف اپنے آپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھپا لے بلکہ کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ میں تمہاری قبر تک کو بھی نہ دیکھوں۔

بعض مفسرین نے " لارجمنك " کو سنگسار کرنے کے معنی میں نہیں لیا بلکہ انہوں نے اس کی تفسیر بدگوئی کرنے یا متہم کرنے کے معنی میں کی ہے لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔ قرآن کریم کی تمام آیات کا مطالعہ، کہ جو اسی تعبیر کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ جو ہم نے کہی ہے۔

❊ ❊ ❊



Marfat.com

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت ابراہیمؑ نے تمام پیغمبروں اور آسمانی رہبروں کی مانند اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھا، اور تندی اور تیزی اور شدید خشونت وسختی کے مقابلے میں انتہائی بزرگواری کے ساتھ کہا: تجھ پر سلام" (قال سلام علیك)۔

ممکن ہے کہ یہ سلام الوداعی اور خداحافظی کا سلام ہو، کیونکہ اس کے اور بعد کے چند جملوں کے کہنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے آزر کو چھوڑ دیا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسا سلام ہو کہ جو دعویٰ اور بحث کو ترک کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ قصص کی آیہ ۵۵ میں ہے:

لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین

اب جبکہ تم ہماری بات قبول نہیں کرتے ہو، تو ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہے ہم جاہلوں کے ہوا خواہ نہیں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہا: میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا، کیونکہ وہ میرے لیے رحیم ولطیف اور مہربان ہے۔ (ساستغفر لك ربی انه کان بی حفیًا)۔

حقیقت میں حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی خشونت وسختی اور تہدید ودھمکی کے مقابلے میں اسی جیسا جواب دینے کی بجائے اس کے برخلاف جواب دیا اور اُس کے لیے پروردگار سے استغفار کرنے اور اس کے لیے بخشش کی دُعا کرنے کا وعدہ کیا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آزر ہرگز ایمان نہیں لایا اور مشرکین کے لیے استغفار سورہ توبہ کی صریح آیہ ۱۱۳ کے مطابق ممنوع ہے۔

اس سوال کا جواب ہم سورۂ توبہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۸ صفحہ ۱۲۸، اُردو ترجمہ)

٭ ٭ ٭

اس کے بعد یہ فرمایا کہ: میں تم سے (تجھ سے اور اس بُت پرست قوم سے) کنارہ کشی کرتا ہوں اور اسی طرح اُن سے بھی کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو، یعنی بتوں سے بھی (کنارہ کشی کرتا ہوں) (واعتزلکم وما تدعون من دون الله)۔

اور میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میری دُعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہیں رہے گی (وادعوا ربی عسٰی ان لا اکون بدعاء ربی شقیًا)

یہ آیت ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کے آزر کے مقابلے میں اُدب کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہ اُس نے کہا کہ مجھ سے دُور ہوجا تو ابراہیمؑ نے بھی اُسے قبول کرلیا اور دوسری طرف ان کی اپنے عقیدہ میں قاطعیت اور یقین کو واضح کرتی ہے۔ یعنی وہ واضح کر رہے ہیں کہ میری تم سے یہ دُوری اس بنا پر نہیں ہے کہ میں نے اپنے توحید پر اعتقادِ راسخ سے دستبرداری اختیار کرلی ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ میں تمہارے نظریے کو حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، لہٰذا میں اپنے عقیدے پر اسی طرح قائم ہوں۔

ضمنی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے خدا سے دُعا کروں تو وہ میری دعا کو قبول کرتا ہے لیکن تم بیچارے تو اپنے سے زیادہ بیچاروں کو پکارتے ہو۔ اور تمہاری دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ تو تمہاری باتوں کو سُنتے تک نہیں۔

ابراہیمؑ نے اپنے قول کی وفا کی اور اپنے عقیدہ پر جتنا زیادہ سے زیادہ استقامت کے ساتھ رہا جاسکتا ہے، باقی رہے۔ ہمیشہ توحید کی منادی کرتے رہے۔ اگرچہ اس وقت کے تمام فاسد اور بُرے معاشرے نے ان کے خلاف قیام کیا لیکن وہ جناب بالآخر اکیلے نہ رہے اور



Marfat.com

تمام قرون و اعصار میں بہت سے پیروکار پیدا کر لیے اس طور پر کہ دنیا جہان کے تمام خدا پرست لوگ ان کے وجود پر فخر کرتے ہیں۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: جس وقت ابراہیم نے ان بت پرستوں سے اور اُن تمام چیزوں سے کہ جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کیا کرتے تھے کنارہ کشی اختیار کر لی تو ہم نے اُسے اسحاق سا بیٹا اور یعقوب سا پوتا عطا فرمایا اور اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے عظیم پیغمبر قرار دیا۔ (فلما اعتزلھم وما یعبدون من دون اللہ وھبنا لہ اسحٰق ویعقوب وکلاً جعلنا نبیاً)۔

اگرچہ بہت زیادہ مدت گزر جانے کے بعد خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور اس کے بعد یعقوب (اسحٰق کا بیٹا) عطا فرمایا۔ لیکن بہر حال یہ بزرگ انعام یعنی اسحٰقؑ جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا، کہ اُن میں سے ہر ایک عالی مقام پیغمبر تھا، اسی استقامت کا نتیجہ تھا کہ جو ابراہیمؑ نے بتوں سے مبارزہ اور اس دین باطل سے کنارہ کشی کرنے میں اپنی طرف سے دکھائی۔

علاوہ ازیں ہم نے اُنہیں اپنی رحمت کا ایک حصہ بخشا۔ (ووھبنا لھم من رحمتنا)۔

وہ خاص رحمت کہ جو خالصین ومخلصین، مردان مجاہد اور راہِ خدا میں مبارزہ کرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔

اور بالآخر" ہم نے اس باپ اور اُس کے بیٹوں کے لیے تمام اُمتوں کے درمیان نیک نام، اچھی زبان اور اعلیٰ مقام قرار دیا" (وجعلنا لھم لسان صدق علیاً)۔

درحقیقت یہ حضرت ابراہیمؑ کی اُس درخواست کا جواب ہے کہ جو سورہ شعراء کی آیہ ۸۴ میں بیان ہوئی ہے:

واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین

خدایا! میرے لیے آئندہ آنے والی اُمتوں میں لسان صدق (سچی زبان) قرار دے۔

واقع میں وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کو اس طرح سے انسانی معاشرے میں سے نکال دیا جائے کہ ان کی کوئی خبر اور ان کا معمولی سا بھی اثر باقی نہ رہے اور وہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیے جائیں۔ لیکن اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے ان کے ایثار، فداکاری اور اُس رسالت کی ادائیگی میں اُن کی استقامت کی وجہ سے کہ جو اُن کے ذمہ تھی، ان کی شہرت کو ایسا بام عروج تک پہنچایا کہ ہمیشہ دنیا جہان کے لوگوں کی زبان پر ان کا تذکرہ تھا اور اب تک ہے۔ وہ خداشناسی وجہاد، پاکیزگی و تقویٰ، اور مبارزہ و جہاد کے اسوہ اور نمونہ کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

" لسان " (زبان) ایسے مواقع پر ایک ایسی "یاد" کے معنی میں ہے کہ جو انسان کی لوگوں کے درمیان رہ جائے اور جب ہم اسکی "صدق" کی طرف اضافت کریں اور (لسان الصدق) کہیں تو اس کا معنیٰ اچھی یاد، نیک نامی اور لوگوں کے دلوں میں اچھا مقام ہے، اور جس وقت "علیا" کے لفظ کے ساتھ کہ جو عالی اور عمدہ کے معنی میں ہے ضمیمہ ہو جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی کی بہت ہی اچھی یاد لوگوں کے درمیان رہ جائے۔

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس درخواست سے یہ نہیں چاہتے کہ اپنے دل کی خواہش کو پورا کریں، بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ دشمن ان کی تاریخ زندگی کو کہ جو نہایت انسان ساز تھی فراموشی کی بھٹی میں نہ ڈال سکیں اور وہ زندگی جو عالم کے لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتی ہے اسے کہیں ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں سے محو نہ کر دیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ:۔



Marfat.com

لسان الصدق للمرء یجعله الله فی الناس خیر من المال یأکله ویورثه :

اچھی یاد اور نیک نامی کہ جو خدا کسی شخص کے لیے لوگوں کے درمیان قرار دے، اس فراواں دولت و ثروت سے بہتر و برتر ہے کہ جس سے انسان خود بھی فائدہ اُٹھائے اور اُسے میراث کے طور پر بھی چھوڑ جائے۔[1]

اصولی طور پر، رُوحانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی بعض اوقات اچھی شہرت لوگوں کے درمیان خُود انسان کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے عظیم سرمایہ ہو سکتی ہے کہ جس کے ہم نے بکثرت نمونے دیکھے ہیں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اس آیت میں حضرت اسمٰعیلؑ کے وجود کی نعمت، کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فرزند بزرگوار تھے، کیوں بالکل ہی بیان نہیں ہوئی جب کہ حضرت یعقوبؑ کا نام جو کہ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

لیکن قرآن میں ایک دوسرے مقام پر، حضرت ابراہیمؑ کے انعامات کے ضمن میں حضرت اسمٰعیلؑ کے وجود کا بیان ہوا ہے جہاں وہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے کہتا ہے :

الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق۔

شکر ہے اُس خدا کا کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق بخشے۔ (ابراہیم - ۳۹)

اس سوال کا جواب اس طرح ہے کہ علاوہ اس کے کہ بعد کی دو تین آیات میں حضرت اسمٰعیلؑ کا نام ان کی بعض اعلیٰ صفات کے ساتھ مستقل طور پر آیا ہے، اُوپر والی آیت سے مقصود یہ ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ میں نبوّت کے جاری رہنے اور تسلسل کو بیان کرے اور نشاندہی کرے کہ کس طرح یہ حسن شہرت، نیک نامی اور ان کی عظیم تاریخ، ان انبیاء کے ذریعے کہ جو ان کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے آئے، تحقق پذیر ہوئی اور ہم جانتے ہیں کہ طویل ادوار میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے بہت سے پیغمبر آئے ہیں، اگرچہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے بھی تمام پیغمبروں میں سے سب سے بزرگ ترین پیغمبر یعنی پیغمبرِ اسلامؐ نے عرصہ ہستی میں قدم رکھا لیکن تسلسل اور یکے بعد دیگرے آتے رہنا اولادِ اسحٰقؑ میں ہی تھا۔

اسی لیے سورۂ عنکبوت کی آیہ ۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے :

ووهبنا له اسحٰق و یعقوب وجعلنا فی ذریته النبوة و الکتاب

ہم نے اُسے اسحٰق و یعقوب بخشے اور اس کی ذریت میں نبوّت اور آسمانی کتاب قرار دی۔

۵۱۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ○

[1] اصول کافی (مطابق نقل تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۳۹)۔



Marfat.com

۵۲۔ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ○

۵۳۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ○

# ترجمہ

۵۱۔ اس (آسمانی) کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو وہ مخلص تھا اور بلند مرتبہ رسول اور پیغمبر تھا۔

۵۲۔ ہم نے اُسے (کوہِ) طور کی دائیں طرف سے پکارا اور اسے قریب کیا اور اُس سے ہم نے گفتگو کی۔

۵۳۔ اور ہم نے اپنی رحمت سے اُسے اس کا بھائی ہارون جو کہ نبی تھا بخشا۔

# تفسیر

## موسیٰؑ ایک مخلص و برگزیدہ پیغمبر :

زیر نظر تین آیات حضرت موسیٰؑ کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتی ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے ہیں اور ان بزرگوار پر ہونے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، کہ جنہوں نے ابراہیمؑ کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اس کی تکمیل کی۔

پہلے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رُوئے سُخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اپنی آسمانی کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو (واذکر فی الکتاب موسیٰ)۔

اس کے بعد ان نعمتوں میں سے جو اللہ نے اس عظیم پیغمبر کو مرحمت فرمائی ہیں پانچ قسم کی نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے:

۱۔ وہ خدا کی اطاعت اور بندگی کی وجہ سے اس مقام کو پہنچا کہ پروردگار نے اُسے خالص اور پاک بنا دیا (انہ کان مخلصاً)۔

اور یقینی طور پر جو شخص ایسے مقام پر فائز ہو جائے وہ انحراف اور آلودگی کے خطرے سے محفوظ رہتا ہے، چونکہ شیطان خدا کے بندوں کو منحرف کرنے پر اپنے تمام تر اصرار کے باوجود اعتراف کرتا ہے کہ وہ "مخلصین" کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا:

"قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین"

اُس نے کہا تیری عزت کی قسم تیرے مخلص بندوں کے سوا اُن سب کو گمراہ کروں گا۔ (ص ۸۲، ۸۳)

۲۔ وہ بلند مرتبہ پیغمبر اور رسول ہے۔ (وکان رسولاً نبیاً)۔

حقیقت رسالت یہ ہے کہ کسی کے ذمہ کوئی کام کیا جائے اور وہ اس ماموریت کی تبلیغ اور ادائیگی کا پابند ہو اور یہ وہ مقام ہے کہ جو ان تمام انبیاء کو حاصل تھا، جو دعوت دینے پر مامور تھے۔

"نبیاً" کا یہاں اس پیغمبر کے بلند مقام اور رفعت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دراصل "نبوہ" (بروزن نغمہ) جو مقام



Marfat.com

کی رفعت وبلندی کے معنی میں ہے سے لیا گیا ہے۔ البتہ اس کی ایک دوسری اصل بھی ہے کہ جو "نبأ" سے خبر کے معنی میں ہے، کیونکہ پیغمبر خداوند تعالیٰ کی طرف سے خبر حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو خبر دیتا ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

۳۔ بعد والی آیت موسیٰ کی رسالت کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ہم نے اُسے کوہ طور کی دائیں طرف سے بلند آواز میں پکارا (ونادیناہ من جانب الطور الایمن)۔

اس تاریک اور پُر وحشت رات میں جبکہ وہ اپنی زوجہ کے ساتھ مدین کے بیابانوں سے گزر کر مصر کی طرف جا رہے تھے، تو ان کی زوجہ کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہوگئی اور وہ خود ایک شدید سردی کی لپیٹ میں آگیا اور ایک آگ کے شعلے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ یکایک اور اچانک دُور سے ایک بجلی چمکی اور ایک آواز آئی اور موسیٰ کو رسالت کا فرمان دیا گیا اور یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین افتخار اور شیریں ترین لمحہ تھا۔

۴۔ علاوہ ازیں "ہم نے اُسے قریب کیا (اپنا تقرب بخشا) اور اس سے گفتگو کی" (وقربناہ نجیاً)۔ [1]

خداوند تعالیٰ کی ندا ایک نعمت تھی اور اُن سے تکلم و گفتگو دوسری نعمت۔

❋ ❋ ❋

اور آخر میں "ہم نے اپنی رحمت سے اسے ہارون جیسا بھائی عطا کیا کہ جو خود بھی پیغمبر تھا۔

(ووھبنا لہ من رحمتنا اخاہ ھارون نبیاً)۔

## چند اہم نکات :

۱۔ **مخلص کسے کہتے ہیں؟** اُوپر والی آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو اپنے "مخلَص" (لام کی زبر کے ساتھ) بندوں میں سے قرار دیا اور یہ مقام جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، بہت ہی باعظمت مقام ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں خدا کی طرف سے انسان کے لیے لغزشوں اور انحرافات سے بچنے کا گویا بیمہ ہو جاتا ہے، ایسا مقام جہاں شیطان کا کوئی اثر نہیں، یہ مقام مسلسل نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور لگا تار خداوند تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

علم اخلاق کے بزرگ علماء اس مقام کو بہت اعلیٰ اور بلند سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلصین" خاص صفات اور افتخارات کے حامل ہوتے ہیں جو انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں آئیں گی۔

۲۔ **رسول اور نبی میں فرق:** رسول در اصل اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کے ذمے کوئی ماموریت یا پیغام رسانی کا کام لگایا گیا ہو تا کہ وہ اس کو پہنچائے۔ اور "نبی" ایک تفسیر کی بنا پر اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو وحی الٰہی سے آگاہ ہے اور اس کی خبر دیتا ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر ایک عالی مقام شخص کے معنی میں ہے۔ (دونوں کا مادۂ اشتقاق پہلے بیان ہو چکا ہے) یہ تو لغت کے لحاظ سے ہے۔

لیکن قرآنی تعبیرات اور روایات کی زبان کے لحاظ سے بعض کا نظریہ یہ ہے:

---

[1] "نجی" "مناجی" کے معنی میں وہ شخص ہے کہ جو دوسرے کے کان میں کوئی بات کہے، یہاں خدا نے پہلے موسیٰ کو دُور کے فاصلے سے صدا دی، ان کے نزدیک آنے کے بعد ان سے "نجویٰ" (سرگوشی) میں بات کی۔ (یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ خدا نہ زبان رکھتا ہے اور نہ مکان بلکہ وہ فضا میں صوتی امواج پیدا کر دیتا ہے اور موسیٰ جیسے بندے کے ساتھ گفتگو کرتا ہے)۔



Marfat.com

رسول وہ شخص ہے کہ جو صاحب دین و آئین ہو اور تبلیغ کرنے پر مامور ہو۔ یعنی وحیِ الٰہی کو حاصل کرکے لوگوں کو اس کی تبلیغ کرے، باقی رہا "نبی" تو وہ وحی کو حاصل تو کرتا ہے لیکن تبلیغ کرنا اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ وہ وحی صرف اُسی کی اپنی ذمہ داری انجام دینے کے لیے ہوتی ہے یا اگر لوگ اس سے کوئی سوال کریں تو وہ اس کا جواب دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "نبی" اس آگاہ طبیب کی طرح ہے کہ جو اپنے مقام پر بیماروں کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے لیکن وہ بیماروں کے پیچھے نہیں جاتا۔ لیکن اگر بیمار اس کی طرف رجوع کریں تو پھر ان کا علاج کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

لیکن رسول اُس طبیب کی مانند ہے کہ جو سیار ہے (یعنی بیماروں کے پاس علاج کرنے کے لیے چل کر جاتا ہے) اور اُس تعبیر کے مطابق جو حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں پیغمبر اسلام کے بارے میں فرمائی ہے۔ (طبیب دوّار بطبہ)[1]

وہ شہروں میں، دیہات میں، کوہ و دشت و بیابان میں، ہر جگہ جاتا ہے تاکہ بیماروں کو تلاش کرے اور ان کا علاج کرے۔ وہ ایک ایسا چشمہ ہے کہ جو پیاسوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ ایسا چشمہ نہیں ہے کہ جسے پیاسے تلاش کرتے پھریں۔

اُن روایات سے کہ جو اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں اور مرحوم کلینی نے کتاب "اصول کافی" کے باب "طبقات الانبیاء والرسل" اور باب "الفرق بین النبی والرسل" میں بیان کی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے کہ جو حقائق وحی کو عالم خواب میں دیکھتا ہے (جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب تھا) یا خواب کے علاوہ بیداری میں بھی وحی کے فرشتے کی آواز سنتا ہے۔

لیکن رسول وہ ہوتا ہے کہ عالم خواب میں وحی حاصل کرنے اور فرشتہ کی آواز سننے کے علاوہ خود اس کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔[2]

البتہ ان روایات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس تفسیر کے منافی نہیں جو ہم نے بیان کی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ نبی و رسول کی ماموریت کا اختلاف و تفاوت وحی حاصل کرنے کے طریقہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہو اور دوسرے لفظوں میں ماموریت کا ہر مرحلہ وحی کے ایک مخصوص مرحلہ کے ساتھ ہو (غور کیجیے گا)۔

❖ ❖ ❖

۵۴۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝

۵۵۔ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

## ترجمہ

۵۴۔ اپنی (آسمانی) کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو۔ وہ اپنے وعدوں میں سچا اور ایک بزرگ پیغمبر اور رسول تھا۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۸۔

[2] اصول کافی، جلد اول، ص ۱۳۳ - ۱۳۴ (چاپ دار الکتب الاسلامیہ)۔



Marfat.com

۵۵۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضاؤں کا حامل تھا۔

# تفسیر

## اسمٰعیلؑ ۔ صادق الوعد پیغمبر :

ابراہیمؑ اور ان کی فدا کاریاں، اور اسی طرح موسٰیؑ کی زندگی کے بارے میں مختصر سا اشارہ کرنے کے بعد، قرآن ابراہیمؑ کے بزرگ ترین فرزند اسمٰعیلؑ کے بارے میں گفتگو شروع کرتا ہے، اور ابراہیمؑ کی یاد کو ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کی یاد کے ساتھ اور ان کے پروگراموں کی اسمٰعیلؑ کے پروگراموں کے ساتھ تکمیل کرتا ہے۔ یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی اعلیٰ صفات میں سے پانچ صفات جو سب لوگوں کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں بیان کی گئی ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اپنی آسمانی کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو (واذکر فی الکتاب اسمٰعیل)۔

وہ اپنے وعدوں میں سچا تھا (انہ کان صادق الوعد)۔

اور عالی مقام پیغمبر تھا (وکان رسولاً نبیّاً)۔

وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا (وکان یأمر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ)۔

اور ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا کا حامل رہتا تھا (وکان عند ربہ مرضیّاً)۔

ان دو آیات میں صادق الوعد ہونا، عالی مقام پیغمبر ہونا، نماز کا حکم دینا اور خالق کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا، زکوٰۃ کا حکم دینا اور مخلوق خدا کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنا اور آخر کار ایسے کام انجام دینا کہ جن میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، خداوند تعالیٰ کے اس عظیم پیغمبر کی صفات شمار ہوتے ہیں۔

عہد و پیمان کی وفا اور گھر والوں کی تربیت پر توجہ، ان دو فرائض الٰہی کی انتہائی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اُن میں سے ایک مقام نبوت سے پہلے اور دوسرا بلا فاصلہ مقام نبوت کے بعد ذکر ہوا ہے۔

حقیقتاً جب تک انسان صادق نہ ہو محال ہے کہ رسالت کے اعلیٰ مقام تک پہنچے کیونکہ اس مقام و مرتبہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وحی الٰہی کو بے کم و کاست اس کے بندوں تک پہنچائے۔ لہٰذا ان گنے چُنے چند افراد تک نے بھی، کہ جو انبیاء کے لیے ان کی عمر کے کسی حصہ میں مقام عصمت کا انکار کرتے ہیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صادق ہونے کے مسئلے کو ایک شرط اساسی کے طور پر قبول کر لیا ہے یعنی خبروں میں بھی صداقت و راستی، وعدوں میں بھی صداقت و راستی اور تمام چیزوں میں صداقت و راستی۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ جو خداوند تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کو صادق الوعد شمار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وعدہ کی وفا کرنے میں اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کسی آدمی سے ایک جگہ اس کے انتظار کا وعدہ کر لیا تھا، وہ شخص وہاں نہ آیا، لیکن اسمٰعیلؑ ایک سال تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ اس طویل عرصے کے بعد جس وقت وہ وہاں آیا تو اسمٰعیلؑ نے فرمایا کہ میں تو ہمیشہ تیرے انتظار میں رہا[1]

[1] اصول کافی، جلد دوم صہ ۸۶



Marfat.com

یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے ہرگز یہ منظور نہیں ہے کہ اسمٰعیلؑ نے اپنی زندگی کے دیگر کاموں کو ہی معطل کر دیا تھا، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے دیگر پروگرام جاری رکھتے ہوئے مذکورہ شخص کا انتظار کرتے رہے۔

ایفائے عہد کے سلسلے میں (چوتھی جلد صہ ۱۹۲ اُردو ترجمہ) سورۂ مائدہ کی پہلی آیہ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔

دوسری طرف سے تبلیغ رسالت کا پہلا مرحلہ اپنے خاندان اور گھر والوں سے شروع کرنا ہے، کیونکہ وہ انسان کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پہلے اپنی دعوت اپنی زوجۂ گرامی قدر جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا اور اپنے چچازاد بھائی حضرت علی علیہ السلام سے شروع کی اور اس کے بعد " وانذر عشیرتك الاقربین " [1] کے فرمان کے مطابق اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت دی۔

سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۳۲ میں بھی ہے:

" وأمر اهلك بالصلوة واصطبر عليها "

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی نماز کی ادائیگی پر پابند رہو۔

ایک اور نکتہ جو یہاں قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی رضائے الٰہی کا حامل ہونے کے ساتھ توصیف، واقعتاً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے سارے امور رضائے الٰہی کے سانچے میں ڈھال رکھے تھے۔

اصولاً کوئی نعمت اس سے بالاتر نہیں ہے کہ انسان کا معبود و مولا اور اس کا خالق اُس سے راضی و خوشنود ہو۔ اسی بنا پر سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۱۹ میں خدا کے مخصوص بندوں کے لیے بہشتِ جاوداں کا بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا گیا ہے:

" رضی الله عنهم و رضوا عنه ذلك الفوز العظيم "

خدا اُن سے راضی وخوش ہوا اور وہ بھی اُس سے خوش ہوں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی اور ایک بہت بڑی نجات ہے [2]

۞ ۞ ۞

۵۶۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝

۵۷۔ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

۵۸۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۝ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ

---

[1] سورہ شعرا، آیہ ۲۱۴۔

[2] اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد، صہ ۱۲۳ (اُردو ترجمہ) میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔



Marfat.com

هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا
وَبُكِيًّا ۩

۵۹۔ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ
فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝

۶۰۔ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا
يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝

## ترجمہ

۵۶۔ اور اس کتاب میں ادریس کو بھی یاد کرو وہ بہت ہی سچا اور عظیم پیغمبر تھا۔

۵۷۔ اور ہم نے اُسے بلند مقام پر پہنچایا۔

۵۸۔ وہ سب کے سب ایسے پیغمبر تھے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ یہ اُن انبیا میں سے تھے کہ جو آدم کی اولاد میں سے تھے اور اُن لوگوں میں سے تھے کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور وہ ابراہیم و یعقوب کی ذریت میں سے تھے اور ایسے تھے کہ جنہیں ہم نے ہدایت کی تھی اور برگزیدہ کیا تھا۔ وہ ایسے افراد تھے کہ جس وقت خدائے رحمٰن کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ زمین پر گر پڑتے تھے اور سجدے میں گریہ کیا کرتے تھے۔

۵۹۔ لیکن ان کے بعد ناشائستہ اور ناخلف اولاد نے ان کی جگہ لے لی، انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور شہوات کی پیروی کی اور وہ عنقریب اپنی گمراہی (کی سزا) کو دیکھیں گے۔

۶۰۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح بھی انجام دیں تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر معمولی سا بھی ظلم نہیں ہو گا۔

## تفسیر

### یہ سچے پیغمبر تھے، لیکن ۔۔۔

اس سورہ کی یاد آوریوں کے آخری حصے میں، حضرت ادریسؑ پیغمبر کے بارے میں بات کی گئی ہے۔



Marfat.com

پہلے فرمایا گیا ہے : اپنی آسمانی کتاب (قرآن) میں ادریس کو یاد کرو وہ صدیق اور پیغمبر تھا (واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقًا نبیًا)۔

"صدیق" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، بہت ہی سچ بولنے والے، خداوند تعالیٰ کی آیات کی تصدیق کرنے والے اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے شخص کو کہتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد اس کے بلند پایہ مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : ہم نے اُسے ایک بلند مقام تک پہنچا دیا (ورفعناہ مکانًا علیًا)۔

اس بارے میں کہ اس سے حضرت ادریس کے مقام معنوی کی عظمت مراد ہے۔ یا حسی مکان کی بلندی مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ہماری طرح بعض نے اس عظیم پیغمبر کے معنوی مقامات اور رُوحانی درجات کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت ادریسؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی طرح آسمان کی طرف لے گیا اور وہ (مکانًا علیًا) کی تعبیر کو اُوپر والی آیت میں اسی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن لفظ "مکان" کا اطلاق معنوی مقامات کے معنی میں عام چیز ہے۔ سورہ یوسف کی آیہ ۷۷ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہ جنہوں نے غلط کام انجام دیا تھا کہا :

انتم شر مکانًا

تم مقام و منزلت کے لحاظ سے بدترین آدمی ہو۔

بہرحال حضرت ادریسؑ خداوند تعالیٰ کے ایک بلند مقام اور عالی مرتبہ پیغمبر ہیں کہ جن کے حالات کی تفصیل نکات کے ضمن میں آئے گی۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد اُن تمام افتخارات و اعزازات کو، جو گزشتہ آیات میں عظیم انبیأ کے سلسلے میں اور ان کی صفات و حالات اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خداوند تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھیں، اجتماعی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا : وہ ایسے انبیا تھے کہ جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا (اُولٰئک الّذین انعم اللہ علیھم من النّبیین)۔

ان میں سے بعض آدم کی اولاد میں سے تھے اور بعض ان لوگوں کی اولاد میں سے تھے جو نوح کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے اور بعض ابراہیم اور اسرائیل کی ذریت میں سے تھے۔ (من ذریّۃ ادم وممّن حملنا مع نوح ومن ذریۃ ابراھیم واسرائیل)۔

باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب انبیأ آدم کی اولاد سے تھے ان کی کسی نہ کسی بزرگ پیغمبر سے نزدیکی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں ذریۃ ابراہیم و اسرائیل سے یاد کیا ہے اور اس آیت کی ترتیب میں ذریت آدم سے مراد ادریسؑ ہیں جو مشہور قول کے مطابق نوحؑ پیغمبر کے جدِّ امجد تھے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی اولاد سے مراد ابراہیم ہیں کیونکہ ابراہیمؑ نوح کے بیٹے سام کی اولاد میں سے تھے۔

اور ذریت ابراہیمؑ سے مراد اسحٰقؑ، اسمٰعیلؑ اور یعقوبؑ ہیں اور اسرائیل کی ذریت سے مراد موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ہیں۔ جن کے حالات اور بہت سی اعلیٰ صفات کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد اس بحث کی ان عظیم انبیأ کے سچے پیروکاروں کی یاد سے تکمیل کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : اور ان لوگوں میں سے کہ جنہیں ہم



Marfat.com

نے ہدایت کی ہے اور انہیں منتخب کیا ہے ایسے لوگ ہیں کہ جب خدائے رحمٰن کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ خاک پر گر پڑتے ہیں اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلتا ہے (وممن ھدینا واجتبینا اذا تتلیٰ علیھم اٰیات الرحمٰن خروا سجدًا و بکیًا)۔[1]

بعض مفسرین نے "ممن ھدینا واجتبینا۔۔۔" کے جملے کو انہی انبیاء کے بارے میں کہ جن کی طرف آیت کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے ایک دوسرا بیان سمجھا ہے، لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔[2]

اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کے وقت فرمایا:

نحن عنینا بھا

اس آیت سے مراد ہم اہل بیت ہیں۔[3]

ظاہر ہے کہ اس جملے سے ہرگز انحصار مراد نہیں ہے بلکہ یہ انبیاء کے سچے پیروکاروں کے واضح مصداق کا بیان ہے اور ہم نے اسی تفسیر نمونہ میں بارہا اس مطلب کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ نہ کرنا اس بات کا سبب بنا کہ آلوسی جیسے مفسرین روح المعانی میں اشتباہ کا شکار ہو گئے اور اس حدیث پر طعن کرنے لگے اور اسے احادیث شیعہ کے معتبر نہ ہونے کی دلیل سمجھنے لگے۔ اور یہی نتیجہ ان روایات کے واقعی مفہوم سے واقف نہ ہونے کا ہے کہ جو آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ: گزشتہ آیات میں حضرت مریمؑ کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی ہے، حالانکہ وہ انبیاء میں سے نہیں تھیں وہ بھی اُن افراد میں سے ہیں کہ جو "ممن ھدینا" کے جملے کا مصداق ہیں اور یہ جملہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ ایک یا کئی مصداق رکھتا تھا اور رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۶۹ میں بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کو صرف انبیاء تک منحصر نہیں کیا گیا بلکہ صدیقین و شہداء کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے:

"فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء"

سورہ مائدہ کی آیہ ۷۵ میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ کو "صدیقہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

وامہ صدیقۃ

اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں کہ جو انبیاء کے انسان ساز مکتب سے الگ ہو کر ناخلف پیروکار بن گئے گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن ان کے کچھ بُرے اعمال کو شمار کرتا ہے اور کہتا ہے: ان کے بعد ایسی ناخلف اولاد ہوئی کہ جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا

---

[1] "سجّد" ساجد (سجدہ کرنے والا) کی جمع ہے اور "بکیا" باکی (گریہ کرنے والا) کی جمع ہے۔

[2] کیونکہ اگر یہ گزشتہ انبیاء کی طرف اشارہ ہو تو فعل مضارع "تتلیٰ" جو آئندہ کے زمانہ کے ساتھ مربوط ہے اس سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ سوائے اس صورت کے کہ "کانوا" یا اسی جیسا کوئی لفظ مقدر سمجھیں، جو کہ خلاف ظاہر ہے۔

[3] مجمع البیان، محل بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

اور شہوات کی پیروی کرنے لگے یہ لوگ جلد ہی اپنی گمراہی کی سزا پالیں گے : ( فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیّا ) -

" خلف " ( بروزن برف ) غیر صالح اولاد کے معنی میں ہے اور اصطلاحاً اس کو " ناخلف " کہتے ہیں جبکہ " خلَف " ( بروزن صدف ) نیک اور صالح فرزند کے معنی میں ہے ۔

ممکن ہے یہ جملہ اُس گروہ کی طرف اشارہ ہو کہ جو بنی اسرائیل میں سے گمراہی کی راہ پر چل نکلا تھا - انہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا ۔ خواہشات کی پیروی کو ذکرِ خدا پر ترجیح دینے لگ گئے تھے ۔ انہوں نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور آخر کار دنیا میں بھی انہوں نے اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیا اور آخرت میں بھی ان کا نتیجہ دیکھیں گے ۔

اس بارے میں کہ اس مقام پر " اضاعۂ صلاۃ " سے مراد نماز کو ترک کرنا ہے یا اُس کے وقت سے تاخیر کرنا ہے یا ایسے اعمال بجالانا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں نماز ضائع ہو جائے ، مفسرین نے مختلف احتمال پیش کیے ہیں لیکن آخری معنی ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

اس مقام پر تمام عبادات میں سے صرف نماز ہی کا ذکر کیوں کیا گیا ؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کو گناہوں سے روکتی ہے ۔ جب یہ رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے تو اس کا قطعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خواہشات میں غرق ہو جاتا ہے ۔

دُوسرے الفاظ میں جس طرح پیغمبروں نے اپنے مقام کے ارتقا کو یادِ خدا سے شروع کیا تھا اور جس وقت خدا کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ خاک پر گر جاتے تھے اور گریہ کرتے تھے ، ان ناخلف پیروکاروں نے اپنی تباہی کا آغاز یادِ خدا کو بھلا دینے سے کیا ۔

٭ ٭ ٭

قرآن یہی چاہتا ہے کہ ایمان وحق کی طرف آنے کی راہ کھلی رکھے یہاں بھی ناخلف نسلوں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد قرآن اس طرح کہتا ہے : مگر وہ لوگ کہ جو توبہ کر لیں گے ، ایمان لے آئیں گے اور عملِ صالح انجام دیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا سا ظلم بھی نہ ہوگا :
( الا من تاب وامن وعمل صالحا فاولٰئک یدخلون الجنة ولا یظلمون شیئا ) ۔

اس بنا پر یہ بات نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دن خواہشات کی پیروی کر بیٹھے تو ہمیشہ کے لیے ہی اس کی پیشانی پر رحمتِ خدا سے مایوسی اور ناامیدی کی مہر لگ جائے گی ، بلکہ جب تک سانس باقی ہے اور انسان دنیا میں زندہ ہے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے ۔

## چند نکات :

### ادریسؑ کون تھے ؟

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق ادریسؑ ، نوحؑ کے پردادا تھے ان کا نام توریت میں " اخنوخ " اور عربی میں ادریس ہے جسے بعض " درس " کے مادہ سے سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قلم کے ساتھ خط لکھا ۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انسان کو لباس سینے کا طریقہ سکھایا ۔



Marfat.com

اس عظیم پیغمبر کے بارے میں قرآن میں صرف دو مرتبہ ، وہ بھی مختصر سے اشاروں کے ساتھ ، بیان آیا ہے - ایک انہیں زیر بحث آیات میں اور دوسرا سورہ انبیا کی آیات ۸۵- ۸۶ میں - مختلف روایات میں ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جسے ہم پورے پورا معتبر نہیں سمجھ سکتے - اسی وجہ سے ہم مذکورہ اشارے پر قناعت کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں ۔

❖ ❖ ❖

۲ - ایک حدیث میں کہ جو علمائے اہلِ سُنّت کی بہت سی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، یہ کہا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جب آیہ " فخلف من بعدھم خلف ... ... " کی تلاوت کی تو فرمایا :

یکون خلف من بعد ستین سنة اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف یلقون غیاً ثم یکون خلف یقرئون القراٰن لایعدوا تراقیهم ویقرء القراٰن ثلاثة مؤمن ومنافق وفاجر ؛

ساٹھ سال کے بعد ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو نماز کو ضائع کر دیں گے اور شہوات میں غرق ہو جائیں گے اور بہت جلدی اپنی گمراہی کا نتیجہ پالیں گے - ان کے بعد اور گروہ ظاہر ہوگا - یہ لوگ قرآن کو ( بڑی شان کے ساتھ ) پڑھیں گے - لیکن وہ ان کے شانوں سے اُدپر رہ جائے گا - کیونکہ نہ اس میں اخلاص ہوگا ، نہ غور و فکر ہوگا نہ عمل کرنے کے لیے سوچ بچار ہوگا بلکہ وہ ریاکاری اور دکھاوے کے طور پر ہوگا - یا صرف الفاظ پر قناعت ہوگی اور اسی وجہ سے ان کے اعمال خدا کی بارگاہ میں نہ پہنچ پائیں گے [1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اگر ہم ساٹھ سال کی ابتداء پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت سے لیں تو یہ ٹھیک وہ زمانہ بنتا ہے کہ جب یزید تختِ سلطنت پر بیٹھا - اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کے یار و انصار نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور اس کے بعد باقی ماندہ زمانہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کا دور ہے کہ جنہوں نے اسلام کے صرف نام پر قناعت کرلی تھی اور قرآن کے صرف الفاظ پر ہم خدا سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم اس قسم کے ناخلف گروہ میں سے ہوں ۔

۶۱ - جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۣالَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّهٗ کَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِیًّا ○

۶۲ - لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِیۡهَا بُکۡرَةً وَّعَشِیًّا ○

۶۳ - تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ کَانَ تَقِیًّا ○

## ترجمہ

۶۱ - دائمی باغات ہیں جن کا خدائے رحمان نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے - اگرچہ ان کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے ، لیکن

[1] تفسیر المیزان ، جلد ۱۴ ، ص ۸۴ پر



Marfat.com

خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا۔

۶۲۔ وہ وہاں ہرگز لغو اور بے ہودہ گفتگو نہیں سنیں گے، اور سوائے سلام کے کوئی بات نہیں ہے، اور اس میں ہر صبح و شام ان کے لیے روزی مقرر ہے۔

۶۳۔ یہ وہی جنت ہے کہ جو ہم بطور میراث اپنے پرہیزگار بندوں کو دیں گے۔

# تفسیر

## جنّت کی توصیف :

ان آیات میں جنت اور جنتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جس کا بیان آیات گزشتہ میں آیا ہے :

پہلے بہشتِ موعود کی اس طرح توصیف کی گئی ہے، ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ جن کا خدائے رحمٰن نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے اور انہوں نے انہیں دیکھا نہیں ہے، (لیکن ان پر ایمان رکھتے ہیں) (جنات عدن التی وعد الرحمٰن عبادہ بالغیب)۔

خدا کا وعدہ حتمی طور پر پورا ہو کر رہے گا (انہ کان وعدہ مأتیاً)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں توبہ، ایمان اور عملِ صالح کے بارے میں گفتگو تھی اور اس کے بعد بہشت کا وعدہ مفرد "جنت" کی صورت میں آیا تھا لیکن یہاں جمع "جنات" کی صورت میں ہے کیونکہ "جنت" درحقیقت بہت زیادہ پُرنعمت متعدد باغات کا مرکب ہے جو صالح مومنین کے لیے ہے۔

"عدن" کے ساتھ ان کی توصیف جو ہمیشگی اور جاودانی کے معنی میں ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ "جنت" اس جہان کے باغات اور نعمتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو زائل ہونے والی ہو کیونکہ جو چیز انسان کو اس جہان کی عظیم نعمتوں کے بارے میں پریشان کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ سب آخر کار زوال پذیر ہیں لیکن "جنت" کی نعمتوں کے بارے میں یہ پریشانی نہیں ہے۔[۱]

"عبادہ" کا لفظ خدا کے مومن بندوں کے معنی میں ہے نہ کہ تمام بندوں کے معنی میں اور "بالغیب" کی تعبیر جو اس کے بعد ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس کے باوجود وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ سورہ فجر کی آیہ ۳۰ میں بیان ہوا ہے :

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں وارد ہو۔

"بالغیب" کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئیں۔ اس کی نعمتیں کامل طور پر ہماری حس و ادراک سے غائب ہیں۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جو اس جہان سے برتر، وسیع تر اور بالاتر ہے۔ اس کا ہم صرف روحانی آنکھ کے ساتھ دُور سے ایک دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔

✣ ✣ ✣

---

[۱] "عدن" : لغت کے لحاظ سے اقامت کے معنی میں ہے اور یہاں یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کے ساکن ہمیشہ اس میں مقیم رہیں گے۔



Marfat.com

اس کے بعد بہشت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ وہاں کوئی لغو اور بیہودہ بات ہرگز نہیں سنیں گے ( لا یسمعون فیھا لغوا ) ۔ نہ کوئی جھوٹ ، نہ گالی گلوچ ، نہ تہمت ، نہ زبان کے زخم ، نہ کوئی تمسخر اور مذاق اڑانے کی بات یہاں تک کہ کوئی بیہودہ بات نہیں ہوگی ۔

صرف ایک چیز جو وہاں ہمیشہ کان میں آتی رہے گی وہ سلام ہے ( الا سلاما ) ۔

سلام : اپنے وسیع معنی میں جو اہل بہشت کی رُوح ، فکر ، کردار اور گفتار کی سلامتی پر دلالت کرتا ہے ۔

ایسا سلام کہ جس نے اس ماحول کو ایک بہشت بنا دیا ہے اور ہر قسم کی اذیت و تکلیف اُس سے ختم کر دی ہے ۔

ایسا سلام جو امن و سلامتی کے ماحول کا ایک نمونہ اور صفا و صمیمیت ، پاکیزگی و تقویٰ ، صلح و آشتی اور آرام و سکون کے ماحول کی ایک نشانی ہے ۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی حقیقت مختلف تعبیروں کے ساتھ بیان ہوئی ہے ۔ سورہ زمر کی آیہ ۷۳ میں ہے :

"وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خلدین"

جنّت کے خزینہ دار جنّت میں داخل ہوتے وقت اُن سے کہیں گے : آپ پر سلام ہو ، ہمیشہ خوش و خرم رہیں ، پاک و پاکیزہ رہیں ، آیئے تشریف لایئے ، جنّت میں داخل ہو جایئے اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں قیام فرمایئے ۔

سورہ ق کی آیہ ۳۴ میں ہے :

ادخلوھا بسلام ذالک یوم الخلود

سلام و سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ ۔ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنّت میں داخلے کا دن ہے ۔

نہ صرف فرشتے اُن پر اور وہ خود ایک دوسرے پر درود و سلام بھیجیں گے بلکہ خدا بھی ان پر درود و سلام بھیجے گا ۔ جیسا کہ سُورہ یٰسین کی آیہ ۵۸ میں اُن پر سلام بھیج رہا ہے :

سلام قولا من رب رحیم

تم پر سلام ہو یہ مہربان پروردگار کی طرف سے تم بہشتیوں پر ایک سلام ہے ۔

کیا سلام و سلامتی سے معمور اس ماحول سے بڑھ کر باصفا اور زیبا تر اور بھی کوئی ماحول ہے ؟

اس نعمت کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہر صبح و شام ان کی روزی بہشت میں ان کے لیے حاضر ہے ۔ ( ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا ) ۔

اس جملے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں :

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا جنّت میں صبح و شام ہوتی ہے ؟

اس سوال کا جواب اسلامی روایات میں اس طرح آیا ہے :

اگرچہ بہشت میں ہمیشہ نور اور روشنی ہوتی ہے لیکن بہشتی اُس کے نور اور سائے کے کم و زیادہ



Marfat.com

ہونے سے رات اور دن کی تشخیص کریں گے ۔

**دوسرا سوال** : یہ ہے کہ آیاتِ قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ اہلِ بہشت جس نعمت اور جس روزی کی خواہش کریں گے ہمیشہ اور ہر وقت اسے حاصل کر سکیں گے ۔ یہ کونسا رزق ہوگا جو صرف صبح و شام اُنہیں ملے گا ؟

اِس سوال کا جواب ایک لطیف حدیث سے کہ جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ جس میں آپؐ فرماتے ہیں :

وتعطيهم طرف الهدايا من الله لمواقيت الصلوٰة التى كانوا يصلون فيها فى الدنيا۔

خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایسے عمدہ عمدہ تحفے اور ہدیے انہیں اُن اوقات میں دیئے جائیں گے جن اوقات میں وہ دنیا میں نماز پڑھا کرتے تھے ۔[1]

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممتاز ہدیے جن کی ماہیت و حقیقت کو قیاس اور اندازے سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ایسی قیمتی نعمتیں ہوں گی جو جنّت کی عام نعمتوں کے علاوہ صبح و شام اُنہیں بطور ہدیہ دی جائیں گی ۔

کیا مذکورہ بالا آیت کی تعبیر اور مذکورہ بالا حدیث اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اہلِ بہشت کی زندگی ایک ہی طرز پر نہیں ہوگی بلکہ ہر روز اور ہر صبح و شام نئی نئی نعمتیں اور تازہ بہ تازہ لطف ان کے شاملِ حال ہوگا ؟

اور کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہاں انسان کا ارتقا جاری رہے گا ۔ اگرچہ وہ وہاں کوئی نیا عمل بجا نہیں لائے گا لیکن اپنے عقائد و اعمال کا جو مرکب اس نے اس جہان میں بنایا ہے اس کے ذریعے اپنی ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہے گا ۔

جنّت اور اس کی مادی و رُوحانی نعمتوں کی اجمالی تعریف و توصیف کے بعد، اہلِ جنّت کا ایک مختصر سے جملے میں تعارف کرواتے ہوئے قرآن کہتا ہے : یہ وہی جنّت ہے کہ جو ہم اپنے پرہیز گار بندوں کو میراث کے طور پر دیں گے (تلك الجنة التى نورث من عبادنا من كان تقيًا)۔

گویا اتنی نعمتوں سے بھری جنّت کے دروازے کی کلید "تقویٰ" کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔

اگرچہ "عبادنا" (ہمارے بندوں) کی تعبیر میں ایمان و تقویٰ کی طرف خود ایک اجمالی اشارہ موجود ہے لیکن یہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں اجمالی اشارہ کو کافی سمجھ لیا جائے ، بلکہ یہاں صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہونی چاہیئے کہ جنّت **صرف** پرہیزگاروں کی جگہ ہے ۔

یہاں پھر لفظ " ارث " (میراث) کے ساتھ ہمیں سابقہ پڑتا ہے جو عام طور پر ایسے مال کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی سے اس کی موت کے بعد کسی دوسرے تک پہنچتا ہے ، حالانکہ جنّت کسی کی ملکیت نہیں ہے اور ظاہری طور پر کسی سے کسی کو کچھ پہنچنے کی کوئی بات نہیں ہے ۔

اِس سوال کا جواب دو طریقے سے دیا جا سکتا ہے :

۱۔ " ارث " لغت میں " تمليك " کے معنی میں آیا ہے اور مرنے والے کے مال کے اس کے پسماندگان کی طرف منتقل ہونے پر منحصر نہیں ہے ۔

---

[1] تفسیر رُوح المعانی ، ج ۱۶ ، ص۱۰۳ ۔



Marfat.com

۲۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

ما من احد الا وله منزل فی الجنة ومنزل فی النار فاما الکافر فیرث المؤمن منزله من النار، والمؤمن یرث الکافر منزله من الجنة :

"ہر شخص کا بلا استثنا ایک مکان جنّت میں ہوتا ہے اور ایک مکان جہنم میں ہوتا ہے۔ کافر تو جہنم میں مومنوں کے مکان کے مالک بن جائیں گے اور مومن جنّت میں کافروں کے مکان کے وارث ہو جائیں گے۔"[1]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "وراثت" جس معنی میں حدیث میں آیا ہے وہ نسبی تعلق کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ عقائد و عمل تقویٰ کے زیر اثر ہے۔ بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کی جو شانِ نزول بیان کی ہے اُس سے بھی اسی معنی کی تصدیق ہوتی ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص نے جس کا نام "عاص بن وائل" تھا اپنے مزدور کی اُجرت (جو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان تھا) نہ دی اور طعنہ کے طور پر کہا : اگر وہ باتیں جو محمد کہتا ہے حق ہیں تو ہم ہر شخص سے زیادہ جنّت کی نعمتوں کے حقدار ہیں وہاں اس مزدور کی مزدوری پوری پوری ادا کردیں گے تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور کہا : "یہ جنّت متقی بندوں کے لیے مخصوص ہے۔"

۶۴۔ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝

۶۵۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝

## ترجمہ

۶۴۔ ہم تیرے پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے وہ سب اسی کا ہے اور تیرا پروردگار بھولنے والا نہ تھا (اور نہ ہے)۔

۶۵۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کا پروردگار ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت کرنے میں صبر سے کام لو۔ کیا اس کا کوئی مثل و مانند تمہیں مل سکتا ہے ؟

## شانِ نزول :

بہت سے مفسرین مذکورہ بالا آیت کی شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ چند دنوں تک وحی منقطع رہی اور خدائی وحی کا پیغام رساں جبرئیل

[1] نور الثقلین جلد ۳ ص ۳۱۔ اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں ص۱۵۹ (اردو ترجمہ) پر بھی بحث کر چکے ہیں۔



Marfat.com

پیغمبر اکرمؐ کے پاس نہ آیا۔ جب یہ مدت ختم ہوگئی اور جبرئیل پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوا، تو آپؐ نے اُس سے فرمایا: تُونے دیر کیوں کردی؟ مَیں تیرا بہت ہی مشتاق رہا۔ تو جبرئیل نے عرض کی، میں تو آپ سے بھی زیادہ مشتاق تھا۔ لیکن مَیں تو حکم کا پابند ہوں۔ جب مجھے حکم ملتا ہے مَیں تو اُس وقت آتا ہوں اور جب مجھے کوئی حکم نہ ہو تو میں نہیں آتا[1]

# تفسیر

## ہم تو حکم کے بندے ہیں:

اگرچہ ان آیات کی ایک خاص شانِ نزول ہے جو اُوپر بیان ہوئی ہے، لیکن یہ اس بات سے مانع نہیں ہے کہ اس کا گزشتہ آیات کے ساتھ منطقی ربط و تعلق ہو۔ کیونکہ یہ اس بات پر ایک تاکید ہے کہ جبرئیل جو کچھ گزشتہ آیات میں لے کر آیا ہے وہ سب کا سب بے کم و کاست خُدا کی طرف سے ہے اور کوئی بات اُس نے خُود اپنی طرف سے نہیں کہی ہے۔ پہلی آیت قاصدِ وحی کی زبانی کہتی ہے: ہم تیرے پروردگار کے فرمان کے بغیر نازل نہیں ہوتے۔ (وما نتنزل الا بامر ربك)۔ سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے، اور ہم تو جان و دل برکف بندے ہیں، جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اسی کا ہے (له ما بين ايدينا وما خلفنا وما بين ذالك)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ وگزشتہ اور زمانۂ حال، یہاں اور وہاں اور سب جگہ، دنیا و آخرت و برزخ سب کچھ پروردگار کی ذاتِ پاک کے ساتھ متعلق ہے اور اسی کا ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ: "تمہارا پروردگار نہ فراموش کرنے والا تھا اور نہ ہے (وما كان ربك نسيًّا)۔

بعض مفسرین نے "له ما بين ايدينا وما خلفنا وما بين ذالك" کی متعدد تفسیریں کی ہیں جو تقریباً گیارہ تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب تیرے پروردگار کے حکم سے ہے " جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا پروردگار ہے (ربّ السمٰوٰت والارض وما بينهما)۔

اب جبکہ یہ بات ہے اور تمام ہدایات اسی کی طرف سے ہیں " تو پھر صرف اسی کی عبادت کرو۔ (فاعبده)۔

ایسی عبادت کہ جو توحید و اخلاص کے ساتھ ہو، اور چونکہ اس راہ — راہِ بندگی و اطاعت اور خدا کی خالص عبادت — میں بہت زیادہ سختیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں لہٰذا مزید ارشاد ہوتا ہے: اس کی عبادت کی راہ میں صابر رہ: (واصطبر لعبادته)۔

اور آخری جملے میں ہے: کیا تجھے خدا کا کوئی مثل و مانند نظر آتا ہے: (هل تعلم له سميًّا)۔

یہ جملہ درحقیقت اس بات پر ایک دلیل ہے جو اس سے پہلے جملے میں بیان ہوئی ہے، یعنی کیا اس کی پاک ذات کے لیے کوئی شریک اور

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۶، ص ۴۱۶۸ اور تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں (تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔



Marfat.com

مثل و مانند ہے کہ جس کی طرف تم دستِ سوال دراز کرو اور اس کی عبادت کرو ؟

لفظ "سمی" اگرچہ ہمنام کے معنی میں ہے لیکن یہ بات صاف طور پر واضح و روشن ہے کہ اس مقام پر صرف نام مراد نہیں ہے ، بلکہ نام کا معنی و مفہوم مراد ہے ، یعنی کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق ، رازق ، محی ، ممیت ، ہر چیز کا عالم اور ہر چیز پر قادر تمہیں مل سکتا ہے ؟

۶۶۔ وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ○

۶۷۔ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ○

۶۸۔ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ○

۶۹۔ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ○

۷۰۔ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ○

## ترجمہ

۶۶۔ انسان کہتا ہے کہ کیا میں مرنے کے بعد آئندہ (قبر سے) زندہ ہو کر باہر نکلوں گا ؟

۶۷۔ کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) خلق کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز تھا ہی نہیں ۔

۶۸۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو اور شیاطین کو بھی ضرور ضرور زندہ کر کے اُٹھائیں گے ۔ اس کے بعد ہم اُن سب کو جہنم کے گرداگرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے ۔

۶۹۔ پھر ہم ہر گروہ اور جماعت میں سے اُن لوگوں کو جو خدائے رحمٰن کے مقابل میں سب سے زیادہ سرکش تھے ، الگ کر لیں گے ۔

۷۰۔ پھر ہم اُن افراد کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو سب سے پہلے جہنم میں جلنے کے سزاوار ہیں ۔ (اور ہم انہیں دوسروں کی نسبت پہلے سزا دیں گے)۔

## شانِ نزول :

مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق پہلی آیات "ابی بن خلف" یا "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور اسے اپنے ہاتھ سے رگڑ کر ہوا میں بکھیر رہے تھے تاکہ اس کا ہر ہر ذرہ کسی نہ کسی گوشہ میں بکھر جائے ۔



Marfat.com

وہ کہتے تھے کہ محمد کی طرف دیکھو جس کا گمان یہ ہے کہ خدا ہمیں مرنے اور اس ہڈی کی طرح ہماری ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ بات قطعاً ممکن نہیں ہے۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں دندان شکن جواب دیا، ایسا جواب جو تمام انسانوں کے لیے ہر قرن اور ہر زمانے میں مفید اور سبق آموز ہے۔

# تفسیر

## دوزخیوں کی کچھ توصیف:

گزشتہ آیات میں قیامت اور بہشت و دوزخ کے بارے میں بحث ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات بھی اسی بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں قیامت کا انکار کرنے والوں کی گفتگو کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: انسان کہتا ہے کہ کیا مرنے کے بعد آئندہ زمانے میں قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلوں گا (ویقول الانسان ءاذا مامت لسوف اخرج حیًّا)۔

البتہ یہ استفہام ایک استفہام انکاری ہے یعنی ایسی بات ممکن نہیں ہے لیکن "انسان" کے ساتھ تعبیر (خصوصاً الف اور لام کہ جو جنس کے طور پر آتے ہیں) جبکہ مناسب یہ تھا کہ اس کی بجائے "کافر" کہا جاتا۔ یہ بات شاید اس وجہ سے ہو کہ ابتدا میں یہ سوال کم و بیش ہر انسان کی طبیعت میں مخفی ہوتا ہے اور (موت کے بعد زندہ ہونے) کو سنتے ہی فوراً استفہامی علامت اُس کے ذہن میں اُبھر آتی ہے؟

٭ ٭ ٭

بلا فاصلہ اسی لب و لہجے اور اُسی تعبیر کے ساتھ اُسے جواب دیا گیا ہے: کیا انسان اِس حقیقت کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے اُسے (اس حال میں) پیدا کیا تھا جبکہ وہ مطلقاً کوئی چیز ہی نہیں تھا (اولا یذکر الانسان انا خلقناه من قبل و لـم یك شیئًا)۔

یہاں بھی "الانسان" کی تعبیر ممکن ہے، اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کو اس خداداد استعداد اور ہوش و حواس کے ساتھ ایسے سوال کے جواب میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے، بلکہ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی پہلی خلقت کو یاد کر کے خود اس کا جواب دے، ورنہ اُس نے اپنی "انسانیت" کی حقیقت کو استعمال نہیں کیا۔

یہ آیات بھی معاد سے مربوط بہت سی دُوسری آیات کی طرح معادِ جسمانی کو ثابت کر رہی ہیں۔ ورنہ اگر یہ بنا ہوتی کہ صرف رُوح باقی ہے اور جسم کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا مطلوب نہ ہوتا تو پھر نہ اس سوال کا کوئی موقع تھا، نہ اس جواب کا۔

بہرحال قرآن نے معاد کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل اس مقام پر دی ہے، یہی دلیل قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی بیان ہوئی ہے اُن میں سے ایک سورۂ یٰس میں ہے:

اولـم یر الانسان انا خلقناه من نطفة فاذا هو خصیـم مبین و
ضرب لنا مثلاً ونسی خلقه قال من یحی العظام وهی رمیـم قل یُحییها الذی



Marfat.com

انشأها اول مرة وهو بكل خلق عليم

کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر یہ ناچیز نطفہ اپنے دفاع میں بولنے والے انسان کی شکل میں بدل گیا لیکن اس انسان نے اس حالت کے باوجود ہمارے لیے ایک مثال پیش کی اور اپنی پیدائش کو بالکل ہی بھول گیا، اس نے کہا کہ: ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا تم کہہ دو کہ انہیں وہی خدا زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ اپنی تمام مخلوقات کا علم رکھتا ہے۔ (یٰس - ۷۷ تا ۷۹) [1]

بعض مفسرین نے اس مقام پر ایک سوال اُٹھایا ہے کہ اگر یہ دلیل درست ہو کہ جس شخص نے کوئی کام انجام دیا ہو وہ اُسی جیسا اور کام بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر ہم کچھ کاموں کو انجام دینے کے بعد انہی جیسے کاموں کو دوبارہ کرنے پر قادر کیوں نہیں ہوتے؟ مثلاً ہم بعض اوقات بہت عمدہ شعر کہہ لیتے ہیں یا بہت خوشخط لکھ لیتے ہیں لیکن بعد میں بہت کوشش کے باوجود ویسا کام نہیں کر سکتے۔"

اس سوال پر ہمارا جواب یہ ہے کہ صحیح ہے کہ ہم اپنے اعمال اپنے ارادہ واختیار سے انجام دیتے ہیں لیکن بعض اوقات غیر اختیاری امور کا ایک سلسلہ ہمارے بعض افعال کی خصوصیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی ہمارے ہاتھوں کی غیر محسوس لرزش حروف کی دقیق شکل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری قدرت واستعداد ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں کہ جو ہمارے تمام اندرونی قویٰ کو اکٹھا کر دیتے ہیں جس سے ہم ایک شاہکار پیدا کر سکتے ہیں لیکن بعض اوقات عوامل محرکہ کمزور ہوتے ہیں اور ہمارے تمام قویٰ مجتمع نہیں ہو پاتے اور اسی بناء پر دوسری مرتبہ کیا ہوا کام پہلی مرتبہ کیے ہوئے کام جتنا اچھا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ خدا جس کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے اُس کے لیے اس قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جو کام بھی انجام دے بالکل اسی جیسا بے کم وکاست دوبارہ سرانجام دے سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں منکرین معاد اور بے ایمان گنہگاروں کو انتہائی یقینی انداز میں تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کی قسم ہم اُن سب کو اُن شیاطین کے ساتھ کہ جو انہیں وسوسہ میں ڈالتے تھے یا اُن کے معبود تھے، سب کو محشور کریں گے (فوربك لنحشرنهم والشياطين)۔

پھر ہم اُن سب کو جہنم کے گرداگرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے: (ثم لنحضرنهم حول جهنم جثيا)۔

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور گنہگار لوگوں کی دادگاہ جہنم کے نزدیک ہے۔

"جثیا" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "جثی" جاثی کی جمع، اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہو) شاید یہ ان کے ضعف وناتوانی اور ذلت وخواری کی طرف اشارہ ہو۔ گویا اُن میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ پاؤں پر کھڑے

[1] ہم اس دلیل کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں ــــــ (اُردو ترجمہ) "معاد کی مختصر ترین دلیل" کے حوالے سے بحث کر چکے ہیں۔ اور اسی طرح تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد کے ــــــ (اُردو ترجمہ) سے آگے بھی۔



Marfat.com

ہو سکیں۔ البتہ اس لفظ کے اور معانی بھی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض نے "جثی" کو "گروہ گروہ" کے معنی میں تفسیر کیا ہے اور بعض نے انبوہ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے مثلاً مٹی اور پتھروں کے معنی میں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

❖ ❖ ❖

اس دادگاہِ عدل میں چونکہ اوّلیت کا لحاظ رکھا جائے گا، لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم سب سے پہلے اُن لوگوں کو گرفت میں لیں گے جو سب سے زیادہ سرکش اور سب سے بڑھ کر باغی ہیں۔" ہم ہر گروہ اور جماعت میں سے ایسے افراد کو کہ جو خدائے رحمٰن کے سامنے سب سے زیادہ سرکش ہوں گے علیحدہ کرلیں گے" (ثم لننزعن من كل شيعة ايهم اشد على الرحمٰن عتيًّا)۔ [۱]

وہی بے شرم لوگ کہ جنہوں نے خدائے رحمٰن کی نعمتوں تک کو بھلا دیا اور اپنے ولی نعمت کے مقابلے میں گستاخی، نافرمانی اور طغیان و سرکشی پر اُتر آئے۔ ہاں! ہاں! یہی لوگ سب سے زیادہ جہنم کے سزاوار ہیں۔

❖ ❖ ❖

پھر اسی معنی کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ہم اُن لوگوں سے کہ جو جہنم کی آگ میں جلنے کے لیے اول نمبر پر ہیں، اچھی طرح آگاہ ہیں۔ (ثم لنحن اعلم بالذين هم اولٰى بها صليًّا)۔

ہم انہیں انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ چھانٹ کر نکال لیں گے اور اس میں کسی قسم کی غلطی یا اشتباہ نہیں ہوگا۔

"صلی" مصدر ہے کہ جو آگ روشن کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور اُس چیز کے معنی میں بھی کہ جسے آگ میں جلاتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۷۱۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝

۷۲۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝

## ترجمہ

۷۱۔ اور تم سب کے سب (بلا استثنا) جہنم میں جاؤ گے یہ تیرے پروردگار کا حتمی امر اور قطعی فیصلہ ہے۔

۷۲۔ پھر ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے رہائی بخشیں گے اور ظالموں کو اسی میں رہنے دیں گے جبکہ وہ (کمزوری اور ذلت کے باعث) گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے۔

---

[۱] لفظ "شیعہ" اصل لغت میں اس گروہ کے معنی میں ہے کہ جو کسی کام کی انجام دہی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور مذکورہ بالا آیت میں اس تعبیر کا انتخاب ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ بے ایمان اور گمراہ لوگ طغیان و سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا کرتے تھے اور ہم پہلے اسی گروہ کا حساب لیں گے کہ جو سب سے زیادہ سرکش تھے۔



Marfat.com

# تفسیر

## کیا سب جہنم میں جائیں گے ؟

مذکورہ بالا آیات بھی قیامت کی خصوصیات اور جزا و سزا کے بارے میں ہیں۔ پہلے تو ایک ایسے مطلب کی طرف کہ جس کا سننا شاید اکثر لوگوں کے لیے حیرت انگیز ہو اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم سب کے سب بلا استثنا جہنم میں جاؤ گے (و ان منکم الّا واردھا)۔

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حتمی امر ہے اور ایک قطعی فیصلہ ہے: (کان علیٰ ربک حتماً مقضیًّا)۔

✧ ✧ ✧

پھر ہم اُن لوگوں کو کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا نجات دے دیں گے اور ظالموں اور ستمگروں کو جبکہ وہ کمزوری اور ذلت کی وجہ سے گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے اسی میں رہنے دیں گے۔ (ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیًّا)۔

ان دونوں آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان ایک بہت بڑی بحث ہے۔ اس بحث کی بنیاد یہ ہے کہ "ان منکم الا واردھا" کے جملے میں "ورود" سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "ورود" اس مقام پر نزدیک ہونے اور جھانکنے کے معنی میں ہے۔ یعنی تمام لوگ، اچھے اور بُرے بلا استثنا حساب کتاب کے لیے یا بدکاروں کے آخری انجام کا مشاہدہ کرنے کے لیے جہنم کے نزدیک آئیں گے، اس کے بعد خدا پرہیزگاروں کو نجات بخشے گا اور ستمگروں کو اسی میں چھوڑ دے گا۔

وہ اس تفسیر کے لیے سورۂ قصص آیہ ۲۳: ولما ورد ماء مدین ... "جس وقت موسیٰ مدین کے پانی کے پاس پہنچے ..." سے استدلال کرتے ہیں کہ یہاں بھی "ورود" اسی معنی میں ہے۔

دوسری تفسیر کہ جسے اکثر مفسرین نے انتخاب کیا ہے یہ ہے کہ "ورود" اس مقام پر دخول کے معنی میں ہے، اور اس طرح تمام انسان نیک و بد، بلا استثنا جہنم میں وارد ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ دوزخ نیک لوگوں پر سرد و سالم رہے گی، جیسا کہ نمرود کی آگ ابراہیم پر سرد و سالم رہی:

(یا نار کونی برداً و سلاماً علیٰ ابراھیم)۔

کیونکہ آگ کا ان سے کوئی میل نہیں، اس لیے اُن سے دُور ہو جائے گی اور فرار کرے گی، اور جس جگہ وہ ٹھہریں گے وہاں خاموش ہو جائے گی لیکن دوزخی چونکہ جہنم کی آگ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لہٰذا قابلِ اشتعال مادہ کی طرح جب وہ آگ کے قریب پہنچیں گے تو وہ فوراً بھڑک اُٹھیں گے۔

اس بات سے قطع نظر کہ اس کام کا فلسفہ کیا ہے (جس کی ہم انشاءاللہ آگے چل کر تشریح کریں گے) بلاشک مذکورہ بالا آیت کا ظاہر دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے، کیونکہ ورود کا اصلی معنی دخول ہی ہے اور اس کے علاوہ معنی مراد لینے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے۔



Marfat.com

اس کے علاوہ ثم ننجی الذین اتقوا "پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے" کا جملہ اسی طرح "نذر الظالمین فیھا" "ستمگروں کو ہم اسمیں رہنے دینگے" کا جملہ یہ سب اسی معنی کے شاہد ہیں۔

اِس کے علاوہ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بہت سی روایات بھی ہیں جو مکمل طور پر اسی معنی کی تائید کرتی ہیں۔

اُن میں سے ایک روایت جابر بن عبداللہ انصاری سے اس طرح نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے اُن سے اس آیہ کے بارے میں پوچھا، تو جابر نے اپنی دونوں انگلیوں کے ساتھ اپنے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں نے جو مطلب اپنے اِن دونوں کانوں سے جناب پیغمبرؐ سے سُنا ہے اگر جھوٹ بولوں تو یہ دونوں بہرے ہو جائیں، آپؐ فرماتے تھے :

الورود الدخول، لایبقی برّ ولا فاجر لایدخلھا فیکون علی المؤمنین بردًا وسلامًا کما کانت علی ابراھیم حتّٰی ان للنار — او قال لجھنم — ضجیجًا من بردھا، ثم ننجی اللہ الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیًّا :

ورود یہاں دخول کے معنی میں ہے، کوئی نیکوکار یا بدکار نہیں مگر یہ کہ وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ آگ مومنین کے لیے سرد و سالم ہو جائے گی، جیسا کہ ابراہیم کے لیے ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ "آگ" یا "جہنم" (یہاں خود جابر کو لفظ کے بارے میں تردّد ہوا ہے) سردی کی شدت سے فریاد کرے گی، پھر خدا پرہیزگاروں کو رہائی بخشے گا اور ظالموں کو ذلت کے ساتھ اُسی میں چھوڑ دیگا۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

"تقول النار للمؤمن یوم القیامۃ جز، یا مؤمن! فقد اطفأ نورك لھبی" :

روزِ قیامت آگ مومن سے کہے گی، مجھ سے جلدی گزر جا، کہ تیرے نُور نے میرے شعلے کو بجھا دیا ہے۔[2]

بعض دیگر روایات سے بھی اس معنٰی کی تصدیق ہوتی ہے۔

پُل صراط کے بارے میں جو پُر معنی تعبیر روایات میں بیان کی گئی ہے کہ وہ جہنم کے اُوپر واقع ہے، بال سے زیادہ باریک ہے اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس تفسیر کا ایک دوسرا شاہد اور گواہ ہے۔[3]

رہ گئی یہ بات جو بعض کہتے ہیں کہ سُورۂ انبیاء کی آیہ ۱۰۱ پہلی تفسیر پر دلالت کرتی ہے۔ آیت یہ ہے :

أولٰئك عنھا مبعدون

وہ (مومنین) جہنم کی آگ سے دُور ہوں گے۔

یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ آیت تو مومنین کی دائمی جگہ اور ابدی مقام کے بارے میں بیان کر رہی ہے، یہاں تک کہ ہم اس سے بعد والی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ :

لا یسمعون حسیسھا

---

۱، ۲ نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۵۲ - ۳۵۳
۳ تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۵۷۲ - آیہ "ان ربك لبا لمرصاد" (فجر - ۱۴) کے ذیل میں۔



Marfat.com

مومنین آگ کے شعلوں کی آواز تک بھی نہیں سنیں گے۔

اگر زیرِ بحث آیت میں "ورود" نزدیک ہونے کے معنی میں ہو تو نہ لفظ مبعدون کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی "لا یسمعون حسیسها" کے جملہ کے ساتھ۔

٭ ٭ ٭

## ایک سوال کا جواب

صرف ایک سوال جو یہاں باقی رہ جاتا ہے یہ ہے کہ پروردگار کی حکمت کے لحاظ سے اس کام کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے علاوہ کیا مومنین کو اس کام سے کوئی تکلیف اور عذاب نہیں پہنچے گا؟

اس سوال کا جواب جو دونوں پہلوؤں سے اسلامی روایات میں آیا ہے، معمولی سے غور کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں دوزخ اور اس کے عذابوں کا مشاہدہ اس بات کے لیے ایک مقدمہ ہو گا کہ مومنین جنت کی خداداد نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کریں کیونکہ "عافیت کی قدر اسی کو ہوتی ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو"۔ (وبا لاضداد تعرف الاشیاء) یہاں مومنین مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ صرف مصیبت کا منظر دیکھیں گے اور جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا روایات میں پڑھا ہے، آگ اُن پر سرد و سالم ہو جائے گی اور ان کا نور آگ کے شعلوں پر غالب آ جائے اور ان کو ماند کر دے گا۔

اس کے علاوہ وہ آگ سے اتنی تیزی کے ساتھ گزریں گے کہ ان پر معمولی سا اثر بھی نہ ہو گا، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

یرد الناس النار ثم یصدرون باعمالهم فاولهم کلمع البرق ثم کمر الریح، ثم کحضر الفرس، ثم کالراکب، ثم کشد الرجل، ثم کمشیه:

"سب کے سب لوگ جہنم کی آگ میں جائیں گے، اس کے بعد اپنے اعمال کے مطابق اس سے باہر نکلیں گے۔ بعض بجلی کے کوندنے (چمکنے) کی طرح ان کے بعد اُن سے کم درجے والے تیز آندھی کی طرح، بعض گھوڑے کے تیز دوڑنے کی طرح، بعض معمولی سوار کی طرح، بعض تیز رو پیدل چلنے والے کی طرح، اور بعض معمولی رفتار سے چلنے والوں کی طرح۔"[1]

علاوہ ازیں دوزخی بھی اس منظر کے مشاہدہ سے کہ بہشتی اتنی تیزی کے ساتھ گزر رہے ہیں اور وہ اسی میں رہیں گے مزید سزا اور تکلیف محسوس کریں گے اور اس طرح سے دونوں سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۷۳۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۳۔



Marfat.com

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا ○

۷۴۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ○

۷۵۔ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ
حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ
فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ○

۷۶۔ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ○

## ترجمہ

۷۳۔ اور جس وقت ہماری واضح آیات اُنہیں سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہتر ہے اور کس کی محبت و مشاورت کی محفلوں کی سج دھج بہتر ہے اور کس کی سخاوت بڑھ کر ہے۔

۷۴۔ ہم نے اُن سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کیا ہے کہ جن کا مال و ثروت بھی ان سے زیادہ تھا اور ظاہری سج دھج میں بھی جو ان سے زیادہ تھے۔

۷۵۔ تم کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں ہے خدا اُسے اس وقت تک مہلت دیتا ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی آنکھ سے خود دیکھ لے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ ہے اسی دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب۔ وہ ایسا دن ہو گا کہ جب وہ یہ جان لیں گے کہ کس شخص کا مقام زیادہ بُرا ہے اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے؟

۷۶۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی، خداوند تعالیٰ ان کی ہدایت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ وہ آثار و اعمال صالح جو (انسان سے) باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا ثواب اچھا اور انجام زیادہ قدر و قیمت والا ہے۔

## تفسیر

گزشتہ آیات میں بے ایمان ظالموں کے بارے میں بحث تھی۔ زیر بحث آیات میں ان کی منطق اور انجام کے ایک گوشہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔



Marfat.com

ہم جانتے ہیں کہ وہ پہلا گروہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا تھا، ایسے پاک دل مستضعفین کا تھا جن کا ہاتھ دنیا کے مال و منال سے خالی تھا۔ وہی مظلوم و محروم لوگوں کا گروہ جن کی ظالموں اور ستمگروں کے ہاتھوں سے نجات کی خاطر ادیان الٰہی آئے۔ بلند ہمت اور صاحبان ایمان مرد اور عورتیں جیسے بلال، سلمان، عمار، خباب، سمیہ وغیرہ۔

چونکہ اُس زمانے کے جاہلانہ معاشرے میں ــــ ہر دوسرے جاہلانہ معاشرے کی طرح ــــ قدر و قیمت کا معیار وہی زر و زیور، دولت و ثروت، مقام و منصب اور ظاہری ہیئت تھی لہٰذا نضر بن حارث اور اُسی جیسے ستمگار ثروت مند لوگ غریب و فقیر مومنین پر فخر و ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ہماری حیثیت اور شخصیت کی نشانی تو ہمارے ساتھ موجود ہے اور تمہاری کوئی حیثیت و شخصیت نہ ہونے کی نشانی وہی تمہارا فقر و فاقہ اور تمہاری محرومیت ہے۔

وہ کہتے تھے کہ یہی بات خود ہماری حقانیت اور تمہارے حق پر نہ ہونے کی دلیل ہے۔

جیسا کہ قرآن پہلی زیر بحث آیت میں کہتا ہے: جس وقت ہماری واضح آیات اُنہیں سنائی جاتی ہیں تو مغرور و ستمگر کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں (ہم اور تم) میں سے کونسا گروہ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہتر ہے، اور کس کی مجلت و مشاورت کی محفلیں سج دھج میں بہتر ہیں اور کس کی سخاوت زیادہ ہے: (واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بیّنات قال الذین کفروا للذین اٰمنوا ای الفریقین خیر مقامًا واحسن ندیًّا)۔

خصوصاً اسلامی روایات میں منقول ہے کہ یہ سرمایہ دار نہایت خوبصورت لباس پہن کر اور خُوب سج دھج کر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے آگے چلتے تھے اور حقارت اور تمسخر آمیز نگاہ سے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔

جی ہاں! ہر زمانے میں اس طبقے کا یہی چلن رہا ہے۔

"ندی" اصل میں "ندی" بمعنی رطوبت سے لیا گیا ہے اور بعد ازاں فصیح اور سخنور لوگوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

کیونکہ کلام کرنے کے لیے لعاب دہن کا کافی مقدار میں ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا "ندا" آپس میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جس محفل میں کچھ لوگ باہمی مجلت کے طور پر جمع ہوں یا مشاورت کے لیے مل بیٹھیں اسے "نادی" کہا جانے لگا۔

مکہ میں ایک جگہ تھی جہاں سرداران مکہ جمع ہوتے تھے اور مشورے کرتے تھے اسے "دارالندوہ" کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی اسی مفہوم میں لیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر کبھی سخاوت و بخشش کو "ندی" سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

مذکورہ بالا آیت ممکن ہے کہ ان سب کی طرف اشارہ ہو یعنی ہماری گرم جوشی کی محفل میں تمہاری نسبت زیادہ دلکشی ہے، اور ہماری دولت و ثروت، شان و شوکت اور ہمارے لباس تم سے زیادہ جاذب نظر ہیں اور ہماری گفتگو اور فصیح و بلیغ اشعار تم سے کہیں بہتر ہیں۔

٭ ٭ ٭

لیکن قرآن انہیں ایک بہت مدلل، قاطع اور خاموش کر دینے والا جواب دیتا ہے: گویا انہوں نے بشر کی گزشتہ تاریخ کو بھلا دیا ہے

[1] مفردات راغب مادہ "ندی"۔



Marfat.com

" اُن سے پہلے بے شمار قومیں ایسی تھیں کہ جن کا مال و دولت اور وسائل زندگی ان سے بہتر تھے اور وہ لوگ ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے بھی ان سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھے لیکن ہم نے ان ستم کاروں اور ظالموں کو نابود کر دیا " (وَکَمْ اَھْلَکْنَا قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْنٍ ھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْیًا)[1]

کیا ان کا مال و دولت، ان کی زرق برق مخملیں، ان کے فاخرہ لباس اور خوبصورت چہرے اُن سے خدا کے عذاب کو روک سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں بارگاہِ خدا میں ان کی حیثیت اور مقام کی دلیل تھیں تو پھر وہ ایسے بُرے انجام سے کیوں دوچار ہوئے۔ دنیا کی شان و شوکت ایسی ناپائیدار ہے کہ ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے نہ صرف اس کا دفتر الٹ جاتا ہے بلکہ کبھی اس کا طومار ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔

" قرن " جیسا کہ ہم نے پہلے بھی (تفسیر نمونہ، جلد پنجم، ص ۱۳۹ (اُردو ترجمہ) پر) بیان کیا ہے، عام طور پر ایک طولانی زمانہ کے معنی میں ہے۔ لیکن چونکہ " اقتران " کے مادہ سے (نزدیکی کے معنی میں) لیا گیا ہے، لہذا ایسی قوم و جمعیت جو ایک ہی زمانہ میں جمع ہو، کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد قرآن انہیں ایک اور تنبیہ کرتا ہے کہ تم اُن سے یہ کہہ دو کہ اے بے ایمان ظالمو! تم یہ گمان نہ کر لینا کہ یہ تمہارا مال و دولت مایۂ رحمت ہے۔ بلکہ اکثر اوقات یہ عذاب الٰہی کی دلیل ہوتا ہے۔ " جو شخص گمراہی میں مبتلا ہے اور اسی راستے پر چلتے رہنے پر مُصر ہے، خدا اسے مہلت دیتا ہے اور یہ خوشحال زندگی اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے " (قُلْ مَنْ کَانَ فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا)۔

" (یہ مہلت) اُس زمانے تک (ہو گی) کہ یہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کے وعدوں کو دیکھ لیں، اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب " (حَتّٰی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ)۔

" اُس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کی جگہ اور محفل زیادہ بری ہے "۔

اور کس کا لشکر زیادہ کمزور ہے " (فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ ھُوَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا)۔

درحقیقت اس قسم کے منحرف افراد کہ جو پھر ہدایت کے قابل نہیں ہیں، اس بات پر توجہ رکھیں کہ قرآن " مَنْ کَانَ فِی الضَّلٰلَةِ " کہتا ہے جو گمراہی میں استمرار کی طرف اشارہ ہے ــــ اس نقطۂ نظر سے کہ وہ خدا کا دردناک ترین عذاب دیکھیں، بعض اوقات خدا انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے، جو ان کے لیے غرور و غفلت کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور عذاب الٰہی اُن نعمتوں کے سلب ہونے کو اور بھی زیادہ دردناک بنا دیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو بعض قرآنی آیات میں تدریجی سزا کے عنوان سے بیان کی گئی ہے[2]

" فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا " کا جملہ اگرچہ صیغۂ امر کی صورت میں ہے لیکن یہ خبر کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا انہیں مہلت اور پے در پے نعمتیں عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے اسی امر کے معنی میں لیا ہے جو یہاں نفرین کے مفہوم میں ہے یا خدا پر اس قسم کا سلوک کرنے کے لازم ہونے

---

[1] " اثاث " مال و متاع اور زینتِ دنیا کے معنی میں ہے اور " رِءْی " ہیئت و منظر کے معنی میں ہے۔

[2] تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد میں سورۂ " اعراف " کی آیات ۱۸۲، ۱۸۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔



Marfat.com

کے معنی میں ہے ۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

مذکورہ بالا آیت میں "عذاب" کا لفظ اس قرینہ کی بنا پر کروہ "الساعة" کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ عالم دنیا میں خدا کے عذابوں کی طرف اشارہ ہے ۔ ایسے عذاب جیسے طوفانِ نوح ، زلزلہ اور آسمانی پتھر جو قوم لوط پر نازل ہوئے یا ایسے عذاب جو مومنین اور حق کے محوروں میں جہاد کرنے والوں کے ذریعہ ان کے سروں پر نازل ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیہ ۱۴ میں بیان ہوا ہے :

قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم :

اُن سے جنگ کرو کیونکہ خدا تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب کرے گا ۔

"الساعة" یہاں یا تو اختتام دنیا کے معنی میں ہے یا قیامت میں خدائی عذابوں کے معنی میں (دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے)۔

٭　٭　٭

یہ ستمگروں اور دنیا کی شان و شوکت اور لذت کے شیدائیوں کا انجام ہے ۔ لیکن جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی خدا ان کی ہدایت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے (ویزید اللہ الذین اھتدوا ھدًی)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہدایت کے کئی درجے ہوتے ہیں ، جس وقت انسان اُس کے ابتدائی درجوں کو خود سے طے کر لیتا ہے تو خدا اسکی مدد فرماتا ہے اور اسے اعلیٰ سے اعلیٰ درجوں پر فائز کر دیتا ہے اور پھلدار درختوں کی مانند جو ہر روز اپنے ارتقا کا ایک نیا مرحلہ طے کرتے ہیں ، یہ ہدایت پانے والے بھی اپنے ایمان اور اعمال صالح کے مطابق ہر روز ایک اونچے سے اونچے مرحلہ میں قدم رکھتے چلے جاتے ہیں ۔

آیت کے آخر میں اُن لوگوں کو کہ جنہوں نے دنیا میں ناپائیدار زیب و زینت پر بھروسہ کر لیا تھا اور ان کے ذریعہ دوسروں پر فخر کیا کرتے تھے قرآن یہ جواب دیتا ہے : وہ آثار و اعمالِ صالح جو انسان سے باقی رہ جاتے ہیں تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا ثواب بیشتر اور ان کا انجام زیادہ قیمتی ہے (والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا وخیر مردًا)۔[1]

٭　٭　٭

۷۷۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝

۷۸۔ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝

۷۹۔ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝

۸۰۔ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝

۸۱۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝

[1] "مرد" (بروزن نمد) دال کی تشدید کے ساتھ یا تو مصدر ہے رد اور بازگشت کے معنی میں ، یا اسم مکان ہے (مقام بازگشت کے معنی میں کہ جس سے یہاں جنت مقصود ہے ، لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔



Marfat.com

٨٢۔ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

# ترجمہ

٧٧۔ کیا تُو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا کہ جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور یہ کہا کہ مجھے تو بہت سا مال اور اولاد عطا کی جائے گی۔

٧٨۔ کیا وہ غیب کے بھیدوں کو جان گیا ہے یا اُس نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے۔

٧٩۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اُسے عنقریب لکھ لیں گے اور اس پر دائمی عذاب کریں گے۔

٨٠۔ اور (مال و اولاد کے بارے میں) جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُس کے ہم وارث ہو جائیں گے اور وہ تن تنہا ہمارے پاس آئے گا۔

٨١۔ انہوں نے خدا کے سوا کچھ معبود اپنے لیے منتخب کر لیے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا سبب بنیں (کیسی خام خیالی ہے؟)۔

٨٢۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، عنقریب ان کے معبود ان کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے بلکہ وہ ان کے برخلاف قیام کریں گے۔

# تفسیر

## ایک بیہودہ اور انحرافی خیال:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایمان و پاکیزگی اور تقویٰ ان کے لیے مناسب نہیں ہے اور ان کی وجہ سے وہ دنیا سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جب کہ ایمان و تقویٰ کو چھوڑ دینے سے دنیا ان کا رُخ کر لیتی ہے اور وہ مالدار بن جاتے ہیں۔

یہ سوچ خواہ سادہ لوحی اور خرافات کی پیروی کی وجہ سے ہو یا خدائی عہد و پیمان اور ذمہ داریوں سے دُور بھاگنے کے لیے ایک بہانہ ہو، یہ جو کچھ بھی ہو ایک خطرناک طرزِ فکر ہے۔

بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسا گمان کرنے والے بے ایمانوں کی مال و دولت اور کچھ مومنین کے فقر و فاقہ کو اپنی اس بیہودہ سوچ کے لیے ایک دستاویز بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مال جو ظلم و کفر کرنے اور تقویٰ کے اصولوں کو چھوڑنے سے انسان کو ملتا ہے نہ وہ سببِ افتخار ہے اور نہ ہی ایمان و پرہیزگاری مشروع اور مباح کاموں کے راستے میں کسی طرح سے رکاوٹ بنتے ہیں۔

بہرحال ہمارے زمانے کی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی —— کچھ نادان لوگ موجود تھے جو اس قسم کی سوچ رکھتے تھے یا کم از کم اس طرح کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن زیرِ بحث آیات میں —— اس بحث کی مناسبت سے کہ جو کفار اور ظالموں کے انجام کے سلسلے میں اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس طرزِ فکر اور اس کے انجام کے بارے میں بیان کر رہا ہے۔



Marfat.com

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ہماری آیات کو جھٹلاتا ہے ، اور اُن سے کفر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے بہت زیادہ مال و اولاد حاصل ہوگا۔ ( افرأیت الذی کفر بأیاتنا وقال لاوتین مالا و ولدا )[1]

اس کے بعد قرآن انہیں اس طرح جواب دیتا ہے : کیا وہ اسرارِ غیب سے آگاہ ہوگیا ہے یا اُس نے اس بارے میں خدا سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے۔ ( اطلع الغیب ام اتخذ عند الرحمٰن عھدا )۔

اس قسم کی پیشین گوئی تو وہی شخص کرسکتا ہے، اور وہی شخص مال و اولاد کے ہونے کے ساتھ کفر کے کسی رابطہ کا قائل ہوسکتا ہے کہ جو اسرارِ غیب سے آگاہ ہو، کیونکہ ہمیں تو ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔ یا پھر اُس نے خدا سے کوئی عہد و پیمان لیا ہو جبکہ اس قسم کی بات بھی بے معنی ہے۔

اس کے بعد قطعی الفاظ کے ساتھ قرآن مزید کہتا ہے : ایسا نہیں ہے (کفر و بے ایمانی ہرگز کسی کے مال و اولاد میں زیادتی کا سبب نہیں ہوگی) ہم عنقریب جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے لکھ لیں گے۔ ( کلا سنکتب مایقول )۔

ہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ بے بنیاد باتیں بعض سادہ لوح افراد کے انحراف کا سبب بن جائیں ، یہ سب باتیں ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

اور اس پر ہم اپنے عذاب کو دائمی بنا دیں گے (پے در پے اور یکے بعد دیگرے عذاب) ( ونمد له من العذاب مدا )۔

ممکن ہے یہ جملہ آخرت کے دائمی و دوامی عذاب کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن عذابوں کی طرف اشارہ ہو جو اسی دنیا میں اس کے کفر و بے ایمانی کی وجہ سے دامن گیر ہوں گے۔ یہ احتمال بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ یہی مال و اولاد جو غرور و گمراہی کا سبب بنے ہوئے ہیں خود اس کے لیے ایک دائمی عذاب بن جائیں گے۔

※ ※ ※

( مال و اولاد کے بارے میں) وہ جس چیز کا ذکر کررہا ہے اس کے تو ہم وارث بن جائیں گے اور قیامت کے دن وہ یکہ و تنہا ہمارے پاس آئے گا۔ ( ونرثه مایقول ویأتینا فردا )۔

ہاں انجام کار یہ ہے کہ وہ ان تمام مادی وسائل کو یہیں چھوڑ کر چلتا بنے گا اور پروردگار کی داد گاہِ عدل میں خالی ہاتھ حاضر ہوگا۔ اس وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس کا نامۂ اعمال گناہوں سے سیاہ اور نیکیوں سے خالی ہوگا۔ وہاں پر وہ دنیا میں اپنی ان بے بنیاد کہی ہوئی باتوں کا نتیجہ

---

[1] بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کی ایک شانِ نزول بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مومن نے جس کا نام "خباب" تھا ایک مشرک سے جس کا نام "عاص بن وائل" تھا اسے اپنا دیا ہوا قرضہ واپس لینا تھا۔ مقروض نے استہزا کے طور پر اُس سے کہا : دوسرے جہان میں جب میں مال و اولاد پیدا کروں گا تو تیرا قرض ادا کروں گا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ شانِ نزول زیرِ بحث آیت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ خاص طور پر جبکہ اولاد کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ دارِ آخرت میں اولاد نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جس مال کا وہ ذکر کرتا ہے اس کے تو ہم وارث ہو جائیں گے ، اس تعبیر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد دُنیا کے اموال ہیں نہ کہ آخرت کے۔ بہرحال مفسرین کی ایک جماعت نے اس شانِ نزول کی بناء پر آیت کو آخرت کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن حق وہی ہے کہ جو بیان کیا جا چکا ہے۔



Marfat.com

دیکھ لے گا۔

بعد والی آیت میں ان کی بُت پرستی کے ایک اور سبب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے : اُنہوں نے خدا کے سوا کچھ اور معبود اپنے لیے بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کی عزّت کا سبب بنیں (واتخذوا من دون اللّٰہ اٰلھۃ لیکونوا لھم عزًّا)۔

تاکہ وہ خدا کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں، اور مشکلات میں ان کی مدد کریں لیکن یہ کتنی ناسمجھی اور خام خیالی کی بات ہے ؛ جیسا کہ انہوں نے سمجھا ہے ہرگز ایسا نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ بُت ان کے لیے باعثِ عزّت نہیں ہوں گے بلکہ وہ تو ذلّت اور عذاب کا سرچشمہ ہیں۔ اسی وجہ سے " جلد ہی یعنی قیامت کے دن یہ معبود ان عبادت کرنے والوں کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے اور اُن سے اعلانِ بیزاری کریں گے، بلکہ ان کے خلاف ہو جائیں گے "۔ (کلا سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدًّا)۔

یہ جملہ بھی اُسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو سورہ فاطر کی آیہ ۱۴ میں بیان ہوا ہے :

والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ان تدعوھم
لا یسمعوا دعائکم ۔۔۔ ۔۔ ویوم القیامۃ یکفرون بشرککم

جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ کسی حقیر سی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سُنتے۔ اور وہ روزِ قیامت تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

نیز سُورہ احقاف کی آیہ ۶ میں ہے :

واذا حشر النّاس کانوا لھم اعداءً

جس وقت لوگ زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے تو یہ معبُود ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جبکہ پردے ہٹ جائیں گے اور تمام حقائق آشکار ہو جائیں گے اور بُتوں کی عبادت کرنے والے خود کو رسوا اور ذلیل دیکھیں گے تو وہ بتوں کی عبادت کرنے کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف باتیں کریں گے جیسا کہ آیہ ۲۳ سُورہ انعام میں بیان ہوا ہے کہ بُت پرست قیامت میں کہیں گے :

واللّٰہ ربنا ما کنا مشرکین

اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے۔ ہم ہرگز مشرک نہیں تھے۔

لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے، چونکہ بُتوں کی عبادت کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معبود ان کے لیے باعثِ عزّت ہوں لیکن آخرکار وہی ان کے خلاف ہو جائیں گے۔

البتہ وہ معبود کہ جو فرشتوں، شیطانوں اور جنوں کی مانند عقل و شعور رکھنے والے ہیں ان کی وضع تو ظاہر و روشن ہے لیکن ایسے معبود کہ جو بے جان ہیں، ممکن ہے کہ اس دن حکمِ خدا سے باتیں کرنے لگیں اور اپنی عبادت کرنے والوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کریں۔

وہ حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ امامؑ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یکون ھؤلاء الذین اتخذوھم اٰلھۃ من دون اللّٰہ ضدًّا یوم القیامۃ
ویتبرئون منھم ومن عبادتھم الی یوم القیامۃ :



Marfat.com

قیامت کے دن وہ معبود کہ جو خدا کے علاوہ انہوں نے بنا رکھے تھے وہ ان کے خلاف ہوجائیں گے اور اُن سے اور ان کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کریں گے ۔

جاذبِ توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں عبادت کی حقیقت کے بارے میں ایک مختصر اور جامع و پُرمعنی جملہ منقول ہے :

لیس العبادة هی السجود ولا الرکوع ، وانما هی طاعة الرجال، من اطاع مخلوقاً فی معصیة الخالق فقد عبده :

"عبادت صرف سجدے اور رکوع کا ہی نام نہیں ہے ، بلکہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کی اطاعت کرنے لگے ، جو شخص خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت کرے تو یہ اُس نے اس کی پرستش و عبادت کی ہے اور اس کا انجام بھی وہی مشرکین اور بُت پرستوں کے انجام جیسا ہوگا"۔ [1]

٭ ٭ ٭

۸۳۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝

۸۴۔ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝

۸۵۔ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝

۸۶۔ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝

۸۷۔ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝

٭ ٭ ٭

## ترجمہ

۸۳۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں شدّت کے ساتھ تحریک کریں ۔

۸۴۔ اس لیے تُو ان کے بارے میں جلدی نہ کر ہم انہیں (اور ان کے اعمال کو) بڑی باریک بینی کے ساتھ شمار کریں گے ۔

۸۵۔ جس دن ہم پرہیزگاروں کو خدائے رحمٰن (اور ان کی جزا) کی طرف رہنمائی کریں گے ۔

۸۶۔ اور مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جو پانی کے گھاٹ کی طرف جاتے ہیں) جہنم کی طرف ہانکیں گے ۔

۸۷۔ انہیں ہرگز شفاعت کا اختیار نہیں ہے ۔ سوائے اس شخص کے کہ جو خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عہد و پیمان رکھتا ہے ۔

---

[1] نور الثقلین ، ج ۲ ، ص ۳۵۷ -



Marfat.com

# تفسیر

## شفاعت کیسے لوگ کر سکتے ہیں؟

اس بحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو گزشتہ آیات میں مشرکین کے بارے میں بیان ہوئی ہے، زیر بحث آیات درحقیقت ان کے انحراف کے بعض علل و اسباب اور پھر ان کی بدبختی اور بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اس حقیقت کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ دوسرے معبود نہ صرف ان کی عزت و وقار کا باعث نہیں تھے بلکہ وہ تو ان کی بدبختی اور ذلت کا سبب بن گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا تاکہ وہ اُنہیں غلط راستوں پر جن پر وہ چل رہے ہیں تیز کر دیں بلکہ تہ و بالا کر دیں (الم تر انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزھم ازًا)۔

"از" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے۔ اصل میں دیگ میں اُبال آنے اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُبال کی شدت کے وقت اُس کے زیر و زبر ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین ان پر اس طرح سے مسلط ہو جائیں گے کہ جس راستے پر وہ چاہیں گے انہیں چلا لیں گے اور جس شکل میں چاہیں گے انہیں متحرک کر دیں گے اور انہیں تہ و بالا کر دیں گے۔

یہ بات واضح ہے ـــ اور ہم نے بارہا کہا ہے ـــ کہ شیاطین کا انسانوں پر مسلّط ہونا جبری اور بے خبری کا تسلّط نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسان ہی ہے کہ جو شیاطین کو اپنے قلب و رُوح کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے، ان کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے اور ان کی اطاعت کو قبول کرتا ہے جیسا کہ قرآن سورۂ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں کہتا ہے:

انما سلطانه علی الذین یتولونه والذین ھم به مشرکون

شیطان کا تسلط صرف ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو اس کی ولایت و حکومت کو قبول کرتے ہیں اور جو اُسے اپنا بُت اور معبُود بناتے ہیں۔

* * *

اس کے بعد روئے سُخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے بارے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہم ان کے تمام اعمال کو انتہائی باریکی کے ساتھ شمار کر لیں گے (فلا تعجل علیھم انما نعد لھم عدًا)۔

اور اُن سب کو اس دن کے لیے کہ جس دن عدلِ الٰہی کی دادگاہ قائم ہوگی، ثبت اور محفوظ کر لیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کی زندگی کے دنوں کو شمار کرنا، بلکہ ان کے سانسوں کو گننا ہو، یعنی ان کی بقا کی مدّت مختصر ہے اور گننے اور شمار کرنے میں آجاتی ہے کیونکہ کسی چیز کا معدود اور گنا ہوا ہونا عام طور پر اس کے تھوڑے اور مختصر ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ایک روایت میں "(انما نعد لھم عدًا) کی تفسیر کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے سوال کیا:



Marfat.com

تیری نظر میں اس آیت میں پروردگار کی مراد کس چیز کو شمار کرنا ہے"؟

اس نے جواب میں عرض کیا : "دنوں کی تعداد"

امامؑ نے فرمایا :

"اولاد کی عمر کے دنوں کا حساب تو ماں باپ بھی رکھتے ہیں۔ ولکنه عدد الانفاس
اس کے شمار کرنے سے مراد سانسوں کی گنتی ہے" [1]

امام کی یہ تعبیر ممکن ہے کہ پہلی یا دوسری یا دونوں تفسیروں کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال اس آیت میں بیان کردہ مطالب میں غور و خوض انسان کو ہلا کے رکھ دیتا ہے کیونکہ یہ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ ہماری ہر چیز یہاں تک کہ ہماری سانسیں بھی حساب شدہ اور گنی ہوئی ہیں اور ایک دن ہمیں ان سب کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد "متقین" اور "مجرمین" کی آخری منزل کو مختصر اور فصیح عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے : "ہم نے ان تمام اعمال کو اس دن کے لیے ذخیرہ کر لیا ہے جس دن ہم پرہیزگاروں کو عزت و احترام کے ساتھ خداوند رحمان کی طرف یعنی جنت اور اس کے انعامات کی طرف اجتماعی طور پر رہنمائی کریں گے۔ (یوم نحشر المتقین الی الرحمٰن وفداً)

"وفد" بروزن "وعد" اصل میں ایسے گروہ یا ہیئت کو کہتے ہیں جو اپنی مشکلات کے حل کے لیے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے نزدیک مکرم و محترم قرار پاتے ہیں۔ اس بنا پر یہ لفظ ضمنی طور پر احترام کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ پرہیزگار سواریوں پر سوار ہوں گے اور بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں، کہ علی علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت "یوم نحشر المتقین الی الرحمٰن وفدا" کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا :

"یا علی الوفد لایکون الا رکبانا اولئك رجال اتقوا الله عز وجل فاحبهم واختصهم و رضی اعمالهم فسماهم متقین"

"اے علی! "وفد" مسلمہ طور پر ایسے افراد کو کہتے ہیں کہ جو سواریوں پر سوار ہوں۔ وہ ایسے افراد ہیں کہ جنہوں نے تقویٰ کو اختیار کیا ہے، خدا نے انہیں دوست بنایا ہے اور انہیں اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے اور ان کے اعمال سے راضی ہو کر انہیں متقین کا نام دیا ہے" [2]

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ :

ہم پرہیزگاروں کو خدائے رحمٰن کی طرف لے جائیں گے، جب کہ بعد والی آیت میں مجرموں کو جہنم کی طرف ہانکنے کی بات ہے۔ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں تھا کہ رحمان کے بجائے یہاں جنت کہا جاتا۔ لیکن یہ تعبیر حقیقت میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پرہیزگار وہاں جنت

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۷۔

[2] نور الثقلین، ج ۳، ص ۳۵۹۔



Marfat.com

سے بھی زیادہ بلند مقام پر فائز ہوں گے، وہ قربِ خدا کے مقام اور اس کے خاص جلوؤں کے نزدیک ہوں گے اور خدا کی رضا جو بہشت سے بھی بہت بڑھ کر ہے حاصل کرلیں گے۔ (وہ تعبیریں جو اُوپر بیان کردہ حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں)۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں "ہم مجرموں کو اس حالت میں کہ وہ پیاسے ہوں گے جہنم کی طرف ہانکیں گے" (ونسوق المجرمین الٰی جھنّم وردًا)۔

جیسا کہ پیاسے اُونٹوں کو پانی کی طرف ہانکتے ہیں لیکن یہاں پانی نہیں بلکہ آگ ہوگی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "ورد" انسانوں یا جانوروں کے ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو پانی کے گھاٹ پر آتے ہیں اور چونکہ یہ گروہ یقینی طور پر پیاسا ہوتا ہے لہٰذا مفسرین نے اس تعبیر کو یہاں پیاسوں کے معنی میں لیا ہے۔

کتنا فرق ہے ان لوگوں کے درمیان کہ جنہیں عزت و احترام کے ساتھ خدائے رحمٰن کی طرف لے جایا جائے گا اور فرشتے اُن کے استقبال کے لیے دوڑ رہے ہوں گے اور اُن پر درود و سلام بھیج رہے ہوں گے اور اس گروہ کے درمیان کہ جنہیں تشنہ کام جانوروں کی طرح جہنم کی آگ کی طرف ہانک رہے ہوں گے، جبکہ وہ سر نیچے کیے ہوئے، شرمسار، رسوا اور حقیر ہوں گے۔

اور اگر وہ یہ تصوّر کرتے ہوں کہ وہاں شفاعت کے ذریعے کسی جگہ پہنچ سکتے ہیں، تو انہیں جان لینا چاہیئے کہ "وہ ہرگز وہاں شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے" (لا یملکون الشفاعة)۔

نہ تو کوئی اوران کی شفاعت کرے گا اور نہ وہ بطریقِ اولیٰ اِس بات پر قادر ہوں گے کہ خود کسی دوسرے کی شفاعت کریں۔

صرف اُنہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا کہ جو خدائے رحمٰن کے ہاں کوئی عہد و پیمان رکھتے ہوں گے۔ (الا من اتخذ عند الرحمٰن عھدًا)۔

صرف یہی لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت حاصل ہوسکے گی، یا ان کا مرتبہ و مقام اس سے بھی بالاتر و برتر ہے اور وہ یہ قدرت و اختیار رکھتے ہیں کہ ایسے گنہگاروں کی کہ جو شفاعت کے لائق ہیں شفاعت کریں۔

❁ ❁ ❁

## "عھد" کا معنی کیا ہے؟

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مذکورہ بالا آیت جو یہ کہتی ہے" صرف انہی لوگوں کو شفاعت کا اختیار ہوگا جو خدا کے ہاں کوئی عہد رکھتے ہیں" عہد سے کیا مراد ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: "عہد" سے مراد پروردگار پر ایمان، اس کی وحدانیت و یگانگی کا اقرار اور خدا کے پیغمبروں کی تصدیق ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "عہد" سے مراد حق تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت، اور ایسے لوگوں سے بیزاری ہے کہ جو خدا کے مقابلے میں کسی پناہ گاہ اور قدرت کے قائل ہیں۔ اسی طرح "اللہ" کے سوا کسی اور سے اُمید نہ رکھنا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی کے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:



Marfat.com

من دان بولایۃ امیرالمؤمنین والائمۃ من بعدہ فھوالعھد عنداللہ :

"جو شخص امیرالمومنین اوران کے بعد آئمہ اہل بیت کی ولایت کا عقیدہ رکھتا ہو، یہ خدا کے نزدیک عہد ہے"[1]

ایک اور روایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

من ادخل علی مؤمن سروراً فقد سرنی و من سرنی فقد اتخذ عنداللہ عھداً ۔

جو شخص کسی مومن کو خوش کرے اُس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس کا عہد خدا کے پاس ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

" عہد کی حفاظت پانچوں وقت کی نمازوں کی حفاظت ہی ہے"[3]

مختلف اسلامی منابع میں بیان کردہ مذکورہ بالا روایات کے مطالعہ اوران میں غور وخوض کرنے سے اوراسی طرح بزرگ اسلامی مفسرین کے اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا کے نزدیک عہد ـــــ جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے ـــــ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں پروردگار سے ہر قسم کا رابطہ اوراس کی معرفت واطاعت اوراسی طرح اولیائے حق کے مکتب سے وابستگی اور ہر قسم کا عمل صالح جمع ہے۔ اگرچہ ہر روایت میں اس کے ایک حصہ یا ایک واضح و روشن مصداق کی طرف اشارہ ہوا ہے ۔

لہذا ایک اور حدیث میں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصیت کرنے کی کیفیت کے بیان میں نقل ہوئی ہے تقریباً تمام اعتقادی مسائل جمع ہیں۔ اس میں آپ فرماتے ہیں :

"مسلمان کو چاہیئے کہ موت سے پہلے اس طرح وصیت کرے اور کہے":

پروردگارا ! تو ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، تو رحمان ورحیم ہے۔ میں اس دنیا میں تجھ سے عہد کرتا ہوں، اور گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، تو واحد و یکتا ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے، محمدؐ تیرا بندہ اور تیرا بھیجا ہوا "رسول" ہے۔ بہشت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت اور حساب وکتاب حق ہے، اعمال کی جانچ کے لیے میزان حق ہے، دین اسی طرح ہے جیسا کہ تُو نے بیان کیا ہے اور اسلام وہی ہے جس کی شریعت تُو نے مقرر فرمائی ہے، (حق) بات وہی ہے کہ جو تُو نے کہی ہے، قرآن اسی طرح ہے کہ جیسے تُو نے نازل کیا ہے، تو حق اور آشکار خدا ہے۔ پروردگارا! محمدؐ کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے اور ان پر

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳، ص ۳۶۲۔

[2] المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ درمنثور۔

[3] درالمنثور۔



Marfat.com

اور اُن کی آل پر درود و سلام بھیج۔

پروردگارا! مشکلات میں تُو ہی میرا سرمایہ اور شدائد میں تو ہی میرا یاور و مددگار ہے۔ تو ہی میرا ولی نعمت ہے، تو ہی میرا اور میرے آباؤ اجداد کا معبود ہے، تو ایک چشم زدن کے لیے بھی مجھے میرے حال پر نہ چھوڑ۔ اگر تو مجھے خود میرے حال پر چھوڑ دے گا تو میں بُرائیوں سے نزدیک اور نیکیوں سے دُور ہو جاؤں گا۔ اے میرے خدا! تو ہی قبر میں میرا مونس بن جا اور میرے لیے ایک عہد قرار دے جسے میں قیامت کے دن کھُلا ہوا دیکھوں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ان حقائق کا اعتراف کرنے کے بعد جو کچھ انسان ضروری سمجھے وصیت کرے۔ اس وصیت کی تصدیق سورۂ مریم — کی اس آیت میں ہے:

لا یملکون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمٰن عهدًا

یہ ہے عہد و وصیت ......[1]

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مذکورہ بالا مطالب کو عربی یا فارسی (یا کسی بھی زبان میں) اوراد کی طرح پڑھے یا لکھے بلکہ خلوص دل کے ساتھ ان پر ایمان رکھتا ہو۔ ایسا ایمان کہ جس کے آثار اس کی زندگی کے پورے طرز عمل میں دکھائی دیں۔

❖ ❖ ❖

۸۸۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝

۸۹۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝

۹۰۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝

۹۱۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

۹۲۔ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝

۹۳۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں ہے۔



Marfat.com

۹۴۔ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝

۹۵۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝

## ترجمہ

۸۸۔ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔

۸۹۔ تم نے یہ کیسی بُری اور طعن کی بات کی ہے۔

۹۰۔ قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شدت کے ساتھ گر پڑیں۔

۹۱۔ اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کے لیے بیٹے کا ادعا کیا ہے۔

۹۲۔ اور یہ بات تو ہرگز سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔

۹۳۔ آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں۔

۹۴۔ اس نے ان سب کا احصا کر رکھا ہے اور اچھی طرح سے شمار کیا ہوا ہے۔

۹۵۔ اور وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ وتنہا اس کے پاس حاضر ہوں گے۔

## تفسیر

### خدا اور اولاد کا ہونا؟

چونکہ گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی لہذا بحث کے آخر میں شرک کی ایک شاخ یعنی خدا کی اولاد ہونے کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی قباحت اور بُرائی کو نہایت قاطع انداز میں واضح کیا گیا ہے: انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ (وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدًا)۔

نہ صرف عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حقیقی بیٹے ہیں بلکہ یہودی بھی حضرت عزیر کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے نیز بُت پرست فرشتوں کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے اور انہیں خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے[۱]

اس کے بعد انتہائی سخت لہجے میں فرمایا گیا ہے: تم نے یہ کیسی بُری اور بڑی سخت بات کی ہے۔ (لقد جئتم شیئًا اِدًّا)۔

"اِد" (بروزن "ضد") اصل میں ایسی بُری اور کریہہ آواز کو کہتے ہیں کہ جو شدید صوتی امواج کی گردش کی وجہ سے اُونٹ کے گلے سے نکل کر کان تک پہنچے۔ بعدازاں اس لفظ کا بہت ہی بُرے اور وحشت ناک کاموں پر اطلاق ہونے لگا۔

---

[۱] حضرت عزیر کے بارے میں سورہ توبہ کی آیہ ۳۰ اور فرشتوں کے بارے میں سورہ زخرف کی آیہ ۱۹ میں گفتگو آئی ہے۔



Marfat.com

چونکہ یہ ناروا نسبت اصل توحید کے خلاف ہے، کیونکہ نہ کوئی اس کا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی اُسے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ جسم اور جسمانیت کے عوارض رکھتا ہے۔ گویا تمام عالم ہستی جس کی بنیاد توحید پر قائم ہے اس ناروا نسبت سے وحشت و اضطراب میں ڈوب جائے گا۔

لہذا بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ شدت کے ساتھ گر پڑیں۔ (تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدًا)۔

❖ ❖ ❖

پھر تاکید کے لیے اور موضوع کی اہمیت کے بیان کی خاطر کہتا ہے: "اس لیے کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کے لیے بیٹے کا ادعا کیا ہے۔ (ان دعوا للرحمٰن ولدًا)۔

❖ ❖ ❖

درحقیقت انہوں نے خدا کو کسی طرح سے پہچانا ہی نہیں ورنہ وہ یہ جان لیتے کہ "خدائے رحمٰن کے لیے ہرگز یہ بات سزاوار نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے" (وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدًا)۔

انسان چند چیزوں میں سے کسی ایک کے لیے اولاد کی خواہش کرتا ہے یا تو وہ اس بنا پر کہ اُس کی زندگی ختم ہونے والی ہے لہذا اسے بقاء نسل کے لیے تولید مثل کی ضرورت ہے۔

یا وہ کمک اور یار و مددگار کا طالب ہے کیونکہ اس کی قوت و طاقت محدود ہے یا اُسے تنہائی سے وحشت ہے لہذا اسے کسی مونس کی تلاش ہے۔

لیکن خدا کے بارے میں ان مطالب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نہ تو اس کی قدرت محدود ہے، نہ اس کی زندگی ختم ہونے والی ہے، نہ اس کے وجود میں ضعف و کمزوری کا نام و نشان ہے، نہ تنہائی کا کوئی احساس اور نہ ہی اسے کوئی ضرورت و احتیاج ہے۔

علاوہ ازیں اولاد کا ہونا، جسم ہونے اور بیوی رکھنے کی دلیل ہے اور یہ تمام باتیں اس کی پاک ذات سے بعید ہیں۔

اسی بنا پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اس کے بندے ہیں اور اس کے تابع فرمان ہیں (ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا اٰتی الرحمٰن عبدًا)۔

اور باوجود اس کے کہ تمام بندے اُس کے مطیع اور تابع فرمان ہیں، اُسے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود وہی اس کے نیازمند اور محتاج ہیں۔

❖ ❖ ❖

وہ ان سب پر محیط ہے اور ان کی تعداد کو پوری طرح سے جانتا ہے (لقد احصاھم وعدھم عدًا)۔

یعنی اس بات کا ہرگز تصور نہ کرنا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنے بندوں کا اس نے حساب رکھا ہو گا۔ اس کا علم اس قدر وسیع و عریض ہے کہ نہ صرف وہ ان کے اعداد و شمار جانتا ہے بلکہ ان کی تمام خصوصیات سے بھی آگاہ ہے۔ نہ تو وہ اس کی حکومت کی حدود سے بھاگ کر باہر نکل سکتے ہیں، اور نہ ہی ان کے اعمال میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی ہوئی ہے۔



Marfat.com

"وہ سب کے سب قیامت کے دن یکہ وتنہا اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے"۔ (وکلھم اٰتیه یوم القیامة فردًا)۔
اس بناء پر مسیحؑ بھی، عزیر بھی، فرشتے بھی اور تمام کے تمام انسان بھی اس کے اس ہمہ گیر حکم میں شامل ہیں۔ اس حالت میں یہ بات کس قدر نامناسب ہے کہ ہم اس کے لیے اولاد کا عقیدہ رکھ کر اور اس کی ذاتِ پاک کو عظمت کی بلندیوں سے اس قدر نیچے لے آئیں اور اس کے صفات جلال و جمال کا انکار کر دیں۔[1]

## چند اہم نکات :

۱۔ **اَب بھی اُسے خُدا کا بیٹا خیال کرتے ہیں :** مذکورہ بالا آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قاطع ترین الفاظ میں خدا کی اولاد ہونے کی نفی کرتا ہے۔ یہ وہ آیات ہیں جو چودہ سو سال پہلے کا واقعہ بیان کر رہی ہیں جبکہ آج کے زمانے میں اور علم و دانش کی دنیا میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ مجازی بیٹا نہیں بلکہ حقیقی بیٹا اور اگر ان کی کچھ تحریروں میں جو تبلیغی مقصد سے لکھی گئی ہیں اور اسلامی علاقوں کے لیے خاص طور پر ترتیب دی گئی ہیں، اس بیٹے کو اعزازی یا مجازی بیٹا کہا گیا ہے ۔ تو وہ ان کی کتب اعتقادی کے اصلی متون سے کسی طرح بھی موافق نہیں ہے۔

یہ معاملہ مسیحؑ کے خدا کا بیٹا ہونے تک منحصر نہیں ہے بلکہ وہ تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو مسلمہ طور پر تین خداؤں کے معنی میں ہے اور ان کے حتمی و یقینی عقائد میں سے ہے، مسلمان چونکہ اس قسم کی شرک آمیز بات سُننے سے وحشت کرتے ہیں ۔ لہٰذا انہوں نے اسلامی علاقوں میں اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کر دیا ہے اور اسے تشبیہ اور مجاز کی قسم قرار دیتے ہیں ۔ (مزید وضاحت کے لیے قاموس کتاب مقدس کی طرف "مسیح" اور "تین اقانیم" کے بارے میں رجوع کریں)۔

٭ ٭ ٭

۲۔ **آسمان پھٹ کر ریزہ ریزہ کیسے ہوں گے ؟** مذکورہ بالا آیت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ "قریب ہے کہ آسمان اس ناروا نسبت سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں" اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید کی تعبیرات کے مطابق، عالم ہستی کا مجموعہ ایک قسم کی حیات اور عقل و شعور رکھتا ہے اور کئی ایک آیات کے مطابق خدا تعالیٰ کی شانِ اقدس کی طرف یہ ناروا نسبت دینے سے پورا عالم سخت وحشت میں پڑ جاتا ہے ۔ جیسے سورہ بقرہ کی آیہ ۷۴ میں ہے :

وان منها لما یهبط من خشیة الله

بعض پتھر خوفِ خدا سے پہاڑوں سے گر پڑتے ہیں ۔

اور جیسے سورہ حشر کی آیہ ۲۱ میں ہے :

"لو انزلنا هذا القراٰن علیٰ جبل لرأیته خاشعًا متصدعًا من خشیة الله"

---

[1] خدا سے بیٹے کی نفی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۶ کے ذیل میں اور آٹھویں جلد سورہ یونس آیہ ۶۸ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔



Marfat.com

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو وہ خدا کے خوف سے پھٹ پڑتے ___

یا پھر یہ اس بات کی انتہائی زیادہ قباحت اور بُرائی کی طرف اشارہ ہے ۔ عربی اور فارسی زبان میں ایسی مثالیں عام ملتی ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں تو نے ایسا کام کیا ہے کہ گویا آسمانوں اور زمین کو میرے سر پہ گرا دیا ہے ۔

انشاءاللہ ہم اس بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں پھر بھی بحث کریں گے ۔

۹۶۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○

۹۷۔ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ○

۹۸۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۶

## ترجمہ

۹۶۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے خدائے رحمٰن ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا ۔

۹۷۔ ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو پرہیزگاروں کو بشارت دے اور سخت قسم کے دشمنوں کو ڈرائے ۔

۹۸۔ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی (بے ایمان اور گنہگار) قوموں کو ہلاک کیا ہے ۔ کیا تم اُن میں سے کسی کو بھی دیکھتے ہو یا ان کی خفیف سی آواز بھی سُنتے ہو؟

## تفسیر

### ایمان محبوبیت کا سرچشمہ ہے :

مذکورہ بالا تین آیات میں جو سورۂ مریم کی آخری آیات ہیں پھر اہل ایمان، مومنین اور بے ایمان ستمگروں کی بات ہو رہی ہے اور قرآن اور اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں سے متعلق گفتگو ہے ۔ درحقیقت یہ پہلی بحثوں کا تازہ نکات کے ساتھ ایک نچوڑ ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیتے ۔ خداوند رحمان ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا (ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا)۔

بعض مفسرین اس آیت کو امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور بعض اسے تمام مومنین کے لیے عام کہتے ہیں ۔



Marfat.com

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے گا اور یہ محبت ان کے لیے ایک ایسی ڈوری بن جائے گی جو انہیں ایمان کی طرف کھینچ لائے گی۔

بعض نے اسے مومنین کی ایک دوسرے سے محبت کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو قدرت و قوت اور اتحاد کا سبب ہوگی۔

بعض نے اس سے آخرت میں مومنین کی ایک دوسرے سے دوستی کی طرف اشارہ خیال کیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا آپس میں اتنا تعلق ہوجائے گا کہ وہ ایک دوسرے کا دیدار کرکے انتہائی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔

لیکن اگر ہم وسعت نظر کے ساتھ آیت کے وسیع مفاہیم پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ آیت کے مفہوم میں یہ تمام تفسیریں جمع ہیں اور ان میں آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

اس کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ "ایمان اور عمل صالح" ایک غیر معمولی قوت جذب وکشش رکھتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور انبیاء کی دعوت پر ایمان واعتقاد کی چمک انسان کے قلب وروح، فکر ونظر اور گفتار وکردار میں اعلیٰ انسانی اخلاق، تقویٰ، پاکیزگی، سچائی، امانت، شجاعت، ایثار ودرگزر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور عظیم مقناطیسی قوتوں کی مانند اپنی طرف کھینچنے والی ہے۔

یہاں تک کہ ناپاک اور گناہ سے آلودہ لوگ بھی پاک لوگوں سے خوش رہتے ہیں اور اپنے ہی جیسے ناپاک لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر مثال کے طور پر جب بیوی یا شوہر یا کسی شریک کار کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو تاکید کرتے ہیں کہ وہ پاک ونجیب، امین اور اچھے کردار کا ہو۔

یہ فطری بات ہے، اور حقیقت میں یہ پہلی جزا ہے کہ جو خدا مومنین اور صالحین کو دیتا ہے، کہ جس کا دامن دنیا سے لے کر آخری جہان تک کھنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس قسم کے پاک لوگ جب دنیا سے آنکھ بند کرتے ہیں تو بہت سی آنکھیں ان کے لیے رو رہی ہوتی ہیں چاہے وہ ظاہری طور پر کم حیثیت دکھائی دیتے ہوں اور کوئی اجتماعی مقام ومنزلت نہ رکھتے ہوں۔ تمام لوگ ان کا خلا محسوس کرتے ہیں اور سب لوگ اپنے آپ کو ان کے سوگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ بعض اس آیت کو امیرالمومنین علی علیہ السلام کے بارے میں سمجھتے ہیں اور بہت سی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے تو بلا شک وشبہ اس کا اعلیٰ درجہ اور بلند ترین مقام اس امام متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ (چند اہم نکات کے ذیل میں ہم ان روایات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے) لیکن یہ امر اس بات سے مانع نہیں ہوگا کہ دوسرے مرحلوں میں تمام مومنین اور صالحین بھی اس محبت ومحبوبیت کا مزہ چکھیں اور اس مودتِ الٰہی سے کچھ حصہ حاصل کریں۔ اور یہ امر اس میں بھی مانع نہیں ہوگا کہ دشمن بھی اپنے دلوں میں ان کے لیے محبت واحترام محسوس کریں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:-

ان اللّٰہ اذا احب عبدًا دعا جبرئیل، فقال یا جبرئیل انی احب فلانًا فاحبہ، قال فیحبہ جبرئیل ثم ینادی فی اھل السماء ان اللّٰہ یحب فلانًا فاحبوہ، قال فیحبہ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض! وان اللّٰہ اذا ابغض عبدًا دعا جبرئیل، فقال یا جبرئیل انی ابغض



Marfat.com

فلانًا فابغضه ، قال فیبغضه جبرئیل ، ثم ینادی فی اهل السماء ان الله یبغض فلانًا فابغضوه. قال فیبغضه اهل السماء ثم یوضع له البغضاء فی الارض !

" خدا جس وقت اپنے بندوں میں سے کسی سے محبت کرتا ہے تو اپنے عظیم فرشتے جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے دوست رکھ تو جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ پھر وہ آسمانوں میں منادی کرتا ہے کہ اسے اہل آسمان! خداوند عالم فلاں شخص کو پسند کرتا ہے ۔ تم بھی اسے محبوب رکھو تو اس کے بعد تمام اہل آسمان اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اس محبت کی قبولیت کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے ۔ اور جب خدا کسی کو دشمن رکھتا ہے تو وہ جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو جبرئیل اس سے دشمنی رکھتے ہیں پھر وہ اہل آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ خدا فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اُس سے دشمنی رکھو تو تمام اہل آسمان اُس سے متنفر ہو جاتے ہیں اس کے بعد اس تنفر کا عمل زمین پر جاری ہوتا ہے [1]

اس کے بعد قرآن کی طرف کہ جو ایمان اور عمل صالح کی ہدایت کا سرچشمہ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ تو پرہیزگاروں کو اس کے ذریعے بشارت دے اور سخت مزاج اور ہٹ دھرم دشمنوں کو ڈرائے ( فانما یسرناه بلسانك لتبشر به المتقین وتنذر به قومًا لدًا )۔

" لُدّ " ( لام کی پیش اور دال کی شد کے ساتھ ) اَلَدّ کی جمع ہے ( عدد کے وزن پر ) جو ایسے دشمن کے معنی میں ہے جو سخت دشمنی رکھتا ہو اور ایسے اشخاص کے لیے بولا جاتا ہے جو دشمنی کرنے میں متعصب ، ہٹ دھرم اور بے منطق ہوں ۔

❖ ❖ ❖

زیر بحث آخری آیت میں جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی دلجوئی کے لیے ( خصوصاً اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور اُس وقت مسلمان انتہائی سخت دباؤ میں تھے ) اور تمام ہٹ دھرم دشمنوں کو تنبیہ اور تہدید کے لیے قرآن کہتا ہے : ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی بے ایمان اور گنہگار قوموں کو ہلاک و نابود کیا ہے ، وہ اس طرح نابود اور بھولی بسری ہو گئیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔

" اے پیغمبر ! کیا تو اُن میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے یا ان کی کوئی خفیف سی آواز سنتا ہے " ( وکم اهلکنا قبلهم من قرن هل تحس منهم من احد او تسمع لهم رکزًا )۔

" رکز " آہستہ آواز کے معنی میں ہے ۔ اور جن چیزوں کو زمین میں چھپاتے ہیں انہیں " رکاز " کہا جاتا ہے یعنی یہ ستمگر قومیں اور حق حقیقت کے سخت دشمن اس طرح سے درہم برہم ہوئے کہ ان کی خفیف سی آواز تک بھی سنائی نہیں دیتی ۔

❖ ❖ ❖

---

[1] یہ حدیث بہت سے مشہور منابع حدیث اور اس طرح بہت سی کتب تفسیر میں آئی ہے لیکن ہم نے اس متن کا انتخاب کیا ہے کہ جو تفسیر فی ظلال کی پانچویں جلد ص ۴۲۰ میں " احمد " اور " مسلم " اور " بخاری " سے نقل ہوا ہے ۔



Marfat.com

# چند اہم نکات :

۱- مومنوں کے دلوں میں علیؑ کی محبت : شیعہ کتب کے علاوہ اہل سنت کی حدیث و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں متعدد روایات کو جو آیہ : "ان الذین اٰمنوا و عملوا الصلحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا" کی شانِ نزول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں، ان سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ آیت آغاز میں علی علیہ السلام کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے علامہ زمخشری نے کشاف میں، سبط ابن الجوزی نے تذکرہ میں، گنجی شافعی اور قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ میں نیشاپوری نے اپنی مشہور تفسیر میں، ابن صباغ مالکی نے فصول المهمہ میں، سیوطی نے درالمنثور میں، ھیثمی نے صواعق المحرقہ میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔ اُن میں سے کچھ اس طرح ہیں :

۱۔ "ثعلبی" اپنی تفسیر میں "براء بن عازب" سے اس طرح نقل کرتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا :

قل اللهم اجعل لی عندك عهداً ، واجعل لی فی قلوب المؤمنین مودة ، فانزل الله تعالی : ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا

کہو خداوندا ! میرے لیے اپنے ہاں عہد قرار دے اور مومنین کے دلوں میں میری محبت ڈال دے تو اُس وقت آیہ ان الذین اٰمنوا ۔۔۔ نازل ہوئی "[1]

عین یہی عبارت یا تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بہت سی دوسری کتابوں میں آئی ہے۔

۲۔ بہت سی اسلامی کتابوں میں یہی معنی ابن عباس سے نقل ہوا ہے وہ کہتے ہیں :

"نزلت فی علی بن ابی طالب " ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمٰن ودًّا " قال محبة فی قلوب المؤمنین"

یعنی آیہ ان الذین آمنوا ۔۔۔ علی بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کا معنی یہ ہے کہ خدا آپ کی محبت مومنین کے دلوں میں ڈال دے گا۔[2]

۳۔ کتاب "صواعق" میں محمد بن حنفیہ سے اس آیت کی تفسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے :

لا یبقی مؤمن الا وفی قلبه ود لعلی ولاهل بیته :

کوئی مومن ایسا نہ ملے گا کہ جس کے دل میں علی اور ان کے اہل بیت کی محبت نہ ہو۔[3]

۴۔ شاید اسی بناء پر صحیح اور معتبر روایت میں خود امیر المومنین علی علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے :

لو ضربت خیشوم المؤمن بسیفی هذا علی ان یبغضنی ما ابغضنی ولو

---

[1] احقاق الحق ، جلد ۳ ، ص ۸۳ تا ۸۶ بحوالہ تفسیر ثعلبی۔

[2] روح المعانی جلد ۱۶ ، ص ۱۳۰ اور مجمع البیان جلد ۶ ، ص ۵۳۳ اور نہج البلاغہ کلمات قصار ۔ ۴۵ ۔



Marfat.com

صبت الدنیا بجماتها علی المنافق علی ان یحبنی ما احبنی وذالك انه قضی
فانقضی علی لسان النبی الامی انه قال لا یبغضك مؤمن ولا یحبك منافق :

اگر میں اپنی یہ تلوار مومن کی ناک پر ماروں کہ وہ مجھ سے دشمنی رکھے تو وہ ہرگز میرا دشمن نہیں ہوگا اور اگر میں ساری دنیا (اور اس کی نعمتیں) منافق کو دے ڈالوں کہ وہ مجھے دوست رکھے تو بھی وہ مجھے دوست نہیں رکھے گا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قطعی حکم کے ساتھ مجھ سے فرمایا ہے کہ :

اے علیؑ ! کوئی مومن تجھ سے دشمنی نہیں رکھے گا اور کوئی منافق تجھ سے محبت نہ کرے گا۔[1]

۵۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نماز کے آخر میں ایسی بلند آواز کے ساتھ کہ جسے لوگ سنتے تھے، امیرالمومنین علی علیہ السلام کے حق میں اس طرح دعا فرماتے تھے :

اللهم هب لعلی المودة فی صدور المؤمنین والهیبة والعظمة فی صدور المنافقین فانزل الله ان الذین امنوا ...

" خداوندا ! علی کی محبت مومنین کے دلوں میں ڈال دے اور اسی طرح اس کی عظمت و ہیبت منافقین کے دلوں میں بٹھا دے۔ تو اس وقت یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی۔[2]

بہر حال جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں بیان کیا ہے، علی علیہ السلام کے بارے میں اس آیت کا نزول ایک کامل اور اکمل نمونے کے عنوان سے ہے اور یہ تمام مومنین کے لیے، سلسلۂ مراتب کے ساتھ، مفہوم کے اعتبار سے عام ہونے میں مانع نہیں ہوگا۔

۲۔ **"یسّرناه بلسانك" کی تفسیر** : "یسرناہ" "تیسیر" کے مادہ سے "تسہیل" (سہل اور آسان کرنے) کے معنی میں ہے۔ خدا اس جملے میں فرماتا ہے : " ہم نے قرآن کو تیری زبان پر آسان بنا دیا تاکہ تو پرہیزگاروں کو بشارت دے اور سخت قسم کے دشمنوں کو ڈرائے" یہ آسانی ممکن ہے کہ مختلف جہات سے ہو :

۱۔ اس لحاظ سے کہ قرآن فصیح اور رواں عربی زبان میں ہے کہ جس کا لہجہ اور آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے اور زبان کے لیے اس کی تلاوت آسان ہے۔

۲۔ اس لحاظ سے کہ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو آیات قرآن کے بارے میں ایسی لیاقت اور گرفت عطا کی تھی کہ آسانی کے ساتھ ہر جگہ پر ہر مشکل کے حل کے لیے اس سے استفادہ کرتے تھے اور ہمیشہ مومنین کے سامنے اس کی تلاوت کرتے تھے۔

۳۔ مطالب و معانی کے لحاظ سے جو انتہائی گہرے اور پُرمایہ ہیں وہ سمجھنے میں سہل، سادہ اور آسان ہیں۔ اصولی طور پر وہ تمام کے تمام عظیم اور اعلیٰ حقائق جو معانی کو سمجھنے کی سہولت کے ساتھ ان محدود الفاظ کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں خود اس بات کی نشانی ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوا ہے اور جو امدادِ الٰہی کے زیر اثر صورت پذیر ہوا ہے۔

---

[1] روح المعانی جلد ١٦، ص ١٣٠ اور مجمع البیان، جلد ٦، ص ٥٢٣ اور نہج البلاغہ کلمات قصار - ٤٥

[2] نورالثقلین، جلد ٣، ص ٣٦٢



Marfat.com

سورہ قمر میں متعدد آیات میں یہ جُملہ دُہرایا گیا ہے :

ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدّکر

ہم نے قرآن کو تذکر اور یاد دہانی کے لیے آسان کیا ہے، تو کیا کوئی پند و نصیحت لینے والا ہے؟

٭ ٭ ٭

پروردگارا ! ہمارے دل کو نُورِ ایمان کے ساتھ اور ہمارے تمام وجود کو عملِ صالح کے نُور کے ساتھ روشن کردے۔ ہمیں مومنین و صالحین خصوصاً امام المتقین امیرالمومنین علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے قرار دے اور ہماری محبّت بھی تمام مومنین کے دلوں میں ڈال دے۔

بارِ الہا ! ہمارا عظیم اسلامی معاشرہ اتنی بڑی تعداد میں ہونے اور اتنے وسیع مادی و معنوی وسائل رکھنے کے باوجود دُشمنوں کے پنجے میں گرفتار ہے۔ اور آپس کے انتشار اور پھوٹ کی وجہ سے کمزور ہوگیا ہے۔ تو مسلمانوں کو ایمان اور عملِ صالح کی مشعل کے گرد اکٹھا کردے۔

خداوندا ! جس طرح تُونے پہلے زمانے کے سرکشوں اور جابروں کو ایسا ہلاک و محو اور نابود کیا ہے کہ اُن کی بھنک بھی کانوں میں نہیں پڑتی اسی طرح ہمارے زمانہ کی سُپر طاقتوں کو بھی نیست و نابود کردے۔ اُن کے شر کو مستضعفین کے سروں سے ٹال دے اور ان مستکبرین کے خلاف مومنین کی جدوجہد کو حتمی کامیابی سے ہمکنار کردے۔

آمین یا ربّ العالمین

سورۂ مریم کا اختتام

جمعہ ۲۳/ بھمن / ۱۳۶۰

۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۰۲

○



Marfat.com

# سُورہٴ طٰہٰ

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۱۳۵ آیات ہیں



Marfat.com

# سورہ طٰہٰ کی فضیلت

منابع اسلامی میں اس سورہ کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ خدا نے سورۂ طٰہٰ اور یٰس کو خلقتِ آدم سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں کے سامنے بیان کیا جس وقت فرشتوں نے قرآن کا یہ حصہ سُنا تو انہوں نے کہا:

طوبیٰ لامة ینزل هذا علیها، وطوبیٰ لاجواف تحمل هذا، وطوبیٰ لالسن تکلم بهذا

کیا کہنا اس اُمت کا کہ جن پر یہ آیتیں نازل ہوں گی، کیا کہنا ان دلوں کا جو ان آیات کو قبول کریں گے اور کیا کہنا اُن زبانوں کا کہ جن پر یہ آیات جاری ہوں گی۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

لا تدعوا قرائة سورة طٰهٰ، فان الله یحبها ویحب من قرأها، ومن ادمن قرائتها اعطاه الله یوم القیامة کتابه بیمینه، ولم یحاسبه بما عمل فی الاسلام، واعطی فی الآخرة من الاجر حتی یرضی

سورۂ طٰہٰ کی تلاوت ترک نہ کرو، کیونکہ خدا اسے اور اس کی تلاوت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو شخص ہمیشہ اس کی تلاوت کرتا رہے خدا قیامت کے دن اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا اور آخرت میں اسے اتنا اجر ملے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا۔[2]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے:

من قرأها اعطی یوم القیامة ثواب المهاجرین والانصار

---

۱۔ مجمع البیان، جلد ۷، ص ۱۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۶۷۔



Marfat.com

جو شخص اسے پڑھے گا اُسے روزِ قیامت مہاجرین و انصار کے برابر ثواب ملے گا۔[1]

ہم پھر یہ بات ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو دہرائیں کہ تمام ایسے عظیم ثواب جو پیغمبرؐ اور آئمہؑ سے ان سورتوں کی تلاوت کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں، ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کرنے سے انسان کو یہ سب نتائج حاصل ہو جائیں گے بلکہ اس سے مراد وہ تلاوت ہے جو غور و فکر کا مقدمہ بنے، ایسا غور و فکر کہ جس کے آثار انسان کے تمام اعمال و گفتار سے ظاہر ہوں اور اگر ہم اس سورہ کے اجمالی مطالب پر نظر کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا روایات اس سورہ کے مطالب کے ساتھ کامل مناسبت رکھتی ہیں۔

## اِس سُورہ کے مضامین :

تمام مفسرین کے قول کے مطابق سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے مضامین بھی باقی تمام مکی سورتوں کی مانند ہیں جو زیادہ تر "مبدا" و "معاد" کے بارے میں ہیں اور توحید کے نتائج اور شرک کی بدبختیوں کو ایک ایک کر کے بیان کرتی ہیں۔

**پہلے حصّہ میں** عظمتِ قرآن اور پروردگار کی کچھ صفات جلال و جمال کی طرف مختصر سا اشارہ ہے۔

**دُوسرے حصّہ میں** کہ جو اسّی سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے، موسیٰؑ کی داستان بیان ہوئی ہے۔ یہ اس زمانے کی داستان ہے جب موسیٰؑ نبوت پر مبعوث ہوئے اور اس کے بعد جابر فرعون کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؑ نے فرعونیوں کے ہاتھوں بہت سے مصائب جھیلے۔ جادوگروں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ وہ ایمان لے آئے۔ اس کے بعد خدا نے معجزانہ طریقے سے فرعون اور اس کے حواریوں کو دریا میں غرق کر دیا اور موسیٰ اور مومنین کو رہائی بخشی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی بچھڑے کو پوجنے کی داستان بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہارونؑ و موسیٰؑ کو کس طرح سے ان سے بھی اُلجھنا پڑا۔

**تیسرے حصّہ میں** کچھ معاد کے بارے میں بیان ہے اور کچھ قیامت کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

**چوتھے حصّہ میں** قرآن اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔

**پانچویں حصّہ میں** جنت میں آدم و حوّا کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ ابلیس کی وسوسہ انگیزی کا ماجرا بیان کیا گیا ہے اور انجام کار ان کے زمین پر اُترنے کا تذکرہ ہے۔

**آخری حصّہ میں** مومنین کے لیے بیدارکن پند و نصائح ہیں، کہ جن میں سے اکثر کا رُوئے سخن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔

✣ ✣ ✣

---

[1] مجمع البیان، جلد ۷، ص ۱ ۔



Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ طٰهٰ ۝
۲۔ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝
۳۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝
۴۔ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝
۵۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝
۶۔ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝
۷۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝
۸۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝

## ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ طٰہٰ۔
۲۔ ہم نے قرآن کو تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تو خود کو مشقت میں ڈال دے۔
۳۔ اسے تو صرف اُن لوگوں کی یادآوری اور تذکرہ کے لیے نازل کیا ہے کہ جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔
۴۔ یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔
۵۔ وہ خدائے رحمٰن ہے کہ جو عرش پر مسلط ہے۔
۶۔ جو کچھ آسمانوں میں، زمین میں، ان دونوں کے درمیان اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔
۷۔ اگر تم اونچی آواز سے بات کروگے (یا پوشیدہ طور پر بات کروگے) تو وہ تمام چھپی ہوئی باتوں کو بلکہ خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔
۸۔ وہی وہ خدا ہے کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔



Marfat.com

## شانِ نزول :

مذکورہ بالا پہلی آیات کی شانِ نزول میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی و قرآن کے نازل ہونے کے بعد بہت ہی زیادہ عبادت کرنے لگے تھے۔ خاص طور پر کھڑے کھڑے عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاؤں پر ورم آگئے تھے۔ کبھی اس غرض سے کہ عبادت جاری رکھ سکیں، اپنے جسم کا سارا بوجھ ایک پاؤں پر ڈال دیتے اور کبھی دوسرے پاؤں پر، کبھی پاؤں کی ایڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور کبھی پاؤں کی انگلیوں پر۔[1]

تو مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور آپؐ کو حکم دیا گیا کہ اپنے اُوپر اتنی مشقت نہ ڈالیں۔

# تفسیر

## خود کو اتنا مشقت میں نہ ڈالو :

اس سورہ کے آغاز میں ہمیں پھر حروفِ مقطعہ کا سامنا ہے جو انسان کے احساسِ جستجو کو اُبھارتے ہیں ــــ (طٰہٰ)۔

البتہ ہم نے قرآن کے حروفِ مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں تین سورتوں کے آغاز میں کافی بحث کی ہے۔[2]

لیکن اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مطلب کا اضافہ کریں کہ ممکن ہے کہ تمام ہی یا کم از کم ان حروفِ مقطعہ میں سے کچھ ایک خاص معنی و مفہوم رکھتے ہوں۔ ٹھیک ایک لفظ کی مانند جس کا کوئی نہ کوئی معنی و مفہوم ہوتا ہے۔

اتفاقاً ہمیں بہت سی روایات نیز اس سورہ اور سورہ یٰسٓ کے آغاز میں مفسرین کے کلمات سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے کہ "طٰہٰ" یا رجل (اے مرد) کے معنی میں ہے۔ کچھ عربی اشعار بھی ایسے ملتے ہیں جن میں "طٰہٰ" "یا رجل" یا اس کے نزدیک کے معنی میں استعمال ہوا ہے ان میں سے بعض اشعار ممکن ہے آغازِ اسلام یا قبل از اسلام کے زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔[3]

اور جیسا کہ ایک باخبر شخص نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ بعض مغربی دانشوروں نے کہ جو اسلامی مسائل کے سلسلے میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس مطلب کو قرآن کے تمام حروفِ مقطعہ کے لیے عام سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ حروفِ مقطعہ ہر سورہ کی ابتدا میں ایک مستقل لفظ ہے، اس کا ایک خاص معنی ہے ان میں سے بعض زمانہ گزر جانے سے متروک ہو گئے ہیں اور بعض ہم تک پہنچ گئے ہیں، ورنہ یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ مشرکین عرب حروفِ مقطعہ کو سنیں اور وہ اس کا کوئی مفہوم نہ سمجھیں پھر بھی اس کا مذاق نہ اُڑائیں حالانکہ کسی تاریخ میں یہ بات نظر نہیں آتی کہ ان بد دماغ ہٹ دھرموں نے حروفِ مقطعہ کو مذاق اُڑانے کے لیے عنوان بنایا ہو۔

البتہ اس نظریہ کو بطورِ کلی اور تمام حروفِ مقطعہ کے بارے میں قبول کرنا مشکل ہے لیکن بعض کے بارے میں قابلِ قبول ہے اور اسلامی

---

[1] ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین اور تفسیر در المنثور میں سورہ طٰہٰ کی ابتدا سے رجوع کریں۔

[2] سورہ بقرہ، جلد اول۔ آلِ عمران، جلد دوم۔ اور اعراف جلد ششم (تفسیر نمونہ)۔

[3] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

منابع میں بھی اس کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ "طٰہٰ" پیغمبر اکرمؐ کا ایک نام ہے اور اس کا معنی ہے:

یا طالب الحق، الھادی الیہ

اے وہ شخص کہ جو حق کا طالب اور اس کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "طٰہٰ" دو رمزی حروف کا مرکب ہے۔ "طا" "طالب الحق" کی طرف اشارہ ہے اور "ھا" "ھادی الیہ" کی طرف۔ ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ زمانے میں بھی اور موجودہ زمانہ میں بھی رمزی حروف (CODE WORDS) اور مختصر علامات سے استفادہ ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر ہمارے زمانہ میں تو اس سے بہت ہی استفادہ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ لفظ "طٰہٰ" نے لفظ "یٰسٓ" کی طرح زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تدریجاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم خاص کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ آلِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "آلِ طٰہٰ" بھی کہا جاتا ہے اور حضرت مہدی علیہ السلام کو دعائے ندبہ میں "یابن طٰہٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قرآن تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تُو اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دے (ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پروردگار کی عبادت اور اس کے قرب کی جستجو اس کی پرستش کے ذریعہ بہترین کام ہے لیکن ہر کام ایک حساب سے ہوتا ہے۔ عبادت بھی ایک حساب سے کی جاتی ہے۔ تم خود پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ تمہارے پاؤں متورم ہو جائیں اور تبلیغ و جہاد کے لیے تمہاری قوت میں کمی آجائے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "تشقیٰ" مادہ "شقاوت" سے "سعادت" کی ضد ہے لیکن جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں لکھتا ہے کہ بعض اوقات یہ مادہ تکلیف اور دُکھ کے معنی میں بھی آتا ہے اور مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں، جیسا کہ شانِ نزول میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن کے نازل کرنے کا مقصد اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ہم نے تو قرآن کو صرف اُن لوگوں کی یاد آوری اور تذکر کے لیے نازل کیا ہے کہ جو (خدا سے) ڈرتے ہیں (الا تذکرۃ لمن یخشیٰ)۔

"تذکرۃ" سے تعبیر ایک طرف اور "من یخشیٰ" دوسری طرف ایک ناقابلِ انکار واقفیت کی طرف اشارہ ہے۔ تذکرہ اور یاد دہانی اس بات کی نشاندہی ہے کہ تمام خدائی تعلیمات کا خمیر انسان کی رُوح اور اس کی فطرت میں موجود ہوتا ہے اور انبیا کی تعلیمات اُسے بار آور بناتی ہیں اس طرح سے کہ گویا وہ کسی مطلب کی یاد دہانی کراتی ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان تمام علوم کو پہلے ہی سے جانتا تھا اور اب انہیں بھول گیا ہے اور اس دنیا میں تعلیم کا مقصد یاد دہانی ہے۔ (جیسا کہ افلاطون کا نظریہ بیان کیا جاتا ہے) بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی خمیر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ (غور کیجئے گا)



Marfat.com

"من یخشیٰ" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب تک انسان میں ایک قسم کا احساس ذمّہ داری و جوابدہی نہ ہو، جس کا نام قرآن نے "خشیت و خوف" رکھا ہے، اس وقت تک وہ حقائق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ کیونکہ قبول کرنے والی صلاحیت ہر چیز کے بارآور ہونے میں بھی شرط ہے اور در حقیقت یہ تعبیر اس چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ بقرہ کی ابتداء میں بیان ہوئی ہے:

هدًى للمتقين

قرآن متقین کی ہدایت کا سبب ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس خدا کا تعارف کرواتا ہے کہ جو قرآن کو نازل کرنے والا ہے تاکہ اس کی معرفت کے ذریعے قرآن کی عظمت آشکار ہو۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ جو زمین اور بلند آسمانوں کا خالق ہے۔ (تنزيلاً ممن خلق الارض والسمٰوٰت العلىٰ)[1]

حقیقت میں یہ توصیف نزولِ قرآن کی ابتداء اور انتہا کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کی انتہا زمین ہے اور ابتداء آسمان ہیں، یہ اس لفظ کے معنی کی وسعت کے لحاظ سے ہے اور اگر اس مقام پر ـــ قرآن کی دوسری آیات کے مانند ـــ لفظ "ما بينهما" کا اضافہ نہیں ہوا تو شاید اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس سے اصل مقصد ابتداء و انتہا کا بیان کرنا تھا۔

بہر حال وہ خدا کہ جس کی قدرت و تدبیر اور حکمت، آسمان و زمین کی وسعت پر محیط ہے، ظاہر ہے کہ اگر وہ کوئی کتاب نازل کرے گا تو وہ کس قدر فصیح و پُر معنی ہوگی۔

پھر قرآن کے نازل کرنے والے پروردگار کا تعارف جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ خدا رحمٰن ہے کہ جس کی رحمت کا فیض ہر جگہ پر محیط ہے اور وہ عرش پر مسلط ہے (الرحمٰن على العرش استوىٰ)۔

ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "عرش" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کی چھت ہو، اور کبھی خود چھت کو یا بلند پایوں والے تخت کو یا بادشاہوں کے تخت کو عرش کہتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے واقعے میں بیان ہوا ہے:

ايكم يأتينى بعرشها

تم میں سے کون اُس (بلقیس) کے تخت کو میرے پاس لا سکتا ہے۔ (نمل - ۳۸)

واضح ہے کہ خدا کا نہ تو کوئی تخت ہے اور نہ ہی نوعِ بشر کے حکمرانوں کی طرح حکومت، بلکہ "عرش خدا" سے مراد مجموعتاً عالمِ ہستی ہے کہ جو اس کی حکومت کا تخت شمار ہوتا ہے۔ اس بناء پر "استوىٰ على العرش" پروردگار کے جہانِ ہستی پر تسلط اور مکمل احاطہ اور سارے عالم میں اس کی تدبیر و فرمان کے نفوذ کی طرف اشارہ ہے۔

اصولی طور پر لغتِ عرب میں "عرش" اور فارسی (اور اُردو زبان) میں "تخت" زیادہ تر قدرت و اقتدار کے معنی میں بولا جاتا ہے،

---

[1] اس بارے میں کہ "تنزيلاً" کا اعراب کے لحاظ سے کیا موقع و محل ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ البتہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک محذوف فعل مجہول کا مفعولِ مطلق ہے اور یہ فقرہ یوں تھا، نزل تنزيلاً ممن خلق الارض......



Marfat.com

مثلاً ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں شخص کو تخت سے اُتار دیا یعنی اس کی قدرت واختیار اور حکومت کو ختم کر دیا یا عربی زبان میں کہتے ہیں (ثلّ عرشہ) اس کا تخت گر گیا [۱]

بہرحال اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس تعبیر سے خدا کے لیے جسم ہونے کا تصور کرے تو یہ انتہائی بچگانہ بات ہوگی۔

عالمِ ہستی پر خدا کی "حاکیت" کا ذکر کرنے کے بعد اس کی "مالکیت" کے بارے میں بیان کیا گیا ہے: جو کچھ آسمانوں میں، زمین میں، ان دونوں کے درمیان اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ (له ما في السموٰت وما في الارض وما بينهما وما تحت الثرٰى)

"ثریٰ" اصل میں مرطوب مٹی کے معنی میں ہے اور چونکہ زمین کا صرف اُوپر والا حصہ سُورج کی تپش اور ہوا کے چلنے سے خشک ہوتا ہے لیکن اس کا نچلا طبقہ زیادہ تر مرطوب اور تر ہوتا ہے، اس لیے اس طبقہ کو "ثریٰ" کہتے ہیں، اور اس طرح "ماتحت الثرٰى" زمین کی گہرائیوں اور اس کے اندر والے حصّہ کے معنی میں ہے جو سب کا سب مالک الملک اور عالمِ ہستی کے خالق کی ملکیت ہے۔

یہاں تک صفاتِ پروردگار کے ارکان میں سے تین رُکن بیان ہوئے تھے۔ پہلا رُکن خالقیت، دُوسرا رُکن حاکیت اور تیسرا رُکن اس کی مالکیت ہے۔

بعد والی آیت میں اس کے چوتھے رُکن یعنی اس کی عالمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ اس قدر علمی احاطہ رکھتا ہے کہ اگر تو آشکارا بات کرے تو بھی وہ جانتا ہے اور پوشیدہ اور آہستہ طور پر بات کرے تب بھی وہ جانتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مخفی سے مخفی تر بات سے بھی آگاہ ہے۔ (وان تجهر بالقول فانه يعلم السر واخفى)۔

اس بارے میں کہ "اخفی" (سِرّ اور بھید سے زیادہ مخفی) سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "سِر" یہ ہے کہ جسے انسان دوسرے سے پنہاں اور مخفی طور پر بیان کرے اور "اخفی" سے مراد یہ ہے کہ جسے انسان دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اور کسی سے بیان نہیں کرتا۔

بعض نے کہا ہے کہ "سِر" وہ ہے کہ جو انسان دل میں رکھتا ہو اور اخفی وہ ہے کہ جو کسی کے ذہن میں بھی نہیں آیا لیکن خدا اُسے بھی جانتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "سِر" وہ عمل ہے کہ جسے انسان چھُپ کر انجام دیتا ہے اور "اخفی" وہ نیت ہے کہ جو وہ دل میں رکھتا ہے۔

بعض نے کہا ہے "سِر" لوگوں کے اسرار کے معنی میں ہے اور "اخفی" وہ اسرار ہیں کہ جو خدا کی پاک ذات میں ہیں۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"سِر" تو وہ ہے کہ جسے تو نے دل میں چھُپا رکھا ہے، اور "اخفی" وہ بات ہے کہ جو تیرے دل میں پیدا ہوئی لیکن تو نے اُسے بھلا دیا ہے [۲]

ممکن ہے کہ یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انسان جس چیز کو یاد رکھتا ہے وہ حافظے کے خزانے کے سپرد ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا اس مخزن کے کسی گوشے سے ربط منقطع ہو جاتا ہے اور اُس پر نسیان کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر کسی ذریعے سے

---

[۱] تفسیر نمونہ کی جلد ۶، صفحہ ۱۸۱ (اردو ترجمہ) ـــــ پر بھی اس بارے میں بحث کی گئی ہے۔

[۲] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



Marfat.com

یاد دہانی ہو جائے تو وہ اسے بالکل ایک جانی پہچانی بات سمجھتا ہے۔ اس بنا پر جس بات کو انسان بھول چکا ہے وہ اس کے سب سے زیادہ مخفی اسرار میں سے ہے جو حافظہ کے کسی گوشہ میں پنہاں ہو گیا ہے اور وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لیے اس کا ربط اُس سے منقطع ہو گیا ہے۔

لیکن بہر حال اِس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وہ تمام تفسیریں جو اُوپر بیان کی گئی ہیں "سر" اور "اخفیٰ" کے وسیع معنی میں موجود ہوں اس طرح سے پروردگار کے بے پایاں علم کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اور مذکورہ بالا تمام آیات سے قرآن کے نازل کرنے والے کے بارے میں چار صفات یعنی "خلقت"، "حکومت"، "مالکیت" اور علم سے متعلق اجمالی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے: وہی اللہ وہ خدا ہے کہ جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس کے لیے اچھے اچھے نام اور صفات ہیں (اللہ لا الٰہ الا ھو لہ الاسماء الحسنٰی)۔

جیسا کہ ہم نے (سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۰) کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "اسماء حسنیٰ" کی تعبیر قرآن کی آیات میں بھی اور حدیث کی کتابوں میں بھی بارہا آئی ہے۔ یہ تعبیر دراصل اچھے ناموں کے معنی میں ہے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ خدا کے سب ہی نام اچھے ہیں لیکن خدا کے اسما و صفات میں سے بعض نام کیونکہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسماء حسنیٰ کہلاتے ہیں۔

بہت سی روایات میں ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ منقول ہے کہ:

> خدا کے ننانوے (۹۹) نام ہیں جو شخص اُسے ان ناموں کے ساتھ پکارے گا اس کی دعا قبول ہوگی اور جو شخص (از روئے معرفت) ان کا احصا کرے وہ اہل بہشت میں سے ہے۔

یہ مضمون اہل سنت کی حدیث کی معروف کتابوں میں بھی موجود ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں کے احصا اور شمار کرنے سے مراد ان صفات کا "تخلق" یعنی انہیں اپنانا ہے نہ کہ صرف ان الفاظ کا ذکر کرنا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص صفت عالم و قادر یا رحیم و غفور وغیرہ سے "تخلق" پیدا کرے یعنی ان صفات کو اپنا لے اور ان عظیم خدائی صفات کی شعاعیں اس کے وجود میں چمکنے لگیں تو وہ بہشتی بھی ہے اور اس کی دعا بھی قبول ہوگی (مزید وضاحت کے لیے اس تفسیر کی جلد ۳۹۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں)۔

۹۔ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝

۱۰۔ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝

۱۱۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝

۱۲۔ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝



Marfat.com

۱۳۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ○

۱۴۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○

۱۵۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ○

۱۶۔ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ○

## ترجمہ

۹۔ اور کیا موسیٰ کی خبر تم تک پہنچی ہے۔

۱۰۔ جب اُسے (دُور سے) آگ دکھائی دی تو اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (تھوڑی دیر کے لیے) رُک جاؤ۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں تمہارے لیے اس میں سے ایک چنگاری لے آؤں یا اُس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کرلوں

۱۱۔ جس وقت وہ آگ کے پاس آیا تو اُسے ندا دی گئی: اے موسیٰ!

۱۲۔ میں تیرا پروردگار ہوں! اپنے جُوتے اُتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین "طویٰ" میں ہے۔

۱۳۔ اور میں نے تجھے (مقامِ رسالت کے لیے) منتخب کرلیا ہے۔ اب جو کچھ بھی تیری طرف وحی کی جائے اُسے غور سے سُن۔

۱۴۔ میں اللہ ہوں میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ پس تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

۱۵۔ قیامت (حتماً) آئے گی میں اسے اس لیے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے بدلے اپنی جزا دیکھ لے۔

۱۶۔ اور جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اُس سے باز نہ رکھیں ورنہ تُو ہلاک ہو جائے گا۔

## تفسیر

### بیابان میں آگ کا شعلہ:

یہاں سے خُدا کے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اسی ۸۰ سے زیادہ آیات میں ان پر گزرنے والے واقعات کے اہم حصوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

تاکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے جو اُن دنوں مکہ میں دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، یہ داستان تسلّی اور دلاسے کا کام دے۔



Marfat.com

تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ شیطانی طاقتیں خدا کی قدرت کے مقابلے میں ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتیں اور ان کی یہ سب سازشیں نقش برآب ہیں تاکہ اس داستان سے، جو بہت سے سبق آموز مطالب سے معمور ہے، توحید و خدا پرستی کی جدوجہد میں اپنی منزل کو پالیں۔ زمانے کے فرعونوں اور جادوگروں کے خلاف معرکہ جاری رکھیں اور اسی طرح داخلی انحرافات اور انحرافی میلانات کے خلاف پیکار میں اپنی منزلِ مقصود کو پالیں یہ ایسے درس ہیں کہ جو ان کے لیے انقلاب اسلامی کے سارے دور میں راہ نما اور راہ گشا ہو سکتے ہیں۔

موسیٰ و بنی اسرائیل اور آلِ فرعون کے واقعات پر مشتمل ان آیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے حصّہ میں — حضرت موسیٰؑ کی نبوت و بعثت کے آغاز اور وحی کی پہلی شعاعوں کا بیان ہے۔ یہ وہ دور ہے جس کی مدت کم ہے اور مطالب زیادہ ہیں۔ یہ وہ دن ہیں جو حضرت موسیٰؑ نے اس "وادی مقدس" میں، اس بیابانِ تاریک میں اور خلوت میں گزارے۔

دُوسرے حصّہ میں — حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کی طرف سے فرعون اور اس کے حواریوں کو توحید پرستی کے دین کی دعوت دینے کا ذکر ہے اور اس کے بعد دشمنوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرے حصّہ میں — موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون اور اس کے حواریوں کے چنگل سے ان کے نجات پانے کی کیفیت اور دشمنوں کے غرق ہونے کا تذکرہ ہے۔

چوتھے حصّہ میں — بنی اسرائیل کے دینِ توحید سے شرک کی طرف بڑی تیزی سے انحراف کرنے، اور سامری کے وسوسوں کو قبول کرنے کا ذکر ہے۔ نیز اس انحراف پر حضرت موسیٰؑ کے قاطع اور شدید ردِّ عمل کا ذکر ہے۔

اب ہم زیرِ بحث آیات کی طرف کہ جو پہلے حصّے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ آیات ایک جاذب و لطیف تعبیر کے ساتھ کہتی ہیں: کیا تمہیں موسیٰ کی خبر پہنچی ہے (وھل اتٰك حديث موسٰى)۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں کہ یہ استفہام حصولِ خبر کے لیے نہیں ہے کیونکہ خدا تو تمام اسرار سے آگاہ ہے، بلکہ مشہور تعبیر کے مطابق یہ استفہام تقریری یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسا استفہام ہے کہ جو ایک اہم خبر بیان کرنے کے لیے تمہید اور مقدمہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں بھی ایک اہم خبر کو شروع کرتے وقت کہتے ہیں: کیا تم نے یہ خبر سُنی ہے کہ ...؟

٭ ٭ ٭

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جب اُسے (دُور سے) آگ دکھائی دی تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم تھوڑی دیر کے لیے رُک جاؤ۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ میں اس کی طرف جاتا ہوں، شاید میں اُس سے تمہارے لیے ایک چنگاری لے آؤں، یا اس آگ کے ذریعے راستہ معلوم کرلوں (اِذ رأى نارًا فقال لاهله امكثوا انى انست نارًا لعلى اٰتيكم منها بقبس او اجد على النار هدًى)۔

"قَبَس" (بروزن "قفس") تھوڑی سی آگ کے معنی میں ہے کہ جسے کچھ زیادہ آگ سے الگ کر لیتے ہیں۔ بیابانوں میں آگ کا دکھائی دینا عام طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہیں یا یہ بلندی پر آگ کا شعلہ اس لیے روشن کیا جاتا ہے تاکہ قافلے والے رات کے وقت بھٹک نہ جائیں۔

"امکثو" "مکث" کے مادہ سے مختصر توقف کے معنی میں ہے۔ ان تمام تعبیرات سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت



Marfat.com

موسیٰؑ اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ اندھیری رات میں بیابان سے گزر رہے تھے۔ رات ایسی سرد اور تاریک تھی کہ وہ راستہ کھو بیٹھے تھے۔ انہیں دُور سے آگ کا ایک شعلہ دکھائی دیا۔ یہ شعلہ دیکھتے ہی حضرت موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا: تھوڑی سی دیر کے لیے ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے، مَیں جاکر اس میں سے تھوڑی سی آگ تمہارے لیے لے آؤں یا آگ کے ذریعے یا اُن لوگوں کے وسیلے سے جو وہاں ہیں راستہ معلوم کر لوں۔

تواریخ میں بھی ہے کہ جب موسیٰؑ کی شعیبؑ کے ساتھ معاہدہ کی مدّت مدین میں پُوری ہوگئی تو وہ اپنے بیوی بچے اور اپنی بھیڑوں کو لے کر مدین سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھول گئے، رات ایسی تاریک اور اندھیری تھی کہ بھیڑیں بیابان میں بکھر گئیں۔ اُنھوں نے چاہا کہ آگ روشن کریں تاکہ اس سرد رات میں وہ خود اور ان کے بال بچے گرم ہوں، لیکن آگ جلانے والی چیز سے آگ روشن نہ ہوئی۔ اسی عرصے میں ان کی حاملہ بیوی کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہوگئی۔

گویا مصائب کا ایک طوفان تھا جس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ وقت تھا جبکہ انہیں دُور سے ایک شعلہ نظر آیا۔ لیکن یہ آگ نہیں تھی بلکہ خدائی نور تھا۔ موسیٰ اس گمان میں کہ وہ آگ ہے، راستہ معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے اس آگ کی طرف چل پڑے۔[1]

اب اس سرگزشت کا آخری حصہ قرآن کی زبان سے سُنتے ہیں:

جب موسیٰؑ آگ کے پاس آئے تو ایک آواز سُنی جو انہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ اے موسیٰؑ (فلما اتاها نودی یا موسٰی)۔

٭ ٭ ٭

مَیں تیرا پروردگار ہوں، اپنے جُوتے اتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین طوی میں ہے (انی انا ربك فاخلع نعليك انك بالواد المقدس طوٰی)۔

سُورہ قصص کی آیہ ۳۰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ نے یہ ندا اُس درخت کی طرف سے جو وہاں تھا سُنی تھی:

نودی من شاطئ الوادی الایمن فی البقعة المبارکة من الشجرة
ان یا موسٰی انی انا الله رب العالمین

مجموعی طور پر ان دونوں تعبیروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جس وقت قریب گئے تو آگ کو درخت کے اندر دیکھا (جو مفسرین کے قول کے مطابق عناب کا درخت تھا) اور یہ خود ایک واضح و روشن قرینہ تھا، اس بات کا کہ یہ آگ کوئی عام آگ نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی نُور ہے، کہ جو نہ صرف یہ کہ درخت کو نہیں جلاتا بلکہ اس کے ساتھ یکجان و آشنا ہے، یہ نُورِ حیات ہے۔

موسیٰؑ نے یہ آواز کہ "مَیں تیرا پروردگار ہوں" سُنی تو حیران رہ گئے اور ایک ناقابل بیان پُرکیف حالت اُن پر طاری ہوگئی۔ یہ کون ہے جو مجھ سے باتیں کر رہا ہے؟ یہ میرا پروردگار ہے۔ کہ جس نے لفظ "ربك" کے ساتھ مجھے افتخار بخشا ہے تاکہ یہ میرے لیے اس بات کی نشاندہی کرے کہ مَیں نے آغاز بچپن سے لے کر اب تک اس کی آغوشِ رحمت میں پرورش پائی ہے اور ایک عظیم رسالت کے لیے تیار

[1] مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

کیا گیا ہوں۔

حکم ملا کہ پاؤں سے اپنا جوتا اُتار دو، کیونکہ تُو نے مقدس سرزمین میں قدم رکھا ہے وہ سرزمین کہ جس میں نُورِ الٰہی جلوہ گر ہے، وہاں خدا کا پیغام سننا ہے، اور رسالت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے، لہٰذا انتہائی خضوع اور انکساری کے ساتھ اس سرزمین میں قدم رکھو۔ یہ ہے دلیل پاؤں سے جوتا اُتارنے کی۔

اس بناء پر بعض مفسرین نے جوتا اُتارنے کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اُنہوں نے بعض چند در چند دوسروں کے اقوال نقل کیے ہیں جو بہت زیادہ ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو بہت بعید معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ جو روایات اس آیت کی تاویل کے سلسلے میں نقل ہوئی ہیں، ہم نکات کے ذکر کے موقع پر اُن کے بارے میں بحث کریں گے۔

"طوی" کی تعبیر یا تو اس بناء پر ہے کہ اس سرزمین کا نام طوی تھا، جیسا کہ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے اور یا یہ بات ہے کہ "طوی" جو کہ اصل میں لپیٹنے کے معنی میں ہے، یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سرزمین کو معنوی برکات نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اسی بناء پر سورہ قصص کی آیہ ۳۰ میں اُسے "البقعة المباركة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اُسی کہنے والے سے یہ بات بھی سُنی: اور میں نے تجھے مقام رسالت کے لیے چُن لیا ہے۔ اب جو بھی وحی تیری طرف ہوتی ہے اُسے غور سے سنو (وانا اخترتك فاستمع لما یوحٰی)۔

٭ ٭ ٭

اور اس کے بعد موسیٰ نے وحی کا پہلا جملہ اس صُورت میں حاصل کیا: میں اللہ ہوں، میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے (انني انا الله لا اله الا انا)۔

اب جبکہ یہ بات ہے تو صرف میری ہی عبادت کر، ایسی عبادت کہ جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہو۔ (فاعبدنی)۔

اور نماز قائم کر تاکہ ہمیشہ میری یاد میں رہے (واقم الصلٰوة لذكری)۔

اس آیت میں انبیاء کی دعوت کی اہم ترین بنیاد یعنی مسئلہ توحید کو بیان کرنے کے بعد خدائے یگانہ کی عبادت کا موضوع، ایمان و توحید کے درخت کے ایک ثمر کے عنوان سے بیان ہوا ہے اور اس کے بعد عظیم ترین عبادت اور خلق کا خالق کے ساتھ اہم ترین تعلق اور اس کی ذات پاک کو فراموش نہ کرنے کی مؤثر ترین راہ یعنی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔

فرمانِ رسالت کے ساتھ، جو اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، ان تینوں احکام کا بیان اور مسئلہ معاد کا بیان جو اس سے بعد والی آیت میں آیا ہے، اصول و فروع دین کے ایک کامل اور مختصر مجموعہ کو بیان کرتا ہے۔ اور استقامت کے حکم کے ساتھ جو زیرِ بحث آیات کی آخری آیت میں آئے گا ہر لحاظ سے اس سلسلۂ کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اور چونکہ "توحید" اور اس کی فروعات کے ذکر کے بعد دوسرا بنیادی مسئلہ معاد ہے لہٰذا بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے قیامت یقیناً آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ اُسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش کے مطابق جزا پائے (ان الساعة اٰتية اكاد اخفيها لتجزٰی كل نفس بما تسعٰی)۔



Marfat.com

اس جملہ میں دو نکات ہیں کہ جن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے :

**پہلا نکتہ** : یہ ہے کہ (اکاد اخفیھا) کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ "نزدیک" ہے کہ میں قیام قیامت کی تاریخ کو مخفی رکھوں اور اس تعبیر کے لیے یہ بات لازم آتی ہے کہ میں نے (ابھی تک) مخفی نہیں رکھا ہے ، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی بہت سی صریح اور واضح آیات کے مطابق کوئی شخص بھی تاریخ قیامت سے آگاہ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۷ میں بیان ہوا ہے :

یسئلونك عن الساعة ایان مرسٰھا قل انما علمھا عند ربی

لوگ قیامت کے بارے میں تجھ سے سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔

مفسرین نے اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں کی ہیں ۔ بہت سے مفسرین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تعبیر ایک قسم کا مبالغہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے شروع ہونے کی تاریخ اس قدر مخفی اور پنہاں ہے کہ نزدیک ہے کہ میں خود اپنے آپ تک سے بھی اُسے پنہاں رکھوں ۔ اس بارے میں ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے اور احتمال یہی ہے کہ مفسرین کی اس جماعت نے اپنا مطلب اسی روایت سے اخذ کیا ہے ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "کاد" کے مشتقات ہمیشہ نزدیک ہونے کے معنی میں نہیں ہوتے ۔ بلکہ بعض اوقات تاکید کے معنی میں آتے ہیں اور اُس میں نزدیک ہونے کے معنی نہیں ہوتے ۔

لہٰذا بعض مفسرین نے "اکاد" کو "ارید" (میں چاہتا ہوں) کے معنی کے ساتھ تفسیر کیا ہے ۔ اور بعض متون لغت میں یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں [1]

**دُوسرا نکتہ یہ ہے** کہ : زیر بحث آیت کے مطابق قیامت کو مخفی رکھنے کی علت و سبب یہ ہے کہ " خدا یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی سعی و کوشش کے مطابق جزا دے" دوسرے لفظوں میں اس کے مخفی رہنے سے سب کے لیے ایک قسم کی آزادئ عمل پیدا ہو گی اور دوسری طرف سے چونکہ اس کا کوئی خاص وقت معلوم نہیں ہے اور ہر زمانہ میں اس کا احتمال ہے لہٰذا اس کا نتیجہ ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت یا تربیتی پروگراموں کو جلدی قبول کرنے کی صورت میں نکلتا ہے ۔ جیسا کہ " شب قدر" کے پوشیدہ رکھنے کے فلسفہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سال کی تمام راتوں یا ماہ مبارک رمضان کی تمام راتوں کا احترام کریں اور خدا کی درگاہ میں حاضری دیں ۔

☫ ☫ ☫

آخری زیر بحث آیت میں ایک اساسی مسئلے کی طرف کہ جو تمام مذکورہ عقیدتی اور تربیتی پروگراموں کے اجراء کا ضامن ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تجھے ہرگز اس سے باز نہ رکھیں ورنہ تُو ہلاک ہو جائے گا (فلا یصدنك عنھا من لا یؤمن بھا واتبع ھواہ فتردٰی)۔

تم بے ایمان لوگوں ، ان کے وسوسوں اور کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ ۔ نہ تو ان کی کثرت سے وحشت زدہ ہو ، نہ ان کی سازشوں سے کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی ان کی اس ہاؤ ہُو اور شور و غل سے اپنی دعوت کی حقانیت اور اپنے مکتب

---

[1] قاموس اللغت میں "کاد" کے مادہ میں آیا ہے : وتکون بمعنی اراد اکاد اخفیھا ارید (کاد کا معنی ہے میں چاہتا ہوں)۔



Marfat.com

کی اصالت میں کسی قسم کا شک و شبہ کرو۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہاں پر " لا یؤمن " صیغہ مضارع کی صورت میں اور " واتبع ھواہ " صیغہ ماضی کی صورت میں ہے۔ یہ درحقیقت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے منکرین کا ایمان نہ لانا ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ آزاد رہیں اور جو کچھ ان کا دل چاہے کریں، لہٰذا اس سے بہتر اور کیا ہے کہ قیامت کا ہی انکار کردیں تاکہ ان کی ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

## چند اہم نکات :

۱۔ " فاخلع نعلیك " سے کیا مُراد ہے ؟ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ موسٰیؑ کو اس مقدس سرزمین کے احترام کا حکم دیا گیا کہ اپنے پاؤں سے جُوتے اُتار دے اور اس وادی میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ قدم رکھے حق کو سُنے اور فرمانِ رسالت حاصل کرے لیکن بعض مفسرین کچھ روایات کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ : یہ حکم اس وجہ سے دیا گیا تھا چونکہ اس جُوتے کا چمڑا مُردہ جانور کا تھا۔

یہ بات خود اپنے طور پر بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ موسٰیؑ اس قسم کے آلودہ چمڑے اور جُوتے سے استفادہ کرتے۔ بعض دُوسری روایات میں اس کا انکار بھی پایا جاتا ہے۔ ایک روایت وہ ہے کہ جو امام زمانہ ( ارواحنا لہ الفداء ) کے ناحیہ مقدس سے نقل ہوئی ہے کہ جو اس تفسیر کی شدت کے ساتھ نفی کرتی ہے[1]

موجودہ تورات کے سفر خروج فصل سوم میں بھی یہی تعبیر کہ جو قرآن میں ہے، نظر آتی ہے۔

بعض دوسری روایات جن میں آیت کی تاویل اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ :

فاخلع نعلیك ای خوفیك : خوفك من ضیاع اھلك وخوفك من فرعون

" فاخلع نعلیك " سے مراد یہ ہے کہ اپنے سے دو خوف و خطر دُور کردے۔ ایک اپنے گھر والوں کے اس بیابان میں تباہ ہوجانے کا خوف اور دُوسرا فرعون کا خوف[2]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے حضرت موسٰیؑ کی زندگی کے اس واقعہ سے متعلق ایک عمدہ مطلب نقل ہوا ہے، آپؑ فرماتے ہیں :

کن لما لا ترجوا ارجی منك لما ترجوا، فان موسٰی بن عمران خرج لیقبس لاھلہ نارًا فرجع الیھم وھو رسول نبی !

جن چیزوں کی تمہیں اُمید نہیں ہے ان کی ان چیزوں سے بھی زیادہ اُمید رکھو کہ جن کی تمہیں اُمید ہے کیونکہ موسٰی بن عمران ایک چنگاری لینے کے لیے گئے تھے لیکن عہدۂ نبوّت و رسالت کیساتھ واپس پلٹے[3]

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۳۷۳۔

[2] و [3] نور الثقلین ج ۳ ص ۳۷۴۔



Marfat.com

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی اُمید رکھتا ہے مگر وہ اُسے حاصل نہیں ہوتی لیکن بہت سی اہم ترین چیزیں جن کی اُسے کوئی اُمید نہیں ہوتی لطف پروردگار سے اُسے مل جاتی ہیں۔

یہی معنی امیرالمومنین علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔[1]

**۲۔ ایک سوال کا جواب:** بعض مفسرین نے یہاں ایک سوال اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ موسیٰؑ نے کہاں سے اور کیسے یہ جان لیا کہ یہ آواز جو وہ سُن رہے ہیں خدا کی طرف سے ہے اور یہ یقین کیسے پیدا ہوا کہ پروردگار انہیں (رسالت پر) مامور کر رہا ہے؟

یہ سوال تمام انبیاء کے بارے میں اُٹھایا جا سکتا ہے۔ دو طریقے سے جواب دیا جا سکتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ: اس حالت میں ایک قسم کا مکاشفہ باطنی اور اندرونی احساس، جو انسان کو یقین کامل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر قسم کا شک وشبہ زائل کر دیتا ہے تمام پیغمبروں کو حاصل ہو جاتا ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ: ممکن ہے کہ وحی کا آغاز معجزاتی طور پر ایسے کام سے کیا جاتا ہو کہ جو پروردگار کی قدرت کے سوا ممکن ہی نہ ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے سبز درخت کے اندر آگ دیکھی۔ اور اسی سے سمجھ گئے کہ یہ ایک خدائی اور اعجاز آمیز مسئلہ ہے۔

اس بات کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ خدا کا کلام سُننا اور وہ بھی بغیر کسی واسطے کے، اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ خدا حنجرہ اور آواز رکھتا ہے بلکہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے فضا میں آواز کی لہریں پیدا کر دیتا ہے اور ان لہروں کے ذریعے اپنے پیغمبروں سے کلام کرتا ہے۔ اور چونکہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا آغاز اسی طرح ہوا تھا اسی لیے انہیں "کلیم اللہ" کہا جاتا ہے۔

**۳۔ نماز یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے:** زیر بحث آیات میں نماز کے ایک اہم فلسفہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس جہان کی زندگی میں — غافل کرنے والے عوامل کو مدِّنظر رکھتے ہوئے — یاد دہانی کا محتاج ہے۔ ایسے وسیلے کے ذریعے، جو مختلف زمانی فاصلوں میں، خدا، قیامت، پیغمبروں کی دعوت اور مقصد خلقت کو اُسے یاد دلائے، اور اسے غفلت اور جہالت کے گرداب میں غرق ہونے سے بچائے، نماز اس اہم ذمہ داری کو پُورا کرتی ہے۔

انسان صبح سویرے نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ وہ نیند کہ جس نے اُسے اس جہان کی ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا زندگی کے پروگرام کو نئے سرے سے شروع کرنا چاہتا ہے ہر چیز سے پہلے نماز میں مشغول ہوتا ہے اپنے دل و جان کو خدا کی یاد کے ساتھ جلا بخشتا ہے، اُس سے قوت و مدد حاصل کرتا ہے اور پاکیزگی وصداقت کے ساتھ سعی و کوشش کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

پھر جس وقت وہ روزانہ کے کاموں میں مشغول ہوتا ہے۔ اور چند گھنٹے گزر جاتے ہیں اور اکثر اس کے اور خدا کی یاد کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے، اچانک ظہر کا وقت ہو جاتا ہے اور وہ مؤذن کی آواز سُنتا ہے۔" اللہ اکبر ۔۔۔ حیّ علی الصلوٰۃ!": "خدا ہر چیز سے برتر ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جا سکے ۔۔۔ نماز کے لیے آؤ" تو وہ نماز کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اپنے معبود کے سامنے راز و نیاز کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، اور اگر کسی قسم کی غفلت کا گرد و غبار اس کے دل پر بیٹھ گیا ہوتا ہے تو وہ اسے دھو دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا وحی کے آغاز میں ابتدائی احکامات میں حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے: نماز قائم کرو تاکہ میری یاد میں رہو۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ آیت کہتی ہے کہ نماز قائم کر تاکہ تُو میری یاد میں رہے لیکن سورۂ رعد کی آیہ ۲۸ میں ہے:

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۵۱۳۔



Marfat.com

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

ذکرِ خدا اطمینان اور سکونِ قلب کا سبب ہے۔

اور سورہ فجر کی آیہ ۲۷ تا ۳۰ میں فرماتا ہے :

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ۔ جبکہ تو بھی اُس سے خوش ہے اور وہ بھی تجھ سے خوش ہے۔ تو میرے بندوں میں داخل ہوجا، اور میری جنّت میں چلا آ۔

ان تینوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاکر ہم اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ نماز انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہے، خدا کی یاد اس کے نفس کو مطمئن بناتی ہے اور نفس مطمئن اُسے مخصوص بندوں اور بہشتِ جاوداں میں پہنچا دیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

۱۷۔ وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی ○

۱۸۔ قَالَ ھِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْھَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ○

۱۹۔ قَالَ اَلْقِھَا یٰمُوْسٰی ○

۲۰۔ فَاَلْقٰھَا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسْعٰی ○

۲۱۔ قَالَ خُذْھَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی ○

۲۲۔ وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَۃً اُخْرٰی ○

۲۳۔ لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی ○

## ترجمہ

۱۷۔ اور اے موسٰی ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے ؟



Marfat.com

۱۸۔ کہا : یہ میرا عصا ہے ، میں اس پر سہارا لیتا ہوں ، اس سے اپنی بھیڑوں کے لیے درختوں سے پتّے جھاڑتا ہوں اور اس سے اپنی اور دوسری ضروریات بھی پُورا کرتا ہوں ۔
۱۹۔ کہا اے موسیٰ ! اسے نیچے پھینک دے ۔
۲۰۔ (موسیٰ نے) اُسے پھینکا تو وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا اور چلنے لگا ۔
۲۱۔ فرمایا اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اسے اس کی اُسی پہلی صُورت میں پلٹا دیں گے ۔
۲۲۔ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل کے اندر لے جا ، تو وہ بے عیب ، سفید اور چمکتا ہوا نکلے گا ، یہ دُوسرا معجزہ ہے ۔
۲۳۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بڑی بڑی نشانیاں تجھے دکھائیں ۔

# تفسیر

## موسیٰؑ کا عصا اور ید بیضا :

اس میں شک نہیں کہ انبیا کو اپنا خدا کے ساتھ ربط ثابت کرنے کے لیے معجزے کی ضرورت ہے ، ورنہ ہر شخص پیغمبری کا دعویٰ کرسکتا ہے ۔ اس بنا پر سچے انبیا کا جھوٹوں سے امتیاز معجزے کے علاوہ نہیں ہو سکتا ، یہ معجزہ خود پیغمبر کی دعوت کے مطالب اور آسمانی کتاب کے اندر بھی ہوسکتا ہے اور حسی اور جسمانی قسم کے معجزات دُوسرے اُمور میں بھی ہو سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں معجزہ خود پیغمبر کی رُوح پر بھی اثرانداز ہوتا ہے اور وہ اُسے قوّتِ قلب ، قدرتِ ایمان اور استقامت بخشتا ہے ۔

بہرحال حضرت موسیٰؑ کو فرمانِ نبوت ملنے کے بعد اس کی سند بھی ملنی چاہیئے ، لہٰذا اسی پُرخطرات جناب موسیٰؑ نے دو عظیم معجزے خدا سے حاصل کیے ۔

قرآن اس ماجرے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

خدا نے موسیٰ سے سوال کیا : " اے موسیٰ ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے ؟" ( وماتلك بيمينك يا موسٰى ) ۔

اس سادہ سے سوال ــــ میں لُطف و محبت کی چاشنی تھی ــ فطرتاً موسیٰؑ ــ کی رُوح میں اُس وقت طوفانی لہریں موجزن تھیں ۔ ایسے میں یہ سوال اطمینانِ قلب کے لیے بھی تھا اور ایک عظیم حقیقت کو بیان کرنے کی تمہید بھی تھا ۔

٭　٭　٭

موسیٰ نے جواب میں کہا : یہ لکڑی میرا عصا ہے ( قال هي عصاي ) ۔

اور چونکہ محبوب نے ان کے سامنے پہلی مرتبہ یُوں اپنا دروازہ کھولا تھا لہٰذا وہ اپنے محبوب سے باتیں جاری رکھنا اور انہیں طول دینا چاہتے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرا صرف یہ کہنا کہ یہ میرا عصا ہے ، کافی نہ ہو بلکہ اس سوال کا مقصد اس عصا کے آثار و فوائد کو بیان کرنا ہو ۔ لہٰذا مزید کہا ، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں ( اتوكؤ عليها ) ۔

اور اس سے اپنی بھیڑوں کے لیے درختوں سے پتّے جھاڑتا ہوں ( واهش بها على غنمي ) [1]

(۱۔ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں )



Marfat.com

اس کے علاوہ میں اس سے دوسرے کام بھی لیتا ہوں۔ (ولی فیھا مآرب اخرٰی)[۲]

البتہ یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ عصا رکھنے والے عصا سے کون کون سے کام لیتے ہیں۔ کبھی اس سے موذی جانوروں اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر کام لیتے ہیں۔ کبھی اس کے ذریعے بیابان میں سائبان بنا لیتے ہیں، کبھی اس کے ساتھ برتن باندھ کر گہری نہر سے پانی نکالتے ہیں۔

بہرحال حضرت موسیٰؑ ایک گہرے تعجب میں تھے کہ اس عظیم بارگاہ سے یہ کس قسم کا سوال ہے اور میرے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ پہلے جو فرمان دیئے گئے تھے وہ کیا تھے، اور یہ پرسش کس لیے ہے؟

☆ ☆ ☆

اچانک انہیں حکم دیا گیا اے موسیٰ! اپنا عصا پھینک دے (قال القھا یا موسٰی)۔

موسیٰ نے فوراً اسی وقت عصا پھینک دیا، وہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ بن گیا، اور وہ چلنے پھرنے لگا۔ (فالقاھا فاذا ھی حیۃ تسعٰی)۔

"تسعٰی" "سعی" کے مادہ سے تیزی کے ساتھ راہ چلنے کے معنی میں ہے جو دوڑنے کی حد تک نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

اس موقع پر موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں، ہم اسے اس کی اسی پہلی صورت میں پلٹا دیں گے۔ (قال خذھا ولا تخف سنعیدھا سیرتھا الاولٰی)[۳]

سورہ قصص کی آیہ ۳۱ میں ہے:

ولی مدبرا ولم یعقب یاموسٰی اقبل ولا تخف

موسیٰ اس عظیم سانپ کو دیکھ کر ڈر گئے اور پیچھے ہٹے۔ خدا نے دوبارہ اُن سے کہا اے موسیٰ! پلٹ آ اور ڈرو نہیں۔

اگرچہ یہاں موسیٰ کے ڈرنے کا مسئلہ بہت سے مفسرین کے لیے سوال کا باعث بن گیا ہے کہ یہ حالت اُس شجاعت کے ساتھ جو حضرت موسیٰؑ کے بارے میں ہمیں معلوم ہے میل نہیں کھاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے ساری عمر فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے گزاری اور اپنی شجاعت کا عملی طور پر ثبوت دیا، جبکہ یہ بات انبیاء کی شرائط کلی میں سے بھی ہے ـــــ تو پھر یہاں یہ صورت کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ بات ہر انسان کے لیے فطری ہے ـــ چاہے وہ

---

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اھش "ھش" (ھاء کی فتح کے ساتھ) کے مادہ سے درختوں کے پتوں پر مارنے اور انہیں جھاڑنے کے معنی میں ہے۔

[۲] (حاشیہ صفحہ ہذا) "مآرب" جمع ہے "مأربۃ" کی جو حاجت، نیاز اور مقصد کے معنی میں ہے۔

[۳] "سیرۃ" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، باطنی حالت کے معنی میں ہے، چاہے وہ حالت غریزی ہو یا اکتسابی۔ بعض نے یہاں ہیئت و صورت کے معنی کیے ہیں۔



Marfat.com

کتنا ہی شجاع اور نڈر ہو ــ کہ اگر وہ یہ دیکھ لے کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا اچانک ایک بہت بڑے سانپ میں بدل گیا ہے۔ اور وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگا ہے تو وہ وقتی طور پر وحشت زدہ ہوگا۔ اور خود کو اُس سے بچائے گا، سوائے اِس صورت کے کہ اس منظر کو اس کے سامنے بار بار دہرایا جائے۔ اس فطری اثر کا موسیٰ پر کسی طرح بھی اعتراض نہیں ہوسکتا، اور سورۂ احزاب کی آیہ ۳۹ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ :

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولایخشون احداً الّا اللہ

"جو لوگ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے"۔

اس کے منافی نہیں، چونکہ یہ ایک فطری زُود گزر اور وقتی وحشت ہے جو ایک ایسے حادثہ سے ہوئی ہے جس سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور جو خلافِ معمول ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے دوسرے معجزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا گیا ہے :

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں لے جا تاکہ سفید چمکدار اور روشن ہوکر باہر آئے اور اس میں کوئی عیب و نقص نہ ہوگا اور یہ تمہارے لیے ایک دُوسرا معجزہ ہے ( واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء اٰیۃ اخریٰ[1] )

اگرچہ ( واضمم یدک الی جناحک ۔۔۔ ) کے جملہ کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں لیکن سورہ قصص کی آیہ ۳۲ کی طرف توجہ کرنے سے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے :

اسلک یدک فی جیبک

اور سورہ نمل کی آیہ ۱۲ جس میں یہ بیان ہوا ہے :

وادخل یدک فی جیبک

بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ جناب موسیٰؑ کو اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالیں۔ اور اُسے بغل یا پہلو کے نیچے تک لے جائیں (کیونکہ جناح اصل میں پرندوں کے پروں کے معنی میں ہے اور یہاں ہوسکتا ہے کہ زیر بغل کے لیے کنایہ ہو)۔

"بیضا" سفید کے معنی میں ہے اور "من غیر سوء" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیرے ہاتھ کی سفیدی برص یا اُسی جیسی کسی بیماری کے اثر سے نہ ہوگی، کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کی چمک اور روشنی ہوگی، وہ ایک لمحہ کے لیے ظاہر ہوگی اور دوسرے ہی لمحہ میں غائب ہوجائے گی۔

لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں انتہائی زیادہ نورانیت پیدا ہوجاتی تھی، اگر ایسا تھا تو پھر ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ ( من غیر سوء ) کا مفہوم اس کے علاوہ بھی ہے کہ جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے یعنی اُس میں ایک ایسی

---

[1] "اٰیۃ" منصوب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا اسم ہے جو حال کی جگہ آیا ہے، اس ضمیر کا حال ہے کہ جو "تخرج" میں مستتر ہے۔



Marfat.com

بے عیب نورانیت تھی، جو نہ آنکھ کو تکلیف دیتی تھی نہ اُس کے درمیان کوئی سیاہ دھبہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی چیز تھی۔

٭ ٭ ٭

پہلی آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کو تیرے اختیار میں دے دیا ہے۔ تاکہ ہم تجھے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں (لنریك من آیاتنا الکبریٰ)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "آیاتِ کبریٰ" سے مراد وہی دو اہم معجزے ہیں کہ جن کا اُوپر ذکر آیا ہے، اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ دوسرے معجزات کی طرف اشارہ ہے جو خدا نے جناب موسیٰؑ کو بعد میں عطا فرمائے، یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے۔

٭ ٭ ٭

## چند اہم نکات:

**۱۔ دو عظیم معجزے:** اس میں شک نہیں کہ موسیٰؑ کے عصا کے ایک بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہو جانے کے بارے میں زیرِ نظر آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے یہاں تک کہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۰۷ میں اُسے "ثعبان" (اژدھا) سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی طرح ایک مختصر سے لمحہ کے لیے ہاتھ میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہونا اور پھر اس کا پہلی حالت کی طرف پلٹ جانا، یہ ایک معمولی یا نادر و کمیاب امر نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں خلافِ معمول اور معجزہ شمار ہوتے ہیں۔ جو ایک مافوق بشر قوت کے سہارے اور مدد کے سوا یعنی خدائے عظیم کی قدرت کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علم و قدرت کو بے پایاں سمجھتے ہیں وہ ان امور کا ہرگز انکار نہیں کر سکتے، اور نہ ہی مادہ پرستوں کی طرح اسے خرافات کہہ سکتے ہیں۔

معجزہ میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ عقلی طور پر محال نہ ہو اور یہ بات اس مقام پر پُورے طور سے صادق آتی ہے، کیونکہ کوئی عقلی دلیل عصا کے بہت بڑے سانپ میں تبدیل ہونے کے امکان کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔

کیا عصا اور بڑا سانپ دونوں ماضی بعید میں مٹی سے ہی پیدا نہیں ہوئے؟ یقینی طور پر شاید لاکھوں یا کروڑوں سال گزر گئے ہوں کہ جب اس قسم کی موجودات وجود میں آئی ہوں (اور اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ ہم انواع کے ثبوت کو مانیں یا اس کے ارتقا کے قائل ہوں۔ کیونکہ ہر حال میں درختوں کی لکڑی بھی مٹی سے ہی پیدا ہوئی ہے اور حیوانات بھی)۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ کام معجزانہ طور پر انجام پایا ہے کیونکہ وہ مراحل جو ہزاروں سالوں میں طے ہونے چاہئیں تھے وہ ایک لمحے اور ایک انتہائی کم اور مختصر مدت میں انجام پا گئے ہیں، کیا ایسا کام محال نظر آتا ہے؟

ممکن ہے کہ میں تو ایک ضخیم کتاب کو ہاتھ سے ایک سال میں لکھوں، اب اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے کہ وہ اعجاز کے سہارے اتنی تیزی کے ساتھ لکھے کہ وہ ایک گھنٹے یا اس سے بھی کم وقت میں لکھی جائے، تو یہ محالِ عقلی نہیں ہے، یہ خلافِ معمول ہے (غور کیجیے گا)۔

بہر حال معجزات کے بارے میں عاجلانہ فیصلے اور خدا نخواستہ ان کو خرافات کہنا منطق اور عقل سے دُور ہے، محض ایک چیز جو کبھی ایسے



Marfat.com

افکار کو جنم دیتی ہے یہ ہے کہ ہم معمول کی علت و معلول کے خوگر ہوگئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کو ایک ضرورت قرار دینے لگ گئے ہیں اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے مخالف ضرورت سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ ان طبعی اور عادی علت و معلول کی شکل ہرگز بھی ضرورت کا پہلو نہیں رکھتی اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مافوق طبیعت عامل ان میں تبدیلیاں پیدا کر دے۔[1]

**۲۔ چیزوں کی فوق العادت استعداد :** مسلمہ طور پر جس دن حضرت موسیٰؑ نے چرواہوں والی وہ لاٹھی اپنے لیے منتخب کی تھی وہ یہ نہ جانتے تھے کہ یہ سادہ سا وجود خدا کے حکم سے اتنا عظیم کام کرے گا۔ اس طرح سے کہ فرعون کی قدرت کو درہم و برہم کر کے رکھ دے گا لیکن خدا نے اُسے دکھایا کہ اسی سادہ سے وسیلے کے ذریعہ ایسی خارق العادت قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ دراصل تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ اس دُنیا میں کسی چیز کو معمولی نہ سمجھیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جن چیزوں یا افراد کو ہم حقارت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کے اندر ایک عظیم طاقت پنہاں ہوتی ہے کہ جس سے ہم بے خبر ہوتے ہیں۔

**۳۔ تورات اس بارے میں کیا کہتی ہے :** زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ نے جس وقت اپنے ہاتھ کو گریبان سے باہر نکالا تو وہ بلا کسی عیب کے سفید اور روشن تھا۔ ممکن ہے یہ جملہ اُس تعبیر کی نفی کے لیے ہو جو توریت میں تحریف شدہ دکھائی دیتا ہے چونکہ اس موجودہ تورات میں اس طرح لکھا ہے :

> اور خدا نے پھر اُس سے کہا : اب تُو اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دے لے، تو موسیٰ نے اپنے ہاتھ کو بغل میں دے لیا، اور پھر اس کو باہر نکالا، تو اس کا ہاتھ برف کی مانند مبروص تھا۔[2]

کلمۂ "مبروص" "برص" کے مادہ سے کوڑھ کے معنی میں ہے جو ایک قسم کی بیماری ہے، اور مسلمہ طور پر اس تعبیر کا اس موقع پر استعمال غلط اور ناجائز ہے۔

۲۴۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ ۝

۲۶۔ وَيَسِّرْ لِىْٓ اَمْرِىْ ۝

۲۷۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ ۝

۲۸۔ يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ ۝

۲۹۔ وَاجْعَلْ لِّىْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِىْ ۝

۳۰۔ هٰرُوْنَ اَخِى ۝

---

[1] اس کے بارے میں ہم نے جلد ۶ / ب پر بھی بات کی ہے۔

[2] تورات سفر خروج فصل : ۴ ، جلد : ۶۔



Marfat.com

۳۱۔ اُشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ۙ

۳۲۔ وَاَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۙ

۳۳۔ کَیۡ نُسَبِّحَکَ کَثِیۡرًا ۙ

۳۴۔ وَّنَذۡکُرَکَ کَثِیۡرًا ؕ

۳۵۔ اِنَّکَ کُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا ○

۳۶۔ قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی ○

## ترجمہ

۲۴۔ فرعون کے پاس جاکہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔

۲۵۔ عرض کیا، پروردگارا! میرے سینہ کو کشادہ کردے۔

۲۶۔ میرے کام کو مجھ پر آسان کردے۔

۲۷۔ اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے۔

۲۸۔ تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں۔

۲۹۔ میرے خاندان میں سے میرا ایک وزیر قرار دے۔

۳۰۔ میرے بھائی ہارون کو۔

۳۱۔ اس کے ذریعے میری کمر کو مضبوط کردے۔

۳۲۔ اور اسے میرے کام میں شریک کردے۔

۳۳۔ تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں۔

۳۴۔ اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

۳۵۔ کیونکہ تو ہمیشہ ہماری حالت سے آگاہ رہا ہے۔

۳۶۔ فرمایا: اے موسیٰ تو نے جتنی درخواستیں کیں وہ سب کی سب تجھے عطا کردی گئیں۔

## تفسیر

### موسیٰؑ کے جچے تلے تقاضے:

اب حضرت موسیٰؑ مرتبۂ نبوت پر فائز ہو چکے ہیں اور انہوں نے اہم معجزات حاصل کر لیے ہیں، لیکن اس کے بعد ان کے



Marfat.com

نام فرمانِ رسالت صادر ہوتا ہے، ایسی رسالت کہ جو بہت ہی عظیم اور سنگین ہے۔ ایسی رسالت جو علاقے کے طاقتور ترین اور خطرناک ترین لوگوں کو فرمانِ الٰہی پہنچانے سے شروع ہوتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے: فرعون کی طرف جا کہ وہ سرکش ہوگیا ہے (اذھب الی فرعون انہ طغٰی)۔

ہاں ایک فاسد اور خراب شدہ ماحول کی اصلاح اور ہر جہت سے ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے فساد کے سرغنوں اور کفر کے سربراہوں سے کام شروع کرنا چاہیئے، ایسے لوگوں سے کہ جو معاشرے کے تمام لوگوں میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور وہ خود یا اُن کے افکار و نظریات یا ان کے اعوان و انصار ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، ایسے لوگ کہ جنہوں نے تمام تبلیغی، نشریاتی، اقتصادی اور سیاسی اداروں کو اپنے قبضہ میں لیا ہوا ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہوجائے یا اصلاح نہ ہونے کی صورت میں وہ جڑ سے اُکھاڑ پھینکے جائیں تو معاشرے کی نجات کی اُمید کی جاسکتی ہے، ورنہ جس قسم کی بھی اصلاح ہوگی، وہ وقتی، سطحی اور ناپائیدار ہوگی۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ: فرعون سے شروع کرنے کے لازم ہونے کی دلیل، ایک مختصر سے جملہ "انہ طغی" (اس نے طغیان کیا ہے) میں بیان ہوئی ہے کہ اس کلمہ "طغیان" میں سب کچھ جمع ہے۔ ہاں طغیان و سرکشی بھی اور زندگی کے تمام شعبوں میں حد سے تجاوز بھی، اور اسی بنا پر اس قسم کے افراد کو "طاغوت" کہا جاتا ہے کہ جو اسی مادہ سے لیا گیا ہے۔

موسیٰؑ — اس قسم کی سنگین ماموریت پر نہ صرف گھبرائے نہیں، بلکہ معمولی سی تخفیف کے لیے بھی خدا سے درخواست نہ کی۔ اور کھلے دل سے اس کا استقبال کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس ماموریت کے سلسلے میں کامیابی کے وسائل کی خدا سے درخواست کی۔

اور چونکہ کامیابی کا پہلا ذریعہ عظیم رُوح، فکرِ بلند اور عقل توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں سینہ کی کشادگی و شرح صدر ہے لہٰذا: عرض کیا میرے پروردگار! میرا سینہ کشادہ کردے (قال رب اشرح لی صدری)۔

ہاں! ایک رہبرِ انقلاب کا سب سے اوّلین سرمایہ، کشادہ دلی، فراواں حوصلہ، استقامت و بُردباری اور مشکلات کے بوجھ کو اُٹھانا ہے۔ اسی بنا پر امیر المومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ:

اٰلۃ الریاسۃ سعۃ الصدر

سینہ کی کشادگی رہبری و قیادت کا وسیلہ ہے[1]

(شرح صدر اور اس کے مفہوم کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد ۵ میں سورہ انعام کی آیہ ۱۲۵ کے ذیل میں بھی بحث کرچکے ہیں)۔

اور چونکہ اس راستے میں بے شمار مشکلات ہیں، جو خدا کے لطف و کرم کے بغیر حل نہیں ہوتیں۔ لہٰذا خدا سے دُوسرا سوال یہ کیا کہ میرے کاموں کو مجھ پر آسان کردے اور مشکلات کو راستے سے ہٹا دے۔ آپ نے عرض کیا: میرے کام کو آسان کردے (ویسرلی امری) اس کے بعد جناب موسیٰؑ نے زیادہ سے زیادہ قوّتِ بیان کا تقاضا کیا۔ کہنے لگے میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (واحلل عقدۃ من لسانی)۔

یہ ٹھیک ہے کہ شرح صدر کا ہونا بہت اہم بات ہے، لیکن یہ سرمایہ اسی صورت میں کام دے سکتا ہے۔ جب اس کو ظاہر کرنے کی قدرت بھی کامل طور پر موجود ہو۔ اسی بنا پر جناب موسیٰؑ نے شرح صدر اور رکاوٹوں کے دُور ہونے کی درخواستوں کے بعد یہ تقاضا کیا کہ خدا ان کی زبان کی گرہ کھول دے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار حکمت ۱۷۶۔



Marfat.com

اور خصوصیت کے ساتھ اس کی علت یہ بیان کی : تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں ( یفقھوا قولی )۔

یہ جملہ حقیقت میں پہلی آیت کی تفسیر کر رہا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ زبان کی گرہ کے کھلنے سے مُراد یہ نہ تھی کہ موسیٰ کی زبان میں بچپنے میں جل جانے کی وجہ سے کوئی لکنت آگئی تھی ـــ جیسا کہ بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے ـــ بلکہ اس سے گفتگو میں ایسی رکاوٹ ہے جو سُننے والے کے لیے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے، یعنی میں ایسی فصیح و بلیغ اور ذہن میں بیٹھ جانے والی گفتگو کروں کہ ہر سننے والا میرا مقصد اچھی طرح سے سمجھ لے۔

سورہ قصص کی آیہ ۳۴ اس تفسیر کی شاہد ہے :

واخی ھارون ھوا فصح منی لسانا

میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، کہ " افصح " " فصیح " کے مادہ سے دراصل کسی چیز کے زائد باتوں سے پاک ہونے کے معنی میں ہے۔ بعد میں ایسی گفتگو ، کے لیے استعمال ہونے لگا جو فہمیدہ ، رسا ، منہ بولتی اور ہر غیر ضروری چیز سے پاک ہو۔

بہرحال ایک کامیاب رہبر و رہنما وہ ہوتا ہے کہ جو سعئ فکر اور قدرت رُوح کے علاوہ ایسی فصیح و بلیغ گفتگو کر سکے کہ جو ہر قسم کے ابہام اور نارسائی سے پاک ہو۔

نیز اس بارِ سنگین کے لیے ـــ یعنی رسالتِ الٰہی ، رہبریٔ بشر اور طاغوتوں اور جابروں کے ساتھ مقابلے کے لیے یار و مددگار کی ضرورت ہے اور یہ کام تنہا سرانجام دینا ممکن نہیں ہے لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے پروردگار سے جو چوتھی درخواست کی وہ یہ تھی: خداوندا! میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر اور مددگار قرار دے ( واجعل لی وزیرا من اھلی )۔

" وزیر " " وزر " کے مادہ سے دراصل سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور چونکہ وزیر نظام مملکت میں بہت بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں لہٰذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جانے لگا۔ نیز لفظ " وزیر " کا معاون اور یار و مددگار پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

البتہ یہ بات کہ حضرت موسیٰؑ تقاضا کر رہے ہیں کہ یہ وزیر اُن ہی کے خاندان سے ہو، اس کی دلیل واضح ہے۔ چونکہ اُس کے بارے میں معرفت اور شناخت بھی زیادہ ہوگی اور اس کی ہمدردیاں بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی۔ کتنی اچھی بات ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کو اپنا شریکِ کار بنائے کہ جو رُوحانی اور جسمانی رشتوں کے حوالے سے اُس سے مرلوط ہو۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد خصوصی طور پر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا : یہ ذمّہ داری میرے بھائی ہارون کے سپرد کر دے۔ ( ھارون اخی )۔

ہارونؑ بعض مفسرین کے قول کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی تھے اور اُن سے تین سال بڑے تھے۔ بلند قامت، فصیح البیان اور اعلیٰ علمی قابلیت کے مالک تھے۔ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی وفات سے تین سال پہلے رحلت فرمائی۔ [1]

وہ پیغمبر مرسل تھے جیسا کہ سُورہ مومنون کی آیہ ۴۵ میں بیان ہوا ہے :

---

[1] مجمع البیان ، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



Marfat.com

ثم ارسلنا موسٰی واخاہ ھارون بایاتنا و سلطان مبین

اور وہ نور اور باطنی روشنی کے بھی حامل تھے، اور حق و باطل میں خوب تمیز بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء کی آیہ ۴۸ میں بیان ہوا ہے:

ولقد اٰتینا موسٰی و ھارون الفرقان وضیاءً

آخری بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسے پیغمبر تھے جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے موسٰی کو بخشا تھا:

و وھبنا لہ من رحمتنا اخاہ ھارون نبیًا (مریم - ۵۳)

وہ اس بھاری ذمہ داری کی انجام دہی میں اپنے بھائی موسٰی کے دوش بدوش مصروف کار رہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسٰی نے اس اندھیری رات میں، اس وادیٔ مقدس کے اندر، جب خدا سے فرمان رسالت کے ملنے کے وقت یہ تقاضا کیا، تو وہ اُس وقت دس سال سے بھی زیادہ اپنے وطن سے دُور گزار کر آرہے تھے، لیکن اصولی طور پر اس عرصہ میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ ان کا رابطہ کامل طور پر منقطع نہ ہوا۔ اسی لیے اس صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور خدا کی درگاہ سے اس عظیم مشن میں اس کی شرکت کے لیے تقاضا کر رہے ہیں۔

اس کے بعد جناب موسٰیؑ ہارونؑ کو وزارت و معاونت پر متعین کرنے کے لیے اپنے مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں: خداوندا! میری پُشت اس کے ذریعے مضبوط کردے۔ (اشدد بہ ازری)۔

"ازر" دراصل "ازار" کے مادہ سے لباس کے معنی میں لیا گیا ہے، خاص طور پر اس لباس کو کہا جاتا ہے جس کے بند کی کمر میں گرہ لگائی جاتی ہے۔ اسی سبب سے کبھی یہ لفظ "کمر" پر یا "قوت" و "قدرت" کے معنی میں بھی آتا ہے۔

❊ ❊ ❊

اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ تقاضا کرتے ہیں: اسے میرے کام میں شریک کردے (واشرکہ فی امری)۔

وہ مرتبہ رسالت میں بھی شریک ہو اور اس عظیم کام کو روبہ عمل لانے میں بھی شرکت کرے۔ البتہ حضرت ہارون ہر حال میں تمام پروگراموں میں جناب موسٰیؑ کے پیرو تھے اور موسٰیؑ ان کے امام و پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔

آخر میں اپنی تمام درخواستوں کا نتیجہ اس طرح بیان کرتے ہیں: تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں (کی نسبحک کثیرًا)۔

اور تجھے بہت بہت یاد کریں (و نذکرک کثیرًا)

کیونکہ تُو ہمیشہ ہی ہمارے حالات سے آگاہ رہا ہے (انک کنت بنا بصیرًا)۔

تو ہماری ضروریات و حاجات کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس راستے کی مشکلات سے ہر کسی کی نسبت زیادہ آگاہ ہے۔ ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرمان کی اطاعت کی قدرت عطا فرما دے اور ہمارے فرائض، ذمہ داریوں، اور فرائض کے انجام دینے کے لیے ہمیں توفیق اور کامیابی عطا فرما۔

چونکہ جناب موسٰیؑ کا اپنے مخلصانہ تقاضوں میں سوائے زیادہ سے زیادہ اور کامل تر خدمت کے اور کچھ مقصد نہیں تھا، لہٰذا خدا نے ان کے تقاضوں کو اسی وقت قبول کر لیا: "اُس نے کہا: اے موسٰیؑ! تمہاری تمام درخواستیں قبول ہیں" (قال قد اوتیت سؤلک یاموسٰی)۔



Marfat.com

حقیقت میں ان حساس اور تقدیر ساز لحات میں چونکہ موسیٰؑ پہلی مرتبہ خدائے عظیم کی بساطِ مہمانی پر قدم رکھ رہے تھے۔ لہٰذا جس جس چیز کی انہیں ضرورت تھی ان کا خدا سے اکٹھا ہی تقاضا کر لیا، اور اُس نے بھی مہمان کا انتہائی احترام کیا، اور اس کی تمام درخواستوں اور تقاضوں کو ایک مختصر سے جملے میں حیات بخش ندا کے ساتھ قبول کر لیا اور اس میں کسی قسم کی قید و شرط عائد کی اور موسیٰؑ کا نام مکرر لاکر، ہر قسم کے ابہام کو دور کرتے ہوئے اس کی تکمیل کر دی' یہ بات کس قدر شوق انگیز اور افتخار آفرین ہے کہ بندے کا نام مولا کی زبان پر بار بار آئے۔

## چند اہم نکات:

۱۔ **انقلاب کی رہبری کی شرائط** : اس میں شک نہیں کہ انسانی معاشروں میں بنیادی تبدیلیاں، اور مادی اور شرک آلود قدروں کی معنوی اور انسانی قدروں میں تبدیلی، خاص طور پر ایسے مقام پر کہ جس کا راستہ فرعونوں اور خود سر لوگوں کی قلمرو سے ہو کر گزرتا ہو، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایسا کام رُوحانی و جسمانی آمادگی، قدرتِ فکر اور قوتِ بیان راستے سے آگاہی، خدائی امداد نیز قابلِ اطمینان اور بہادر یار و مددگار کا محتاج ہوتا ہے۔

یہ وہی امور ہیں جن کا حضرت موسیٰؑ نے اس عظیم رسالت کے آغاز میں ہی خدا سے تقاضا کیا۔

یہ امور خود یہ بات واضح کرتے ہیں کہ موسیٰؑ نبوت سے پہلے بھی بیدار اور آمادہ رُوح رکھتے تھے اور یہ امور اس حقیقت کو بھی واضح کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے ہر جہت سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان حالات میں کن ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیئے تاکہ فرعونی نظام کے ساتھ مقابلے کی طاقت موجود ہو۔

اور یہ ہر زمانے میں، تمام خدائی رہبروں اور اس راستے کے تمام راہ رو افراد کے لیے ایک نمونہ ہے۔

۲۔ **سرکشوں کے خلاف جنگ** : اس میں شک نہیں کہ فرعون میں بہت سی انحرافی باتیں موجود تھیں۔ وہ کافر تھا، بُت پرست تھا، ظالم اور بیداد گر تھا، وغیرہ وغیرہ لیکن قرآن نے ان تمام انحرافات میں سے صرف اس کے "طغیان" کا ذکر کیا ہے' : (انه طغى) کیونکہ خدا کے فرمان سے طغیان اور سرکشی کی رُوح ان تمام انحرافات کا نچوڑ اور ان سب باتوں کی جامع ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء کا ہدف و مقصد طاغوتوں اور مستکبرین سے مقابلہ ہوتا ہے اور مارکسسٹ مذہب کا جو تجزیہ کرتے ہیں یہ بات اس کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ وہ مذہب کو طغیان گروں اور استعمار پیشہ لوگوں کا خدمت گار سمجھتے ہیں۔

ممکن ہے ان کی یہ باتیں خود ساختہ، غیر معقول مذاہب کے بارے میں صحیح ہوں۔ لیکن سچے انبیاء کی تاریخ، مذاہب آسمانی کے بارے میں ان کے بے ہودہ خیالات کی پُوری صراحت کے ساتھ سو فیصد نفی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں موسیٰ بن عمران کا قیام خاص طور پر ایک شاہد ناطق ہے۔

۳۔ **ہر کام کے لیے پروگرام اور وسائل کی ضرورت ہے** : حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا یہ حصہ ہمیں جو دوسرا سبق دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین تک بھی اپنے کاموں کی پیش رفت کے لیے اتنے معجزات رکھنے کے باوجود عام وسائل سے مدد لیتے تھے۔ مؤثر اور بیانِ رسا کے ذریعہ بھی اور معاونین کی فکری و جسمانی قوت و طاقت سے بھی۔



Marfat.com

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم زندگی میں ہمیشہ معجزات کی انتظار میں رہیں بلکہ پروگرام اور وسائل کار کو تیار کرنا چاہیئے۔ اور طبیعی طریقوں سے پیش رفت کو جاری رکھنا چاہیئے اور جہاں کاموں میں رکاوٹ پڑ جائے تو وہاں خدائی لطف و کرم کا انتظار کرنا چاہیئے۔

۴۔ **تسبیح اور ذکر :** جیسا کہ زیرِ نظر آیات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی درخواستوں کا اصلی مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ: تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں۔

یہ بات واضح ہے کہ "تسبیح" کے معنی خدا کو "شرک اور امکانی نقائص" کی تہمت سے منزّہ و مبرّا قرار دینا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جناب موسیٰؑ کی مراد یہ نہ تھی کہ "سبحان اللہ" کے جملے کی سلسل تکرار کرتے رہیں بلکہ اصل مقصد اس زمانہ کے آلودہ معاشرے میں اس کی حقیقت کو رُو بہ عمل لانا تھا یعنی بتوں کو ختم کرنا، بُت خانوں کو ویران کرنا، ذہنوں کو شرک آلود افکار سے پاک کرنا اور مادّی و معنوی نقائص کو دُور کرنا۔ یہ تھی ان کے نزدیک تسبیح اور یہ تھا ان کے قرین ذکرِ الٰہی۔ اس راستے سے گزر کردہ ذکرِ خدا، اس کی یاد اور اس کی صفات کی یاد دلوں میں زندہ کرنا چاہتے تھے اور صفاتِ خداوندی کو معاشرے، پر سایہ فگن کرنا چاہتے تھے۔ لفظ "کثیراً" کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اسے عمومی شکل دینا چاہتے تھے اور ایک محدود دائرے میں مخصوص رہنے سے نکالنا چاہتے تھے۔

۵۔ **پیغمبر اسلامؐ بھی موسیٰؑ کے تقاضوں کی تکرار کرتے ہیں :** ان روایات سے کہ جو علمائے اہلسنت کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں اور شیعہ علما کی کتابوں میں بھی وارد ہوئی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بھی انہی وسائل کی، جو حضرت موسیٰؑ نے اپنے مقاصد کی پیش رفت کے لیے خدا سے چاہے تھے، تمنا کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آپؐ نے ہارونؑ کے نام کی جگہ علی علیہ السلام کا نام لیا اور اس طرح عرض کیا:

"اللّٰھم انی اسألك بما سألك اخی موسٰی ان تشرح لی صدری و ان تیسر لی امری، وان تحل عقدۃ من لسانی، یفقھوا قولی، واجعل لی وزیرا من اھلی، علیا اخی، اشدد بہ ازری، واشرکہ فی امری کی نسبحك کثیرا ونذکرك کثیرا، انك کنت بنا بصیرا

پروردگارا! مَیں بھی تجھ سے وہی سوال کرتا ہوں جس کا میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے تقاضا کیا تھا، مَیں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ تُو میرے سینے کو کُشادہ رکھ، کاموں کو مجھ پر آسان کر دے، میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری باتوں کو سمجھیں، میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک وزیر قرار دے، میرے بھائی علی (علیہ السلام) کو، خداوندا میری پُشت کو اس کے ذریعے مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں کیونکہ تُو ہمارے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے۔"

اس حدیث کو سیوطی نے تفسیر درالمنثور میں اور مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور بہت سے دُوسرے سُنّی و شیعہ بزرگ علماء نے کچھ تفاوت کے ساتھ نقل کیا ہے۔



Marfat.com

اسی حدیث سے مشابہ حدیث منزلت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا :

" الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی الا انہ لا نبی بعدی "

کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسٰی سے تھی ، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

یہ حدیث جو اہل سنت کی پہلے درجے کی کتب میں بیان ہوئی ہے اور (تفسیر المیزان کے مطابق) محدث بحرانی نے اپنی کتاب "غایت المرام" میں اہل سنت کے طرق سے سو طریقوں سے اور شیعہ طرق سے ستر طریقوں سے نقل کیا ہے، اس قدر معتبر ہے کہ اس میں کسی قسم کے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہم نے حدیث منزلت کے بارے میں تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کی آیہ ۱۴۲ کے ذیل میں کافی بحث کی ہے۔

لیکن جس بات کا ذکر کرنا ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ بعض مفسرین نے (جیسا کہ آلوسی نے رُوح المعانی میں) اصل روایت کو قبول کرنے کے ساتھ اس کی دلالت میں اعتراض کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جملہ (و اشرکہ فی امری) اُس کو میرے کام میں شریک کر دے ، لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے کے کاموں میں شرکت کرنے کے سوا اور کسی چیز کو ثابت نہیں کرتا۔"

لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ مسئلہ ہدایت و ارشاد میں شرکت ، اور دوسرے لفظوں میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور حق کی دعوت کو پھیلانا ہر مسلمان کا فرداً فرداً فریضہ ہے ، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، علی علیہ السلام کے متعلق مانگتے ، یہ تو ایک توضیح واضح ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا کی ہرگز یہ تفسیر نہیں کی جا سکتی ۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سے امر نبوت میں شرکت بھی مراد نہیں تھی۔ بنا بریں ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ نبوت کے علاوہ اور ارشاد و ہدایت کے عمومی فریضہ کے سوا کوئی اور خاص مقام و منصب تھا۔ تو کیا یہ ولایت خاصہ کے مسئلہ کے سوا کوئی اور چیز ہو سکتی ہے ؟ کیا یہ وہی خلافت (ایک خاص مفہوم میں جس کے شیعہ قائل ہیں) نہیں ہے ؟ اور لفظ " وزیراً " بھی اسی کی تائید اور تقویت کرتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں کچھ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ جو تمام لوگوں کا کام نہیں ہے اور وہ دین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر قسم کی تحریف و انحراف سے بچانا اور اس کی حفاظت کرنا اور دین کے مفاہیم کے بارے میں ہر قسم کے ابہام کی جو بعض کو لاحق ہو جاتا ہے، تفسیر کرنا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبت میں اور ان کے بعد اُمت کی رہبری کرنا اور پیغمبر اکرمؐ کے مقاصد کی پیش رفت کے لیے انتہائی مؤثر طریقہ سے کمک اور مدد کرنا ہے ۔ یہ سب کی سب وہی چیزیں ہیں کہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے " اشرکہ فی امری " کا جملہ کہہ کر خدا سے علیؑ کے بارے میں مانگی تھیں۔

اور اس سے یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ ہارونؑ کا موسٰیؑ سے پہلے وفات پا جانا اس بحث میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ خلافت و جانشینی کبھی تو رہبر کی غیبت کے زمانے میں ہوتی ہے جیسا کہ ہارونؑ موسٰیؑ کی غیبت میں ان کے خلیفہ و جانشین تھے اور کبھی راہبر کی وفات کے بعد ہوتی ہے جیسا کہ علی علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جانشین ہوتے ۔ دونوں ایک ہی قدر مشترک اور ایک ہی قدر جامع رکھتے ہیں اگرچہ ان کے مصداق مختلف ہیں (غور کیجئے گا)۔



Marfat.com

۳۷۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۝

۳۸۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۝

۳۹۔ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ
يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۚ وَلِتُصْنَعَ
عَلَىٰ عَيْنِي ۝

۴۰۔ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنَاكَ
إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ
وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ
يَا مُوسَىٰ ۝

۴۱۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝

## ترجمہ

۳۷۔ اور ایک مرتبہ اور بھی ہم نے تم پر احسان کیا تھا۔

۳۸۔ اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ وحی کی تھی جس کی ضرورت تھی۔

۳۹۔ کہ تم اسے صندوق میں ڈال دو اور اس صندوق کو دریا میں بہادو تو دریا اسے کنارے پر جا لگائے گا (وہاں سے) میرا دشمن



Marfat.com

اور اس کا دشمن اُسے اُٹھائے گا اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی تھی تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش کیے جاؤ۔

۴۰۔ اس وقت جبکہ تیری بہن (فرعون کے محل کے پاس) چل رہی تھی، اور کہہ رہی تھی۔ کیا میں تمہیں ایک ایسے گھر کی نشاندہی کروں جو اِس نومولود بچے کی کفالت کرے۔ (اور وہاں اس کے لیے ایک اچھی دایہ ہے) تو پھر ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں تجھ سے ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہو اور تُو نے (فرعونیوں میں سے) ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تجھے غم واندوہ سے نجات دی، اور تمہیں ہر طرح سے آزمایا۔ اس کے بعد تُو کئی سال مدین کے لوگوں کے درمیان رہا پھر ایک معین وقت پر (فرمانِ رسالت کے حصول کے لیے) تُو اس جگہ آیا۔

۴۱۔ اور مَیں نے تیری اپنے لیے پرورش کی۔

# تفسیر

## کتنا مہربان خدا ہے!

ان آیات میں خدا حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ان کے بچپن کے دور اور فرعونیوں کے غیض وغضب سے معجزانہ طور پر نجات پانے سے متعلق ہے۔ اگرچہ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے یہ حصۂ زندگی، رسالت ونبوّت کے زمانے سے پہلے تھا لیکن چونکہ موسیٰؑ پر خدا کی نعمتوں کا، موسیٰؑ کی آغازِ عمر سے بیان ہو رہا تھا۔ لہٰذا اہمیت کے اعتبار سے اسے موضوعِ رسالت سے دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے موسیٰ! ہم نے تجھ پر ایک مرتبہ پہلے بھی احسان کیا تھا اور تجھ کو اپنی نعمتوں سے نوازا تھا (ولقد مننا علیك مرة اخرٰی)[1]

اس اجمال کے ذکر کے بعد اس کی تفصیل شروع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اس وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو وہ وحی کی تھی جس وحی کی اس وقت ضرورت تھی:

(إذ أوحينا الٰى امك ما يوحٰى)۔

---

[1] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ لفظ "منت" اصل میں "من" سے لیا گیا ہے۔ اور یہ اُن بڑے بڑے پتھروں کے معنی میں ہے کہ جن کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہر گراں بہا نعمت بخشنے کو منت کہتے ہیں، اور زیر بحث آیت میں یہی معنی مراد ہے اور اس کا یہ مفہوم ایک پسندیدہ اور عمدہ مفہوم ہے لیکن اگر کوئی اپنے چھوٹے کام کو باتوں سے بڑا بنائے اور دوسرے پر احسان جتلائے تو یہ ایک بُرا کام ہے اور منت کا قابلِ مذمت مصداق ہے۔



Marfat.com

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس روز، موسیٰ کے فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے لیے جس قدر رہنمائی کی ضرورت تھی وہ سب ہم نے موسیٰ کی ماں کو تعلیم کر دی تھی۔

کیونکہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو بڑی سختی کے ساتھ دبایا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دو اور لڑکیوں کو کنیزی کے لیے باقی رکھو۔ اس نے یہ حکم بنی اسرائیل کی قوت اور ان کی شورش کے احتمال سے بچنے کے لیے دے رکھا تھا یا مورخین اور مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اس بچے کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے کہ جس کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی ہوئی تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے اُٹھے گا، اور فرعون کا تخت حکومت اُلٹ کے رکھ دے گا۔

فرعون کے جاسوس بنی اسرائیل کے محلوں اور گھروں کی سختی کے ساتھ نگرانی کیا کرتے تھے اور لڑکوں کی پیدائش کی اطلاع دارالحکومت کو دیا کرتے تھے اور وہ بھی بہت جلد انہیں ہلاک کر دیا کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایک طرف تو فرعون یہ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی قوت کو ختم کر کے رکھ دے اور دوسری طرف ان کی نسل کے کلی طور پر خاتمہ پر بھی آمادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے لیے مہیا غلاموں کا کام دیتے تھے، لہٰذا اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایک سال کے پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رکھیں اور دوسرے سال کے لڑکوں کو تہ تیغ کر دیں۔ اتفاق سے موسیٰ اس سال پیدا ہوئے جو لڑکوں کے قتلِ عام کا سال تھا۔

بہرحال ماں نے محسوس کیا کہ اس کے نولود بچے کی جان خطرے میں ہے اور اسے وقتی طور پر مخفی رکھنے سے بھی مشکل حل نہیں ہوگی۔ ایسے وقت میں اُس خدا نے کہ جس نے اس بچے کو ایک عظیم قیام کے لیے نامزد کیا ہوا ہے، اس ماں کے دل میں الہام کیا کہ اسے اب ہمارے حوالے کر دو اور دیکھتی رہو کہ ہم اس کی کس طرح حفاظت کریں گے اور اسے تیری طرف واپس لوٹا دیں گے۔

موسیٰؑ کی ماں کے دل پر یہ الہام ہوا: "تم اسے ایک صندوق میں ڈال دو اور صندوق کو دریا میں ڈال دو": (ان اقذفیه فی التابوت فاقذفیه فی الیم)۔

"یم" یہاں پر عظیم دریائے نیل کے معنی میں ہے کہ جس کی وسعت اور بہت زیادہ پانی کی وجہ سے کبھی اس پر سمندر کا اطلاق ہوتا ہے۔

"اقذفیه فی التابوت" (اس کو تابوت میں ڈال دو) کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی قسم کے خوف اور وہم کے بغیر دل کو مطمئن رکھو اور پوری جرأت و استقامت سے اُسے صندوق میں رکھ دو اور کسی قسم کی پروا کیے بغیر اسے دریائے نیل میں پھینک دو" اور کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔

لفظ "تابوت" لکڑی کے صندوق کے معنی میں ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اُس صندوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں مُردوں کو رکھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جو بعض اوقات دوسرے صندوقوں پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ طالوت و جالوت کے واقعہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ٢٤٨ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: دریا اس بات پر مامور ہے کہ اس کو ساحل پر ڈال دے تاکہ آخرکار میرا دشمن بھی اور اس کا

---

[1] تفسیر نمونہ کی دوسری جلد، ص ١٣٩ (اردو ترجمہ) ——— کی طرف رجوع کریں۔



Marfat.com

دشمن بھی اسے اُٹھائے (اور اپنے دامن میں اس کی پرورش کرے) (فلیلقه الیم بالساحل یأخذه عدو لی وعدو له)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر لفظ "عدو" مکرر آیا ہے اور یہ درحقیقت فرعون کی خدا کے بارے میں بھی اور موسٰی اور بنی اسرائیل کے بارے میں بھی دشمنی پر ایک تاکید ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دشمنی اور عداوت میں اس حد تک پہنچا ہوا تھا اسی نے موسٰی کی خدمت اور پرورش اپنے ذمہ لے لی تاکہ خاکی بشر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ نہ صرف یہ کہ وہ فرمانِ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی قدرت نہیں رکھتا، بلکہ خدا اس کے دشمن کی اسی کے ہاتھوں سے اور اُسی کے دامن میں پرورش کروا سکتا ہے۔

اور جس وقت خدا ظالم سرکشوں کی نابودی کا ارادہ کرے، تو انہیں اُنہیں کے ہاتھوں سے نابود کردے اور جو آگ اُنہوں نے خود جلائی ہے اُسی کے ذریعے اُن کو جلا کر رکھ دے، کیسی عجیب قدرت کا مالک ہے وہ!

موسٰی کو اس نشیب و فراز سے پُر راستے میں ایک ڈھال کی ضرورت تھی لہٰذا خدا نے اپنی محبت کا سایہ اُن پر ڈال دیا۔ اس طرح سے کہ جو بھی انہیں دیکھے ان کا فریفتہ اور گرویدہ ہو جائے۔ نہ صرف یہ کہ ان کے قتل کیے جانے پر راضی نہ ہو بلکہ وہ اس بات پر بھی راضی نہ ہو کہ ان کا کوئی بال بھی بیکا ہو جائے، جیسا کہ قرآن ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

میں نے اپنی طرف سے تیرے اُوپر محبت ڈال دی (والقیت علیك محبة منی)۔

کتنی عجیب و غریب ڈھال ہے کہ جو بالکل دکھائی نہیں دیتی، لیکن فولاد اور لوہے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔

کہتے ہیں کہ موسٰیؑ کی دایہ آلِ فرعون میں سے تھی، اور اس کا یہ پکا ارادہ تھا کہ اس کی ولادت کی خبر جا کر فرعون کے دربار میں جا کر دے، لیکن جب اس کی نگاہیں پہلی مرتبہ نومولود کی آنکھوں پر پڑیں، تو اسے ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک بجلی کوندگئی ہو جس نے دایہ کے دل کو روشن و منوّر کر دیا اور وہ موسٰیؑ کی فریفتہ ہوگئی اور ہر قسم کا بُرا ارادہ اس کے دماغ سے نکل گیا۔

اس سلسلے میں ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

> جب موسٰی پیدا ہوئے اور ان کی والدہ نے دیکھا کہ یہ نومولود لڑکا ہے تو اُن کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اس پر دایہ نے پوچھا کہ تیرا رنگ اس طرح سے کیوں زرد ہوگیا تو: اُنہوں نے کہا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ میرے بیٹے کا سر قلم کر دیا جائے گا، لیکن دایہ نے کہا: تم ہرگز اس قسم کا خوف نہ کرو۔
>
> وکان موسٰی لا یراه احد الا احبه
>
> موسٰی کی حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا ان سے محبت کرنے لگ جاتا تھا۔[1]

اور یہی محبت کی وہ ڈھال تھی کہ جس نے ان کی فرعون کے دربار میں بھی پوری طرح حفاظت کی۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، اس سے مقصد یہ تھا کہ تُو میرے حضور میں اور میرے ہی علم کی نگاہوں کے سامنے پرورش پائے (ولتصنع علی عینی)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آسمان و زمین کا کوئی بھی ذرہ خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور سب اُس کی بارگاہ میں حاضر ہیں لیکن یہ تعبیر

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳، ص ۳۷۸۔



Marfat.com

اس جگہ ایک خاص عنایت کی طرف اشارہ ہے کہ جو خدا نے حضرت موسیٰؑ پر ان کی پرورش کے سلسلے میں کی۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "ولتصنع علی عینی" کو حضرت موسیٰؑ کی شیر خواری وغیرہ کے زمانے تک محدود سمجھا ہے لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی پرورش و تربیت اور موسیٰ کا پروردگار کی خاص عنایت سے پرچم رسالت اٹھانے کے لائق اور اہل بننا تک شامل ہے۔

٭ ٭ ٭

ان آیات اور قرآن مجید کی ان ہی جیسی دوسری آیات میں موجود قرائن سے اور روایات و تواریخ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ موسیٰؑ کی ماں نے آخرکار وحشت و پریشانی کے ساتھ اس صندوق کو کہ جس میں موسیٰؑ کو رکھا گیا تھا، دریائے نیل میں ڈال دیا اور نیل کی موجوں نے اسے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا، ماں جو اس منظر کو دیکھ رہی تھی، وہ غم اور حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔ لیکن خدا نے اس کے دل میں الہام کیا، کہ تم اپنے دل میں کسی قسم کا غم نہ کرو، ہم بالآخر اُسے صحیح و سالم تیری طرف لوٹا دیں گے۔

فرعون کا محل دریائے نیل کے ایک کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس عظیم دریا کی ایک شاخ اس کے محل کے اندر سے گزرتی تھی پانی کی موجیں موسیٰؑ کی نجات کے صندوق کو اپنے ساتھ اس شاخ کی طرف کھینچ لائیں۔ اس وقت فرعون اور اس کی بیوی پانی کے کنارے دریا کی لہروں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اچانک اِس پُراسرار صندوق نے ان کی توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ فرعون نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ صندوق کو پانی سے نکال لائیں۔ جب صندوق کو کھولا گیا تو انہوں نے انتہائی تعجب کے ساتھ اس میں ایک خوبصورت نومولود بچے کو دیکھا۔ اور یہ ایسی چیز تھی کہ جس کا انہیں گمان تک بھی نہ تھا۔

فرعون کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ نومولود بچہ ضروری طور پر بنی اسرائیل میں سے ہے جو مامورین دربار کے خوف سے اس قسم کے انجام سے دوچار ہوا ہے، لہٰذا اس نے اس کے قتل کرنے کا حکم دے دیا لیکن اس کی بیوی جو بانجھ تھی وہ بچے کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور ایک ایسی پُراسرار شعاع اس نومولود بچہ کی آنکھ سے نکلی جو اُس عورت کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اور اسے اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا لیا۔ اس نے فرعون کا دامن پکڑ لیا وہ کہہ رہی تھی یہ بچہ تو آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اُس نے تقاضا کیا کہ وہ اِس بچے کے قتل سے باز آجائے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس نے درخواست کی کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں اور اسے اپنے مستقبل کی اُمیدوں کے سرمایہ کے طور پر اپنے دامن میں پروان چڑھائیں۔ آخرکار وہ بڑے اصرار سے اپنی بات کو بادشاہ کے دل میں بٹھانے میں کامیاب ہوگئی۔

دُوسری طرف بچے کو بھوک لگ گئی۔ وہ دُودھ کے لیے بے چین تھا، رو رہا ہے، آنسو بہا رہا ہے۔ فرعون کی بیوی سے اس کے آنسو دیکھے نہ گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ملازمین دربار جتنا جلدی ہو سکے دایہ کی تلاش میں نکلیں لیکن وہ جس دایہ کو بھی لے کر آئے، نومولود نے اس کا دُودھ پینے سے انکار کر دیا کیونکہ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا، کہ وہ اپنی ہی ماں کے پاس لوٹ کر جائے۔ ملازمین دربار پھر تلاش کے لیے نکلے، اور کسی اور دایہ کو لانے کے لیے در بدر مارے مارے پھرنے لگے۔

اب ہم باقی داستان آیات کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

ہاں! اے موسیٰ ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ تم ہماری (علم کی) نگاہوں کے سامنے پرورش پاؤ، "اس وقت جب کہ تمہاری بہن (فرعون کے محل کے پاس سے) چلی جارہی تھی اور ماں کے حکم کے مطابق تیرے حالات کی نگرانی کر رہی تھی" (اذ تمشی اختک)۔



Marfat.com

وہ فرعون کے مامورین سے کہنے لگی : کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا تعارف کراؤں، جو اس نومولود کی سرپرستی کر سکے ( فتقول ھل ادلکم علی من یکفلہ )۔

اور شاید اُس نے یہ بھی کہا کہ اس عورت کا دودھ پاک و پاکیزہ ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ یہ نومولود بچہ اس کا دودھ پی لے گا۔

مامورینِ دربار اس پر بہت خوش ہوئے اور اس اُمید پر کہ شاید جس کی اُنہیں تلاش ہے، اس طریقے سے وہ مل جائے، اس کے ساتھ چل پڑے ۔ موسیٰؑ کی بہن جو خود کو ایک اجنبی ظاہر کر رہی تھی اس نے ماں کو ساری سرگزشت سے آگاہ کیا ، ماں بھی اپنے ہوش حواس کو قائم رکھتے ہوئے ، محبت اور اُمید کا ایک طوفان دل میں لیے فرعون کے دربار میں آپہنچی۔ اُنہوں نے بچہ اس کی گود میں ڈال دیا بچے نے ماں کی خوشبو سونگھی۔ آشنا خوشبو - اچانک اس کے پستان کو جان شیریں کی طرح پکڑ لیا اور انتہائی شوق اور رغبت کے ساتھ دودھ پینے میں مشغول ہوگیا۔ حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اور فرعون کی بیوی کی آنکھیں بھی خوشی اور شوق سے چمک اٹھیں ۔

بعض کہتے ہیں کہ فرعون کو اس واقعے پر تعجب ہوا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے کہ اس نومولود بچے نے تیرا دودھ قبول کرلیا ہے، جب کہ دوسری تمام عورتوں کو اُس نے رد کر دیا تھا ؟ ماں نے جواب دیا کہ میں ایک ایسی عورت ہوں جس میں پاکیزہ خوشبو ہے اور میرا دودھ بہت اچھا ہے اور کوئی بچہ میرا دودھ رد نہیں کرتا ۔

بہر حال فرعون نے بچے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس کی بیوی نے اس کی حفاظت و نگرانی کی بہت زیادہ تاکید کی اور اسے حکم دیا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بچہ اسے دکھانے کے لیے لایا کرے ۔

اس مقام پر قرآن کہتا ہے، : ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس لوٹا دیا ، تاکہ اس کی آنکھیں تیری وجہ سے ٹھنڈی رہیں، اور اس کے دل میں کوئی غم نہ آنے پائے : ( فرجعناك الی امك کی تقر عینھا ولا تحزن )۔

اور پوری دلجمعی اور آلِ فرعون کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے، اطمینان کے ساتھ بچے کی پرورش کر سکے ۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ فرعون نے بچے کو ماں کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اُسے اپنے گھر لے جائے لیکن فطری طور پر ایسا بچہ جو فرعون کا منہ بولا بیٹا بن گیا ہو اور اس کی بیوی اُسے بہت ہی زیادہ چاہتی ہو اس کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُنہیں دکھانے کے لیے لانا ضروری تھا ۔

سالہا سال گزر گئے اور موسیٰؑ نے خدا کے لطف و محبت کے سائے اور امن و امان کے ماحول میں پرورش پائی اور رفتہ رفتہ وہ جوان ہونے لگے ۔

ایک دن موسیٰ ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ دو آدمیوں کو اپنے سامنے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک بنی اسرائیل میں سے تھا اور دوسرا قبطیوں ( مصریوں اور فرعون کے ہوا خواہوں ) میں سے بنی اسرائیل ہمیشہ ہی ظالم قبطیوں کے دباؤ اور تشدد کا شکار رہے تھے ان میں سے بھی مظلوم بنی اسرائیل میں سے تھا ۔ حضرت موسیٰ اس کی مدد کے لیے لپکے اور اُس کا دفاع کرتے ہوئے ایک زوردار مُکا قبطی کو رسید کیا لیکن مظلوم کے دفاع میں یہ ( مُکا ) کسی نازک جگہ پر جا لگا ، اور اس ایک مُکے سے قبطی کا کام تمام ہوگیا ۔

موسیٰؑ اس واقعے سے پریشان ہوگئے ۔ چونکہ بالآخر فرعون کے مامورین کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ قتل کس کے ہاتھوں ہوا ہے ۔ لہذا وہ بڑی شدت کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکل پڑے ۔



Marfat.com

لیکن حضرت موسیٰؑ اپنے بعض دوستوں کی نصیحت کے مطابق، پوشیدہ طور پر مصر سے باہر نکل گئے اور مدین کی طرف چل پڑے۔ وہاں حضرت شعیبؑ پیغمبر کے پاس امن و امان کا ایک ماحول مل گیا — جس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ قصص کی تفسیر میں آئے گی —

اس مقام پر قرآن کہتا ہے: تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور غم و اندوہ میں ڈوب گیا، لیکن ہم نے تجھے اس غم و اندوہ سے نجات بخشی (وقتلت نفسًا فنجیناك من الغم)۔

اس کے بعد "ہم نے تجھے حادثات کے ذریعہ یکے بعد دیگرے آزمایا" (وفتناك فتونًا)۔

پھر تو سالہا سال مدین کے لوگوں میں ٹھہرا رہا: (فلبثت سنین فی اهل مدین)۔

یہ طولانی راستہ طے کرنے اور روحانی و جسمانی طور پر آمادہ ہونے اور حادثات کے طوفانوں سے کامیابی و کامرانی کے ساتھ باہر نکلنے کے بعد "تو اس زمانہ میں کہ جو فرمان رسالت لینے کے لیے مقدر تھا یہاں آیا" (ثم جئت علی قدر یا موسٰی)۔

لفظ "قدر" بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق اس زمانے کے معنی میں ہے کہ جس میں حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ وہ رسالت پر مبعوث کیے جائیں، لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے "مقدار" کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ بعض قرآنی آیات میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے (مثلاً حجر - ۲۱) اس تفسیر کے مطابق جملے کا معنی اس طرح ہوگا: اے موسیٰ! تو — بہت سے نشیب و فراز اور طرح طرح کے امتحانات کے بعد اور شعیب جیسے عظیم پیغمبر کے جوار میں طویل مدت گزار کر پرورش پانے کے بعد آخرکار اس قدر و مقام اور شخصیت کا مالک بن گیا کہ وحی کے قبول کرنے کے لائق ہو گیا۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: میں نے تجھے اپنے لیے پرورش کیا اور بنایا سنوارا ہے: (واصطنعتك لنفسی)۔ میں نے تیری پرورش وحی حاصل کرنے کی سنگین ذمہ داری کے لیے، رسالت قبول کرنے کے لیے اور اپنے بندوں کی ہدایت و رہبری کے لیے کی ہے اور میں نے تجھے حادثات کی کٹھالیوں میں آزمایا ہے، تجھے قوت و طاقت عطا کی ہے اور اب جبکہ یہ عظیم ذمہ داری تیرے کندھے پر ڈالی جا رہی ہے تو تو ہر طرح سے تیار ہو چکا ہے، اور بنایا سنوارا جا چکا ہے۔

"اصطناع" "صنع" کے مادہ سے کسی چیز کی اصلاح کے لیے پر تاکید اقدام کے معنی میں ہے (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) یعنی میں نے تیری ہر طرح سے اصلاح کر دی ہے، گویا میں تجھے اپنے لیے چاہتا ہوں، اور یہ انتہائی محبت آمیز بات ہے کہ جو خدا نے اس عظیم پیغمبر کے حق میں کہی ہے۔ اور بعض کے قول کے مطابق یہ اس بات کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کہ جو حکمائے کہی ہے کہ:

"ان الله تعالٰی اذا احب عبداً تفقده کما یتفقد الصدیق صدیقه"

خدا جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس طرح سے اس کی دیکھ بھال کرتا ہے جیسا کہ کوئی مہربان دوست اپنے دوست کی کرتا ہے۔

❊ ❊ ❊

۴۲۔ اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَاَخُوۡكَ بِاٰیٰتِیۡ وَلَا تَنِیَا فِیۡ ذِكۡرِیۡ ۝



Marfat.com

۴۳۔ اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○
۴۴۔ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ○
۴۵۔ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی ○
۴۶۔ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَكُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی ○
۴۷۔ فَاۡتِیٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۙ۬ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ ؕ
قَدۡ جِئۡنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰی ○
۴۸۔ اِنَّا قَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰی مَنۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ○

## ترجمہ

۴۲۔ تو اور تیرا بھائی (دونوں) میری آیات کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو۔
۴۳۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔
۴۴۔ لیکن اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ متوجہ ہو یا (خدا سے) ڈرے۔
۴۵۔ (موسیٰ اور ہارون) دونوں نے کہا، پروردگارا! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا، یا سرکشی کرے گا
۴۶۔ فرمایا ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں میں (ہر چیز کو) سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔
۴۷۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان پر تشدد و آزار نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تیرے لیے واضح نشانی لے کر آئے ہیں اور سلام و درود ہو اس پر کہ جو ہدایت کی پیروی کرے۔
۴۸۔ (اس سے کہو) کہ ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ اس شخص پر عذاب ہوگا کہ جو (آیاتِ الٰہی) کو جھٹلائے گا اور روگردانی کرے گا

## تفسیر

### جابر فرعون کے ساتھ پہلی ٹکر:

اب جب کہ تمام چیزیں مہیا ہو چکی ہیں اور تمام ضروری وسائل حضرت موسیٰؑ کو حاصل ہو چکے ہیں تو انہیں اور ان کے بھائی



Marfat.com

ہارونؑ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: " تو اور تیرا بھائی دونوں جو آیات میں نے تمہیں دی ہیں ان کے ساتھ اب نکل پڑو (اذهب انت واخوك باياتي)۔

وہ آیات جن میں موسیٰؑ کے یہ دو عظیم معجزے بھی اور پروردگار کی وہ تمام نشانیاں تعلیمات اور وہ سارے پروگرام بھی شامل ہیں کہ جو خود بھی اس کی دعوت کی حقانیت بیان کرتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ ان پُر مغز تعلیمات کا ایسے شخص کے ذریعے اظہار ہو رہا ہے کہ جس نے ظاہراً اپنی عمر کا اہم حصہ بھیڑ بکریاں چرانے میں گزارا ہے۔

اور ان کی رُوحانی تقویت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کی تاکید کرنے کی خاطر مزید فرمایا: میرے ذکر اور میری یاد اور میرے احکام کے اجرا میں سستی نہ کرنا (ولاتنيا في ذكري)۔

کیونکہ سستی اور قاطعیت کو ترک کرنا، تمہاری ساری زحمتوں کو برباد کر دے گا۔ لہٰذا مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور کسی بھی حادثہ سے ہراساں نہ ہو، اور کسی بھی طاقت کے مقابلہ میں سستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اُن کے بھیجنے کا اصل مقصد اور وہ خاص بات کہ جس کی طرف انہیں توجہ رکھنا ہے، بیان کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ (اذهبا الى فرعون انه طغٰى)۔

اس وسیع و عریض سرزمین کی عام بدبختیوں کا عامل اور اصل سبب وہی ہے اور جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی کوئی کام نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی قوم کی پیش رفت یا پسماندگی اور خوش بختی یا بدبختی کا اصل عامل ہر چیز سے زیادہ اس قوم کے رہنما اور سردار ہی ہوا کرتے ہیں لہٰذا سب سے پہلے تمہارا ہدف انہی کو ہونا چاہیئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہارونؑ اس وقت اس بیابان میں موجود نہیں تھے اور جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے کہ خدا نے انہیں اس ماجرے سے آگاہ کیا اور وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اپنے بھائی موسیٰؑ کے استقبال کی خاطر مصر سے باہر آئے۔ لیکن بہرحال اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ مخاطب تو دو افراد ہوں جبکہ اس وقت صرف ایک حاضر ہو اور فارسی روزمرہ میں بھی (اور اُردو میں بھی) ایسے نمونے عام ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں: تم اور تمہارا بھائی جو کل سفر سے واپس آئے گا دونوں میرے پاس آنا۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد آغاز کار میں فرعون سے ملاقات کے مؤثر طریقے کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ اس غرض سے کہ تم اس پر اثر انداز ہوسکو، "نرم انداز سے اس سے گفتگو کرنا، شاید وہ متوجہ ہو یا خدا سے ڈرے (فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى)۔ یہاں "يتذكر" اور "يخشى" کے درمیان فرق یہ ہے کہ اگر تم نرم اور ملائم انداز میں بات کرو اور مطالب بھی صراحت اور قاطعیت کے ساتھ بیان کرو تو ایک احتمال تو یہ ہے کہ وہ تمہارے منطقی دلائل کو دل سے قبول کرے اور ایمان لے آئے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کم از کم دنیا یا آخرت میں خدا کے عذاب کے خوف سے اور اپنی طاقت کے برباد ہو جانے کے ڈر سے سر تسلیم خم کرے اور تمہاری مخالفت نہ کرے۔

البتہ ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ وہ متوجہ ہو اور نہ خدا سے ڈرے بلکہ مخالفت اور مقابلہ کا راستہ اختیار کرے۔ "لعل" (شاید) کی تعبیر سے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ تو اس صورت میں اس کے لیے اتمام حجت ہو جائے گی۔ یعنی اس انداز پر



Marfat.com

عمل کرنا کسی حال میں بھی بے فائدہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کو علم تھا کہ اس کا انجام کار کیا ہو گا لیکن مذکورہ تعبیرات میں موسٰیؑ و ہارونؑ اور راہِ خدا کے تمام رہبروں کے لیے ایک درس ہے۔[1]

٭ ٭ ٭

لیکن اس کے باوجود موسٰیؑ و ہارون اس بات پر پریشان تھے کہ کہیں یہ سرکش و زور مند اور متکبر شخص جس کی سخت گیری اور سخت مزاجی کا ہر جگہ چرچا ہے، اس سے پہلے کہ موسٰی و ہارون اسے دعوت دیں وہ پیش قدمی کرتے ہوئے انہیں ختم ہی نہ کر دے۔ لہذا "عرض کی: پروردگارا! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ہماری بات سُننے سے پہلے ہی ہمیں سزا دینے کا حکم صادر نہ کر دے اور تیرا پیغام اس کے اور اس کے مصاحبین کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ پائے یا سُننے کے بعد سرکشی کرنے لگے" (قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغٰی)۔

"یفرط" "فرط" (بروزن "شرط") کے مادہ سے آگے بڑھنے کے معنی میں ہے۔ اسی بنا پر اس شخص کو کہ جو سب سے پہلے پانی کے گھاٹ پر پہنچے "فارط" کہتے ہیں۔ علی علیہ السلام کے کلمات، جو آپ نے دروازۂ کوفہ کے پیچھے قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائے تھے، میں ہے کہ:

انتم لنا فرط سابق

تم اس قافلے سے آگے بڑھ جانے والے ہو اور ہم سے پہلے دیارِ آخرت کی طرف روانہ ہو گئے ہو۔[2]

بہرحال موسٰیؑ اور ان کے بھائی ہارون کو دو باتوں کا ڈر تھا۔ پہلی بات یہ کہ فرعون ان کی باتیں سننے سے پہلے ہی کہیں سختی پر نہ اُتر آئے اور یا سنتے ہی بلا فاصلہ اور بلا تامل اس قسم کا اقدام کر بیٹھے اور دونوں صورتوں میں ان کا کام خطرے میں پڑ جائے گا اور نامکمل رہ جائے گا۔

لیکن خدا نے قطعی انداز میں اُن سے فرمایا: تم بالکل نہ ڈرو، میں خود تمہارے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا بھی ہوں: (قال لا تخافا اننی معکما اسمع و اریٰ)۔

اس بنا پر ایسے خدائے توانا کے ہوتے ہوئے کہ جو ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے ہر چیز اور ہر بات کو سُنتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے اور تمہارا حامی و مددگار ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اپنی دعوت کو فرعون کے سامنے پیش کرنے کی کیفیت انتہائی باریکی کے ساتھ پانچ مختصر، قاطع اور پُرمعنی و مطلب جملوں

---

[1] "لعل" کے معنی کے بارے میں اور یہ قرآن میں کس معنی میں آیا ہے، ہم نے تفسیر نمونہ، جلد ۴ میں سورۂ نساء کی آیہ ۸۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار، شمارہ ۱۳۰۔



Marfat.com

میں بیان فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک اصل ماموریت کے ساتھ مربوط ہے، دوسرے میں ماموریت کا معنی ومفہوم اور مطلب بتلایا گیا ہے، تیسرے میں دلیل و سند کا بیان ہے، چوتھے میں قبول کرنے والوں کو شوق دلایا گیا ہے اور پانچویں اور آخری جملہ میں مخالفت کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: تم اس کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں: (فأتیاه فقولا انا رسولا ربك)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ہمارا پروردگار کی بجائے تیرا پروردگار کہا گیا ہے تاکہ فرعون کے ذہن کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس کا ایک پروردگار ہے۔ اور یہ اس کے پروردگار کے نمائندے ہیں اور ضمنی طور پر اشاروں ہی اشاروں میں اُسے یہ سمجھایا جارہا ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے ربوبیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ صرف خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرے یہ کہ: بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں اذیت و تکلیف نہ پہنچا (فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبهم)۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰؑ کی دعوت صرف بنی اسرائیل کو آلِ فرعون کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ قرآن کی دوسری آیات کی گواہی کے مطابق، خود فرعون اور اس کے حواریوں کو شرک و بُت پرستی کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بھی تھی لیکن اس امر کی اہمیت اور اس کے موسیٰؑ کے ساتھ منطقی تعلق کی وجہ سے آپ نے یہ مسئلہ خاص طور پر پیش کیا چونکہ بنی اسرائیل سے خدمات لینا اور ان کو اتنی تکلیف اور عذاب کے ساتھ اپنا غلام بنائے رکھنا، ایسا کام نہیں تھا کہ جس کی توجیہ کی جاسکے۔

پھر اپنی دلیل اور ثبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے کہ اُس سے کہو: ہم تیرے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی (اور دلیل) لے کر آئے ہیں: (قد جئناك باٰية من ربك)۔

ہم بیہودہ اور فضول بات نہیں کرتے اور بغیر دلیل کے کوئی گفتگو نہیں کرتے۔ لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کم سے کم ہماری باتوں پر غور تو کرے اور اگر ٹھیک ہو تو انہیں قبول کرے۔

اس کے بعد مومنین میں شوق پیدا کرنے کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: جو ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان پر سلام ہے: (والسلام علی من اتبع الھدٰی)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ اس جہاں میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی تکلیف رنج، خدا کے دردناک عذاب اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی مشکلات سے سلامتی صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے جو خدائی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں اور درحقیقت یہ موسیٰؑ کی دعوت کا آخری نتیجہ ہے۔

ٔ ٔ ٔ

انہیں حکم دیا گیا کہ آخر میں اس دعوت سے رُوگردانی کا بُرا انجام بھی اسے سمجھا دیں اور اس سے کہیں کہ: "ہماری طرف وحی ہوئی ہے کہ عذابِ الٰہی اُن لوگوں کے دامن گیر ہوگا کہ جو اس کی آیات کو جھٹلائیں گے اور اس کے فرمان سے رُوگردانی کریں گے" (انا قد اوحی الینا ان العذاب علی من کذب وتولیٰ)۔



Marfat.com

ممکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ اس جملہ کا ذکر اُس نرم گفتار کے مطابق نہیں ہے جس پر وہ مامور تھے لیکن یہ اشتباہ ہے کیونکہ اس بات میں کیا امر مانع ہے کہ ایک ہمدرد طبیب نرم لہجے میں اپنے مریض سے کہے کہ جو شخص اس دوا کو استعمال کرے گا وہ نجات پائے گا یعنی شفایاب ہو جائے گا اور جو نہ کرے گا وہ لقمۂ اجل بن جائے گا۔

اس بیان میں کوئی شدتِ عمل والی بات نہیں بلکہ اُس کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر یہ ایک حقیقت ہے جو اُس کے سامنے واشگاف الفاظ میں بیان کی جا رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

## چند اہم نکات :

**۱۔ خدا کی عجیب قدرت نمائی:** تاریخ میں بہت سے واقعات ایسے گزرے ہیں کہ خود سر اور طاقتور افراد قدرتِ خدا کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن خدا نے کسی موقعے پر بھی زمین و آسمان کے کوئی خاص لشکر ان کی سرکوبی کے لیے جمع نہیں کیے بلکہ ایسے سادہ اور آسان طریقہ سے انہیں مغلوب کیا جس کا کسی شخص کو تصور بھی نہیں تھا۔

خصوصیت کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُنہیں کو اپنی موت کے ذرائع کی طرف بھیج دیتا ہے اور ان کی نابودی خُود انہیں کے سپُرد کر دیتا ہے۔

فرعون کی یہی داستان گواہ ہے کہ اس کے اصلی دُشمن یعنی موسیٰ کو خُود اُسی کے دامن میں پرورش کرائی اور اللہ نے انہیں خود اسی کی حفاظت میں رکھا۔

سب سے بڑھ کر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تاریخ کے مطابق موسیٰؑ کی دایہ بھی قبطیوں میں سے تھی۔ وہ بڑھئی کہ جس نے ان کی نجات کا صندوق بنایا تھا وہ بھی ایک قبطی ہی تھا۔ صندوق کو پانی سے نکالنے والے فرعون کے ملازم تھے۔ صندوق کو کھولنے والی خود اس کی بیوی تھی۔ فرعون کے دربار کی طرف سے ہی موسیٰؑ کی ماں کو دُودھ پلانے والی کی حیثیت سے دعوت دی گئی اور قبطی کے قتل کے واقعے کے بعد فرعونی سپاہیوں کی طرف سے تعاقب آپؑ کی مدین کی طرف ہجرت اور شعیبؑ جیسے پیغمبر کے مکتب میں مکمل تعلیم و تربیت کا ایک دَور گزارنے کا سبب بنا۔ ہاں جب خُدا چاہتا ہے کہ اپنی قدرت کو ظاہر کرے تو وہ اسی طرح سے کیا کرتا ہے تاکہ سارے کے سارے سرکش جان لیں کہ ان کی حیثیت اس سے کہیں کمتر و حقیر ہے کہ اس کے ارادہ اور مشیت کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش جا سکے۔

٭ ٭ ٭

**۲۔ دشمنوں کے ساتھ مدارات:** لوگوں کے دلوں میں اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لیے (چاہے وہ کتنے ہی گمراہ اور گنہگار کیوں نہ ہوں) قرآن کا سب سے پہلا دستور یہ ہے کہ اُن سے ملائمت اور مہر و محبت کے ساتھ ملاقات کی جائے۔ خشونت اور سختی بعد کے مراحل سے تعلق رکھتی ہے اور اُس وقت ہے جب دوستانہ طریقے سے ملاقات کرنے کا کوئی اثر نہ ہو۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنچیں، نصیحت حاصل کریں اور ہدایت پائیں۔ یا اپنے بُرے کام کے انجام سے ڈریں:



Marfat.com

(لعلہ یتذکر او یخشی)۔

ہر مکتب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں جذب وکشش ہو اور بلا وجہ لوگوں کو اپنے سے دور نہ بھگائے۔ انبیاء اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے حالاتِ زندگی اسی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی اس طرزِ عمل سے انحراف نہیں کیا۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی محبت آمیز طرزِ عمل بھی بعض لوگوں کے ساتھ دل پر اثرانداز نہ ہو اور خشونت اور سختی کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہو۔ تو یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن ایک اصلِ کلّی اور ابتدار کار میں نہیں۔ پہلا قرینہ محبت اور ملائمت ہی ہے اور یہ وہی درس ہے جو زیرِ نظر آیات ہمیں واضح طور پر دے رہی ہیں۔

یہ بات جو بعض روایات میں منقول ہوئی ہے قابلِ توجہ ہے:

موسیٰ کو یہ تک حکم تھا کہ فرعون کو اس کے بہترین نام کے ساتھ پکاریں۔

شاید اس کے تاریک دل پر یہ بات اثر کر جائے۔

**۲۔ کیا انبیاء کے علاوہ کسی اور پر وحی ہوسکتی ہے:** اس میں شک نہیں کہ قرآن میں وحی کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی یہ آہستہ آواز کے معنی میں یا کسی بات کو آہستہ سے کہنے کے معنی میں آیا ہے۔ (یہ عربی زبان میں اس کا اصلی معنی ہے)۔

کبھی کسی رمز یہ اشارہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

فاوحی الیھم ان سبحوا بکرۃً وعشیاً

زکریا نے جو اس وقت بولنے سے قاصر تھے، بنی اسرائیل سے اشارہ کے ساتھ کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔ (مریم - ۱۱)

کبھی فطری الہام کے معنی میں بیان ہوا ہے، مثلاً:

اوحی ربك الی النحل

تیرے رب نے شہد کی مکھی کو فطری الہام کیا۔ (نحل - ۶۸)

کبھی حکمِ تکوینی کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ فرمان جو خلقت و آفرینش کی زبان سے دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

یومئذ تحدث اخبارھا بان ربك اوحی لھا

قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔ (زلزال - ۵)

اور کبھی الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا الہام جو صاحبِ ایمان لوگوں کے دل پر ہوتا ہے، چاہے وہ پیغمبر اور امام نہ بھی ہوں مثلاً:

اذ اوحینا الی امك مایوحی

اے موسیٰ ہم نے تیری ماں کی طرف جس وحی کی ضرورت تھی وہ اسے کی۔ (طٰہٰ - ۳۸)

لیکن اس کا ایک اہم ترین مقامِ استعمال قرآن مجید میں خدا کے وہ پیغامات ہیں کہ جو پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص ہیں، مثلاً:



Marfat.com

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ) :

ہم نے تیری طرف اسی طرح سے وحی بھیجی ہے جس طرح سے کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء کی طرف وحی بھیجی تھی ۔ (نساء - ۱۶۳)

اس بنا پر لفظ وحی ایک وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے کہ جو ان تمام مواقع پر استعمال ہوتا ہے ۔ اس طرح ہمیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر زیر بحث آیات میں موسیٰؑ کی ماں کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال ہوگیا ہے ۔

**۴ - ایک سوال کا جواب :** ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں اُوپر والی آیات کے مطالعہ سے یہ سوال پیدا ہو کہ موسیٰؑ ان خدائی وعدوں کے باوجود پریشانی ، شک اور تشویش سے کیوں دوچار ہوئے ۔ یہاں تک کہ خدا نے انہیں صراحت کے ساتھ کہا کہ جاؤ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں ، تمام باتوں کو سُنتا ہوں اور تمام چیزوں کو دیکھتا ہوں اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے

اس سوال کا جواب اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ماموریت حقیقت میں بہت ہی سنگین تھی ۔ موسیٰؑ بظاہر ایک چرواہے تھے ۔ اب انہیں صرف اپنے بھائی کو ساتھ لے کر ایک خودسر ، طاقتور اور سرکش آدمی سے جنگ کرنے کے لیے جانا تھا کہ جس کے قبضہ میں اس زمانے کے عظیم ترین طاقتور وسائل جمع تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ حکم انہیں یہ ملا کہ پہلی دعوت خود فرعون سے شروع کریں نہ یہ کہ پہلے دوسروں کے پاس جائیں اور لشکر اور یار و مددگار فراہم کریں بلکہ پہلا وار ہی فرعون کے دل پر کریں ۔ یہ ماموریت واقعاً ایک بہت ہی پیچیدہ اور انتہائی زیادہ مشکل تھی ۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ علم و آگاہی کے کئی مراتب و مدارج ہوتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک بات کو یقینی طور پر جانتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ علم الیقین اور عین الطمینان کے مرحلے میں پہنچ جائے ۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے معاد پر قطعی ایمان ہونے کے باوجود خدا سے یہ درخواست کی کہ اسی دنیا میں مُردوں کے زندہ ہونے کا منظر میری آنکھوں کو دکھا تاکہ زیادہ سے زیادہ اطمینانِ قلب پیدا ہو ۔

❖ ❖ ❖

۴۹ - قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ○

۵۰ - قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○

۵۱ - قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ○

۵۲ - قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ○

۵۳ - الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○



Marfat.com

۵۴۔ كُلُوا وَارْعَوا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝
۵۵۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝

# ترجمہ

۴۹۔ (فرعون نے) کہا : اے موسٰی ! تمہارا پروردگار کون ہے ؟
۵۰۔ (موسٰی نے) کہا : ہمارا پروردگار تو وہ ہے کہ جس نے ہر موجود کو وہ کچھ دیا جو اس کی خلقت کے لیے لازم تھا پھر اس کو ہدایت کی۔
۵۱۔ اس نے کہا: پھر ہم سے پہلے لوگوں کا حال کیا ہوگا ؟
۵۲۔ موسٰی نے کہا : ان کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے۔ میرا پروردگار نہ تو گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔
۵۳۔ وہ خدا وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے آرام و آسائش کی جگہ قرار دیا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا کہ جس کے ذریعے ہم نے انواع و اقسام کے نباتات (اندھیری خاک سے) نکالے۔
۵۴۔ تم خود اس میں سے کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی چراؤ۔ بیشک اس میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔
۵۵۔ ہم نے تمہیں اسی (خاک) سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو پھر لوٹا دیں گے۔ اور اسی سے تمہیں دوبارہ بھی (زندہ کرکے) نکال کھڑا کریں گے۔

# تفسیر

## تمہارا پروردگار کون ہے ؟

یہاں قرآن مجید نے اپنے طریقے کے مطابق ان مطالب کو حذف کر دیا ہے جو اس داستان میں آیندہ آنے والی بحثوں میں سمجھے جا سکتے ہیں ــــ اور موسٰیؑ اور ہارونؑ کی فرعون کے ساتھ گفتگو کو براہِ راست بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

درحقیقت معاملہ یہ ہے کہ :

موسٰیؑ فرمانِ رسالت حاصل کرنے اور فرعون کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بارے میں ایک ہمہ گیر، مکمل اور جامع دستور العمل لینے کے بعد اس مقدس سرزمین سے چل پڑتے ہیں اور مؤرخین کے قول کے مطابق مصر کے قریب اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ دونوں مل کر، فرعون کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی مشکلات کے بعد فرعون کے افسانوی محل کے اندر کہ جس میں بہت ہی



Marfat.com

کم لوگ آ جا سکتے تھے پہنچ جاتے ہیں۔
جس وقت موسیٰ فرعون کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، تو وہی مؤثر اور بچے تلے جملے جو خدا نے فرمان رسالت دیتے وقت انہیں تعلیم کیے تھے، بیان کرنا شروع کر دیئے:
ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔
بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں آزار نہ دے۔
ہم تیرے پروردگار کے پاس سے دلیل اور واضح معجزہ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔
جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہے۔
اور تو یہ بات بھی جان لے کہ ہمیں یہ وحی ہوئی ہے کہ عذاب خدا ان لوگوں کی انتظار میں ہے کہ جو تکذیب کریں اور فرمان خدا سے روگردانی کریں۔
جس وقت فرعون نے یہ باتیں سنیں تو اس کا پہلا ردّ عمل یہ تھا کہ اس نے کہا: اے موسیٰ! بتاؤ تمہارا پروردگار کون ہے (قال فمن ربکما یا موسیٰ)۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ مغرور اور خودسر فرعون یہ تک کہنے کے لیے تیار نہ ہوا کہ میرا پروردگار کہ جس کے تم مدعی ہو کون ہے؟ بلکہ یہ کہا کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟

٭ ٭ ٭

موسیٰ نے فوراً ہی پروردگار کا بہت ہی جامع اور انتہائی مختصر تعارف کروایا:
"کہا: ہمارا پروردگار تو وہی ہے جس نے ہر موجود کو وہ کچھ عطا کیا جو اس کی خلقت کا لازمہ تھا اور اس کے بعد مختلف مراحل ہستی میں اس کی رہبری اور ہدایت کی": (قال ربنا الذی اعطی کل شیءٍ خلقه ثم هدٰی)۔
اس مختصر سی گفتگو میں حضرت موسیٰ آفرینش اور عالم ہستی کے دو بنیادی اور اساسی اصولوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک معرفت پروردگار کے لیے ایک واضح اور مستقل دلیل ہے۔
پہلی بات یہ کہ ہر موجود کو جس چیز کی اسے ضرورت و احتیاج تھی اسے دی ہے۔ یہ وہی مطلب ہے کہ جس کے بارے میں کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں بلکہ لوگوں نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔
اگر ہم نباتات اور اُن جانداروں کے بارے میں کہ جو مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ــ خواہ وہ پرند ہوں یا چرند، دریائی جانور ہوں یا حشرات الارض، یا زمین پر رینگنے والے جانور ــ تھوڑا سا بھی غور کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے محیط اور ماحول کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے اور جس جس چیز کی اُسے ضرورت ہے وہ اسے حاصل ہے۔
پرندوں کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ جو انہیں شکل، وزن اور مختلف حواس کے لحاظ سے پرواز کے لیے درکار ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں رہنے والے جانوروں کی ساخت بھی ان کے مطابق رکھی گئی ہے۔
ظاہر ہے اُن سب کے بارے میں بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔



Marfat.com

**دُوسرا مسئلہ :** موجودات کی ہدایت و رہبری کا ہے کہ جسے قرآن نے "ثُمّ" کے لفظ سے ان کی ضروریات و حاجات کو پُورا کرنے کے بعد والے درجہ میں قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یا چیز زندگی کے وسائل سے مالامال تو ہو لیکن اُن سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ان سے کام لینے کے طریقوں سے آشنا ہو اور یہ وہی چیز ہے جو مختلف موجودات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے کیسے بہترین طریقے پر اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے۔ جانور کس طرح سے اپنا ٹھکانا بناتے ہیں، کیسے اولاد پیدا کرتے ہیں، کیسے اپنے بچّوں کی تربیت کرتے ہیں، کس طرح دشمنوں کی دسترس سے مخفی رہتے ہیں اور دشمن سے مقابلے کے لیے کیسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

انسان بھی اس ہدایت تکوینی کا حامل ہے لیکن چونکہ انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جو عقل و شعور رکھتا ہے لہٰذا خدا نے اس کی ہدایت تکوینی کو اس کی ہدایت تشریعی کے ساتھ کہ جو انبیاء کے ذریعہ کی جاتی ہے ملا دیا ہے اور اگر وہ اس راستے سے منحرف نہ ہو تو یقیناً مقصد کو پالے۔

دوسرے لفظوں میں انسان عقل و شعور اور ارادہ و اختیار رکھنے کی وجہ سے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ان کی تکمیل کے لیے کچھ ارتقائی پروگراموں کا حامل ہے جو حیوانات نہیں رکھتے۔ اسی بناء پر انسان تکوینی ہدایات کے ساتھ ساتھ تشریعی ہدایت کی احتیاج بھی رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰؑ فرعون کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ عالم ہستی نہ تو تجھ میں منحصر ہے اور نہ ہی سرزمین مصر میں، نہ آج کے زمانے کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی گزشتہ زمانہ سے۔

اس وسیع عالم کا گزشتہ زمانہ بھی تھا اور آئندہ بھی ہوگا۔ گزشتہ زمانے میں نہ میں تھا اور نہ تو اور اس عالم کے دو بنیادی مسائل ہیں، ایک ضروریات کو مہیا کرنا اور دوسرے موجودات کی پیش رفت کے لیے قوت اور وسائل کو بروئے کار لانا۔ یہ دونوں چیزیں تجھے ہمارے پروردگار سے اچھی طرح سے آشنا کر سکتی ہیں اور اس سلسلے میں تو جتنا زیادہ غور و فکر کرے گا اس کی عظمت و قدرت کے بیشمار دلائل تجھے ملتے چلے جائیں گے۔

فرعون نے یہ جامع اور عمدہ جواب سُن کر ایک اور سوال پیش کیا : "اُس نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی ذمہ داری کیا ہوگی" (قال فما بال القرون الاولیٰ)۔

اب یہ بات کہ فرعون کی اس جملے سے کیا مراد تھی، مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں :

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسیٰؑ نے اپنے آخری جملے میں توحید کے سب مخالفین کے لیے عذاب الٰہی کا ذکر کیا تھا۔ لہٰذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر وہ تمام مشرک قومیں کہ جو گزشتہ زمانے میں تھیں، اس قسم کے عذاب میں کیوں مبتلا نہیں ہوئیں؟

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ موسیٰؑ نے خداوند عالم کا سب کے لیے پروردگار اور معبود ہونے کا تعارف کرایا تھا، لہٰذا فرعون نے سوال کیا کہ پھر ہمارے بڑے اور سب گزشتہ قومیں کیوں مشرک تھیں؟ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ شرک اور بُت پرستی کوئی غلط کام نہیں ہے۔



Marfat.com

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ موسیٰؑ کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ آخر کار سب کے سب اپنے اعمال کے نتیجے کو پہنچیں گے اور جنہوں نے خدا کے فرمان سے رُوگردانی کی ہے انہیں عذاب و سزا ہوگی۔ تو فرعون نے پوچھا کہ پھر ان کی ذمہ داری کیا ہوگی کہ جو فنا ہوگئے ہیں اور دوبارہ اس زندگی کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے؟

بہرحال موسیٰؑ نے جواب دیا کہ گزشتہ اقوام کے تمام امور میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہیں میرا پروردگار کبھی بھی انہیں سنبھال رکھنے میں گمراہ نہیں ہوتا اور نہ ہی بھولتا ہے" (قال علمها عند ربّي في كتاب لا يضل ربّي ولا ينسى)[1]

اس بنا پر ان کا حساب کتاب محفوظ ہے اور آخر کار وہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا تک پہنچ جائیں گے۔ اس حساب کتاب کی نگہداشت کرنے والا وہ خدا ہے کہ جس کے کسی کام میں نہ تو کوئی غلطی ہے اور نہ ہی بھول چوک۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ موسیٰؑ نے اصل توحید اور خدا کے تعارف کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ پُورے طور پر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس ہستی کے لیے۔ کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات اور احتیاجات کامل طور پر عطا کی ہیں اور پھر اس کی ہدایت بھی کرتا ہے ۔ اس حساب کی نگہداشت کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

"لا یضل" اور "لا ینسی" کے مفہوم میں کیا فرق ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آرا ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ "لا یضل" پروردگار سے ہر قسم کے اشتباہ اور غلطی کی نفی کی طرف اشارہ ہے اور "لا ینسی" نسیان کی نفی کی طرف اشارہ ہے یعنی نہ تو وہ ابتدائے کار میں افراد کے حساب میں اشتباہ اور غلطی کرتا ہے اور نہ ہی وہ ان کے حساب کی نگہداشت کرنے میں بھول چوک کرتا ہے۔

اس طرح موسیٰؑ ضمنی طور پر ہر چیز پر پروردگار کے علمی احاطے کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ تاکہ فرعون اس واقعیت کی طرف متوجہ ہو کہ اس کے اعمال میں سے ذرہ برابر بھی، خدا کے علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ حقیقت میں خدا کا یہ احاطہ علمی اس بات کا نتیجہ ہے کہ جو موسیٰؑ نے سب سے پہلے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کہ جس نے ہر موجود کو اس کی ضرورت و حاجت کی ہر چیز دی ہے اور اسے ہدایت بھی کی ہے، وہ ہر شخص اور ہر چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی گفتگو کا ایک حصہ چونکہ مسئلہ توحید اور خداشناسی کے بارے میں تھا، لہٰذا قرآن اس مقام پر ایک اور بات بھی کرتا ہے: وہی خدا کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مہد آسائش بنایا اور اس میں راستے پیدا کیے اور آسمان سے پانی برسایا: (الذي جعل لكم الارض مهدًا وسلك لكم فيها سبلًا وانزل من السماء ماءً)۔

ہم نے اس پانی کے ذریعے انواع و اقسام کی مختلف نباتات مٹی سے نکالیں: (فاخرجنا به ازواجًا من نبات شتّٰى)۔

---

[1] یہاں لفظ "کتاب" نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو کہ اس کتاب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جس میں بندوں کے اعمال ثبت ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے:

لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها

کوئی چھوٹا یا بڑا عمل نہیں ہے مگر یہ کہ اس کتاب میں اس کا حساب موجود ہے۔ (کہف - ۴۹)



Marfat.com

اس ساری آیت میں خدا کی عظیم نعمتوں میں سے چار حصّوں کی طرف اشارہ ہوا ہے :

۱۔ زمین: کہ جو انسان کے لیے آرام و آسائش کا گہوارہ ہے۔ قانون جاذبہ کی برکت سے اور اسی طرح عظیم ہوائی قشر سے کہ جس نے اس کے اطراف کو گھیر رکھا ہے، انسان راحت اور امن و امان کے ساتھ اس پر زندگی گزار سکتا ہے۔

۲۔ راستے: جو خدا نے زمین میں پیدا کیے ہیں کہ جو اس کے تمام منطقوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ سر بفلک پہاڑوں کے سلسلوں کے درمیان اکثر درّے اور راستے موجود ہیں کہ جن میں سے انسان گزر سکتا ہے اور اپنے مقصد اور منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

۳۔ پانی: جو مایۂ حیات اور تمام برکات کا سرچشمہ ہے، آسمان سے نازل فرمایا۔

۴۔ چارے اور طرح طرح کی نباتات: جو اس پانی کے ذریعہ زمین سے اُگتی ہیں۔ جن کے ایک حصّہ سے انسان کے لیے غذائی سامان تیار ہوتا ہے کچھ حصّہ دواؤں کے طور پر کام آتا ہے، کچھ حصّہ کو انسان لباس بنانے کے کام میں لاتا ہے اور دوسرے حصّہ کو وسائل زندگی (مثلاً: دروازے، لکڑی کے گھر، کشتیاں، جہاز اور بہت سے ذرائع نقل و حمل) کے لیے استعمال کرتا ہے۔

بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں عظیم نعمتیں، اسی ترتیب سے کہ جس ترتیب کے ساتھ زیر بحث آیت میں بیان ہوئی ہیں، انسانی زندگی کی سب سے اوّل اور سب سے مقدم ضرورتیں ہیں۔ سب چیزوں سے پہلے سکون و آرام کی جگہ کی ضرورت ہے، اس کے بعد ایک علاقے کو دوسرے سے ملانے والے راستوں کی ضرورت ہے، پھر پانی اور پھر نباتات اور زرعی محصولات کی۔

آخر میں خدا کی ان تمام نعمتوں میں سے پانچویں اور آخری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان نباتات سے حاصل ہونے والی چیزوں میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی ان میں سے غذا فراہم کرو: (کلوا وارعوا انعامکم)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے حیوانات اور جانور بھی جو تمہاری غذا، لباس اور زندگی کے دوسرے وسائل کے ایک اہم حصّہ کو مہیا کرتے ہیں، وہ بھی اسی زمین اور اسی پانی کی برکت سے ہیں کہ جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

اور آخر میں جب ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ کر چکا تو فرماتا ہے: ان چیزوں میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح و روشن نشانیاں ہیں: ان فی ذٰلک لاٰیات لاولی النھٰی)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "نھٰی" جمع "نھیہ" (بروزن "کپیہ") اصل میں نہی کے مادے سے (جو امر کی ضد ہے) لیا گیا ہے۔ اور عقل و دانش کے معنی میں ہے جو انسان کو بُرائیوں سے روکتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی فکر اور دانش ہی اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے۔

❊ ❊ ❊

اس مناسبت سے کہ ان آیات کے توحیدی بیان میں زمین اور اس کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے، معاد کو بھی آخری زیر بحث آیت میں اسی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے: اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں دوبارہ لوٹا دیں گے اور اسی سے تمہیں (زندہ کرکے) نکال کھڑا کریں گے (منھا خلقنٰکم وفیھا نعیدکم



Marfat.com

منها نخرجكم تارة اخرٰی)۔

یہ انسان کے گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بارے میں کتنی جچی تلی اور منہ بولتی ہوئی تعبیر ہے۔ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں سب کے سب پھر مٹی ہی میں مل جائیں گے اور پھر سب کے سب دوبارہ مٹی ہی سے (زندہ کرکے) اُٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔

ہم سب کا مٹی میں مل جانا، یا مٹی سے دوبارہ اٹھائے جانا بالکل واضح اور روشن ہے۔ لیکن یہ بات کہ ہم سب کی ابتدا مٹی سے کس طرح ہوئی۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم سب آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے اور دوسری یہ کہ ہم خود بھی مٹی ہی سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ تمام غذائی مواد کہ جس سے ہمارے اور ہمارے ماں باپ کے بدن بن کر تیار ہوتے ہیں، وہ اسی مٹی سے حاصل ہوتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر تمام سرکشوں اور فرعون صفت لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے۔ کہ وہ یہ بات نہ بھولیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور انہیں کہاں جانا ہے۔ یہ سب غرور و نخوت اور سرکشی وطغیان، اس موجود کے لیے کہ جو کل تک مٹی تھا اور کل مٹی ہو جائے گا، کس لیے؟

## چند اہم نکات :

**۱۔ لفظ "مھد" و "مھاد" کا مفہوم :** دونوں ایسی جگہ کے معنی میں ہیں کہ جو بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی گئی ہو اور اصل میں لفظ "مھد" اس جگہ کو کہا جاتا ہے کہ جس میں بچّہ کو سلاتے ہیں (گہوارہ یا اسی قسم کی کوئی چیز)۔

گویا انسان ایک ایسا بچّہ ہے کہ جسے زمین کے گہوارے کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس گہوارے میں غذا اور اس کی زندگی کے تمام وسائل موجود ہیں۔

**۲۔ لفظ "ازواجاً" کا مطلب :** یہ "زوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ نباتات کے مختلف اصناف کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور عالم نباتات میں مسئلہ زوجیت (نر اور مادہ ہونے) کی طرف بھی ایک سربستہ اشارہ ہو سکتا ہے۔ جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں گفتگو کریں گے۔

**۳۔ "اولوا النھٰی" کی تفسیر :** اس سلسلے میں اصول کافی میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ :

ان خیارکم اولوا النھٰی، قیل یارسول الله ومن اولوا النھٰی؟
قال هم اولوا الاخلاق الحسنة والاحلام الرزینة وصلة الارحام والبررة بالامهات
والاباء والمتعاهدین للفقراء والجیران والیتامٰی ویطعمون الطعام
ویفشون السلام فی العالم، ویصلون والناس نیام غافلون :

"تم میں سے سب سے بہتر اولوا النھٰی (صاحبانِ فکر و اندیشہ مسئول) ہیں۔
لوگوں نے پوچھا : یارسول اللہ! اولوا النھٰی کون ہیں؟
فرمایا : وہ لوگ کہ جو اخلاقِ حسنہ اور عقلِ سلیم کے مالک ہیں اور صلۂ رحمی کرنے والے، ماں باپ سے نیکی کرنے والے، فقیروں، ضرورتمند ہمسایوں اور یتیموں کی مدد کرنے والے ہیں اور



Marfat.com

وہ لوگ کہ جو بھوکوں کو سیر کرتے ہیں۔ عالم میں صلح و آشتی پھیلاتے ہیں اور جب لوگ غافل سوئے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ [1]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

ایک شخص نے ان بزرگوار سے نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے کرنے کا مطلب پوچھا تو امام نے فرمایا:

" پہلے سجدہ کا مطلب، جب تو زمین پر سر رکھتا ہے ۔ یہ ہے کہ پروردگارا! میں ابتداء میں اسی مٹی سے تھا اور جس وقت تو سر اٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تُو نے مجھے اسی مٹی سے باہر بھیجا ہے اور دوسرے سجدہ کا مفہوم یہ ہے کہ تو مجھے اسی مٹی کی طرف پلٹائے گا اور جس وقت تو دوسرے سجدہ سے سر اُٹھاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوبارہ مجھے اسی مٹی سے (زندہ کرکے) اُٹھا کھڑا کرے گا۔ [2]

❖ ❖ ❖

۵۶۔ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ○

۵۷۔ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ○

۵۸۔ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ○

۵۹۔ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○

۶۰۔ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ○

۶۱۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○

۶۲۔ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ○

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب: "المؤمن وعلاماته وصفاته" ص ۲۳۲۔

[2] بحارالانوار، چاپ جدید، ج ۸۵، ص ۱۳۲۔



Marfat.com

۶۳ قَالُوٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ
اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ○
۶۴۔ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ
اسْتَعْلٰى ○

## ترجمہ

۵۶۔ ہم نے اپنی ساری نشانیاں اُسے دکھائیں لیکن اُس نے تکذیب کی اور انکار کیا۔

۵۷۔ اُس نے کہا : اے موسٰی ! کیا تُو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین سے اپنے اس جادو کے ذریعہ نکال باہر کرے۔

۵۸۔ ہم بھی یقینی طور پر اُسی جیسا جادو تیرے لیے لے آئیں گے ، ابھی سے (اس کی تاریخ معین کرلے اور) ہمارے اور اپنے درمیان مدت مقرر کرلے ، کہ ہم اور تم ، دونوں جس کی خلاف ورزی نہ کریں ، ایسی جگہ طے کرو جو سب کے لیے یکساں ہو۔

۵۹۔ (موسٰی نے) کہا : ہمارا ، تمہارا وعدہ زینت کے دن (روزِ عید) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ سب کے سب لوگ دن چڑھتے ہی جمع ہوجائیں۔

۶۰۔ فرعون اُس مجلس سے اُٹھا اور اُس نے اپنے تمام مکر و فریب جمع کیے اور پھر (مقررہ دن) ان سب کو لے آیا۔

۶۱۔ موسٰی نے اُن سے کہا : تم پر وائے ہو ، خدا پر جھوٹ نہ باندھو ، کہ وہ تمہیں اپنے عذاب کے ساتھ نابود کردے گا اور نا اُمیدی (اور شکست) اُسی شخص کے لیے ہے کہ جو (خدا پر) افترا باندھے۔

۶۲۔ ان کے درمیان آپس میں اُن کے کام کے سلسلے میں نزاع پیدا ہوگیا اور وہ آپس میں سرگوشی کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔

۶۳۔ انہوں نے کہا کہ : مسلمہ طور پر یہ دونوں کے دونوں جادوگر ہیں ، یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے جادو کے ذریعے تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے بلند مرتبہ دین کو ختم کردیں۔

۶۴۔ (اب جبکہ یہ بات ہے تو) اپنی تمام قوت و تدبیر جمع کرلو (اور مقابلے کے میدان میں) صف باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور کامیابی تو آج اُسی کی ہے کہ جو اپنی برتری ثابت کردے۔



Marfat.com

# تفسیر

## آخری مقابلے کے لیے فرعون کی تیاری :

آیات کے اس حصے میں موسیٰؑ اور فرعون کے مقابلے کے ایک اور مرحلہ کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن مجید اس حصے کو اس جملے کے ساتھ شروع کرتا ہے : ہم نے اپنی سبھی نشانیاں فرعون کو دکھائیں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی اس کے سیاہ دل پر اثر نہ کر سکی۔ اُس نے سب کی تکذیب کی اور انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ( ولقد اریناہ اٰیاتنا کلہا فکذب وابٰی )۔

یقینی بات ہے کہ ان آیات سے یہاں وہ تمام معجزات مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی پوری زندگی میں مصر میں اُن سے ظاہر ہوئے۔ بلکہ یہ اُن معجزات کے ساتھ مربوط ہے جو انہوں نے ابتداءِ دعوت میں فرعون کو دکھائے تھے یعنی "معجزۂ عصا" "یدِ بیضا" اور "ان کی آسمانی دعوت کے مطالب" جو کہ خود ان کی حقانیت کی ایک زندہ دلیل ہے۔

اسی لیے اس واقعے کے بعد جادوگروں کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ اور ان کے نئے معجزات کا ذکر ہے۔

اب آیئے، دیکھتے ہیں کہ سرکش، متکبر اور ہٹ دھرم فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے معجزات کے جواب میں کیا کہا؟ — تمام جھوٹے صاحبانِ اقتدار کی طرح انہیں کس طرح — متہم کیا؟ قرآن کہتا ہے : اُس نے کہا : اے موسیٰ! کیا تُو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہماری سرزمین اور وطن سے اپنے جادو کے ذریعے باہر نکال دے : ( قال اجئتنا لتخرجنا من ارضنا بسحرك یا موسٰی )۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ : ہم جانتے ہیں کہ دعوئ نبوت ، دعوتِ توحید اور یہ معجزہ نمائی، سب حکومت پر قبضے اور ہمیں اور قبطیوں کو ہمارے آباؤ اجداد کی زمین سے نکالنے کے لیے ایک سازش ہے۔ تیرا مقصد دعوتِ توحید ہے اور نہ بنی اسرائیل کی نجات۔ تیرا مقصد صرف حکومت حاصل کرنا، اس سرزمین پر تسلط جمانا اور مخالفین کو باہر نکال دینا ہے۔

یہ تہمت بالکل وہی حربہ ہے جو پوری تاریخ میں، سب صاحبانِ اقتدار اور استعمارگر استعمال کرتے رہے ہیں۔ جس وقت وہ اپنے آپ کو خطرے میں پاتے، تو اپنے بچاؤ اور مفاد کی خاطر، لوگوں کو تحریک کرنے کے لیے "ملک خطرے میں ہے" کا ہوّا کھڑا کر دیتے، ملک یعنی ان صاحبانِ اقتدار کی حکومت اور اس مملکت کی بقا؛ یعنی خود ان کی اپنی بقا۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اصل میں بنی اسرائیل کو مصر لانے اور ان کی اس سرزمین میں نگہداشت صرف ان سے غلاموں کی شکل میں ان کی کام کی طاقت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ بنی اسرائیل جو کہ ایک طاقتور قوم تھے، طاقت پیدا کر کے کہیں خطرے کا سبب نہ بن جائیں اسی طرح اُن کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم بھی، صرف موسیٰؑ کے پیدا ہونے کے خوف سے نہیں تھا بلکہ وہ بھی ان کی طاقت و قوت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ اور یہ وہ کام ہے کہ جسے تمام خود سر انجام دیتے ہیں۔ اس بناء پر — موسیٰ کی خواہش کے مطابق — باہر جانے کا مطلب، اس ملّت کا طاقت حاصل کرنا تھا۔ اس صورت میں فراعنہ کا تاج و تخت خطرے میں پڑ جاتا تھا۔



Marfat.com

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مختصر سی عبارت میں فرعون نے موسٰیؑ کو جادو کی تہمت بھی دی، وہی تہمت جو تمام انبیاءؑ پر ان کے واضح معجزات کے جواب میں لگائی گئی۔

جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیہ ۵۲ اور ۵۳ میں بیان ہوا ہے:

کذالك ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون اتواصوا به بل ھو قوم طاغون۔

کوئی پیغمبر ان سے پہلے نہیں آیا مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، کیا وہ اس (تہمت و افتراء) کی ایک دوسرے کو وصیت کر جایا کرتے تھے (کہ وہ سب اس میں ہم آواز تھے) بلکہ وہ ایک سرکش قوم ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے موقعوں پر حبُّ الوطنی کے احساسات وجذبات کا دامن تھامنا، بڑی سوچی سمجھی بات تھی، کیونکہ اکثر لوگ اپنے وطن کی سرزمین کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی کچھ آیات میں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں:

ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم

اگر ہم نے اُن پر یہ واجب کر دیا ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کریں، یا اپنے وطن اور گھر سے باہر نکل جائیں، تو صرف تھوڑے سے افراد ہی اس پر عمل کرتے۔ (نساء ۶۶)

فرعون نے اس کے بعد مزید کہا: تم یہ گمان نہ کر لینا، کہ ان جادوؤں کی مانند (جادو) پیش کرنا ہمارے بس میں نہیں "یقیناً جان لو کہ ہم عنقریب تیرے جواب میں اسی قسم کا جادو لے آئیں گے": (فلنأتینك بسحر مثله)۔

اور اس غرض سے کہ زیادہ سے زیادہ قاطعیت کا اظہار کرے، اس نے کہا: ابھی اسی وقت اس کی تاریخ مقرر کر، ہمارے اور تیرے درمیان وعدہ ہونا چاہیئے کہ جس سے نہ ہم ادھر اُدھر ہوں اور نہ تو، وہ ہو بھی ایسی جگہ کہ جو ہم سب کے لیے برابر ہو: (فاجعل بیننا وبینك موعدا لا نخلفه نحن ولا انت مکانا سوی)۔

"مکانا سوی" کی تفسیر میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ تھا کہ اس جگہ کا فاصلہ تجھ سے اور ہم سے برابر کا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا فاصلہ شہر کے تمام لوگوں کے لیے یکساں ہو، یعنی ایسی جگہ جو ٹھیک شہر کے مرکز میں ہو، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ایک ہموار زمین ہے کہ جس پر تمام لوگ آسکیں اور بلند وپست اس میں یکساں ہوں۔ ہم کہتے ہیں ان تمام معانی کو مجموعی طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقتور برسر اقتدار لوگ اس غرض سے کہ وہ اپنے حریف کو میدان سے باہر نکال پھینکیں، اور اپنے مصاحبین اور حواریوں میں جو بعض اوقات متاثر ہو گئے ہوتے ہیں (اور موسٰی کا واقعہ اور ان کے معجزات سے وہ حتمی طور پر متاثر ہو گئے تھے) طاقت وقوت اور جذبہ پیدا کریں۔ ظاہراً بڑے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور بہت زیادہ شور وغل کرتے ہیں۔



Marfat.com

لیکن حضرت موسیٰؑ نے تحمل اور بُردباری کا دامن نہ چھوڑا اور فرعون کے شور وغل پر ہرگز نہ گھبرائے اور پُوری صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: میں بھی تیار ہوں! ابھی اسی وقت، دن اور وقت کا تعین کیے دیتا ہوں۔" ہمارا اور تمہارا وعدہ زینت کے دن (روزِ عید) کا ہوا۔ شرط یہ ہے کہ تمام لوگ دن چڑھے تک اس جگہ جمع ہو جائیں: (قال موعدکم یوم الزینة وان یحشر الناس ضحی)[1]

"یوم الزینة" (زینت کا دن) کی تعبیر مسلمہ طور پر کسی عید کے دن کی طرف اشارہ ہے۔ جسے ہم مخصوص طور پر معین نہیں کر سکتے لیکن اہم بات یہ ہے کہ لوگ اس دن اپنے کاروبار کی چھٹی کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس قسم کے پروگرام میں شرکت کے لیے وہ طبعی طور پر تیار تھے۔

بہرحال فرعون نے موسیٰ کے حیرت انگیز معجزات اور اپنے حواریوں میں ان معجزات کے "نفسیاتی" اثرات دیکھے تو پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ جادوگروں کی مدد سے ان کا مقابلہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے موسیٰ کے ساتھ معاہدہ کیا اور "اس مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تمام مکر و فریب سمیٹ کر سب کو مقررہ روز لے کر پہنچ گیا": (فتولی فرعون فجمع کیدہ ثم اتی)

اس مختصر سے جملے میں وہ تمام حالات و واقعات، جو سُورۂ اعراف و شعراء میں مفصل اور مبسوط طور پر بیان کیے گئے، بطور خلاصہ بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ فرعون نے اس مجلس سے اُٹھنے اور موسیٰ و ہارون سے جُدا ہونے کے بعد، اپنے مخصوص مشیروں اور مستکبر حامیوں کے ساتھ مختلف میٹنگیں کیں۔ اس کے بعد اُس نے سارے ملک مصر سے جادوگروں کو دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی۔ اُس نے بہت شوق انگیز ذرائع سے انہیں اس تقدیر ساز مقابلے کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جن کی بحث کے لیے یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔ البتہ قرآن نے ان تمام باتوں کو، ان تین جملوں میں جمع کر دیا ہے: (فرعون موسیٰ سے جُدا ہوا، اپنے تمام مکروں کو جمع کیا، اور پھر (تیار ہو کے) آگیا)[2]

٭ ٭ ٭

آخرکار مقرر دن آ پہنچا۔ حضرت موسیٰؑ لوگوں کے اس عظیم اجتماع کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ مدِمقابل گروہ میں سے کچھ لوگ جادوگر تھے۔ ان کی تعداد بعض مفسرین کے قول کے مطابق ۷۲ افراد تھی، بعض کے مطابق چار سو افراد تک تھی، اور بعض دوسروں نے اس سے بہت زیادہ تعداد بھی بیان کی ہے۔

ان میں سے کچھ افراد فرعون اور اس کے مصاحبین اور اطرافیوں پر مشتمل تھے۔ باقی اکثریت تماشائی عوام تھے۔

حضرت موسیٰؑ نے اس موقع پر جادوگروں کی طرف، یا فرعونیوں اور جادوگروں کی طرف رُخ کیا، اور اُن سے کہا: وائے ہو تم پر، تم خدا پر جھوٹ نہ باندھو کیونکہ وہ تمہیں اپنے عذاب سے تباہ و برباد کر دے گا" (قال لھم موسیٰ ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب)

"اور شکست و ناامیدی اور خسارہ اُس کے لیے ہے کہ جو خدا پر افترا باندھتا ہے، اور اس کی طرف باطل کی نسبت دیتا ہے":

---

[1] "ضحیٰ" لغت میں سُورج کے پھیلاؤ کے معنی میں ہے، یا سُورج کا اُوپر آنا ہے، اور "وان یحشر الناس ضحی" میں "واؤ" معیت کی دلیل ہے۔

[2] اگرچہ لفظ "تولّی" یہاں پر، موسیٰ سے جُدا ہونے یا اُس مجلس سے اُٹھنے کے معنی میں تفسیر ہوا ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس کی لغت کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرعون کے موسیٰ پر اعتراض کرنے، ناراض ہونے، اور اس کی معاندانہ نکتہ چینی کے لیے بھی استعمال ہوا ہو۔



Marfat.com

(وقد خاب من افتریٰ)۔

یہ بات واضح ہے کہ موسیٰ کی خدا پر افترا سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو یا کسی چیز کو اس کا شریک قرار دینا، خدا کے بھیجے ہوئے معجزات کو جادو سے تعبیر کرنا اور فرعون کو اپنا معبود اور الٰہ خیال کرنا تھا۔ یقیناً جو شخص خدا پر اس قسم کے افترا باندھے گا اور پوری قوت کے ساتھ نورِ حق کو بجھانے کی کوشش کرے گا۔ خدا اسے بغیر سزا دیئے نہ چھوڑے گا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ دوٹوک باتیں، جو جادوگروں کی باتوں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھیں — بلکہ اس کا طریقہ تمام سچے پیغمبروں والا تھا — اور موسیٰ کے پاکیزہ دل سے نکلی ہوئی تھیں، بعض کے دلوں پر اثر کر گئیں، اور اس پر ان لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض شدت عمل کے طرفدار تھے بعض شک و شبہ میں پڑ گئے، اور کہنے لگے ہو سکتا ہے موسیٰ خدا کے عظیم پیغمبر ہوں اور اگر ایسا ہوا ان کی تہدید اور دھمکیاں مؤثر ہو کر رہیں گی۔ خاص طور پر، ان کا اور ان کے بھائی ہارون کا وہی چرواہوں والا سادہ لباس تھا۔ ان کے چہرے پر عزم راسخ کی جھلک تھی۔ تنہا ہونے کے باوجود ان میں کوئی کمزوری اور کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی گفتگو، ان کی سچائی کی ایک اور دلیل تھی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: وہ آپس میں اپنے کاموں کے بارے میں نزاع میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگے: (فتنازعوا امرهم بينهم واسروا النجوى)۔

ممکن ہے کہ یہ سرگوشی اور پوشیدہ باتیں موسیٰ کے سامنے ہو رہی ہوں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ باتیں فرعون کے سامنے ہوں اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس منظر سے متاثر ہونے والوں نے مخفی طور پر عوام سے اس قسم کی سرگوشی اور نزاع شروع کر دیا ہو۔

❋ ❋ ❋

لیکن بہرحال مقابلہ جاری رکھنے اور شدت عمل کے طرفدار کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مختلف طریقوں سے، موسیٰ کے ساتھ مقابلہ کرنے والوں کو تحریک کرنے لگے "پہلے،" انہوں نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں"۔ (قالوا ان هٰذا ن لساحران)[1]

اس بنا پر ان کے مقابلہ میں گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ تم اس وسیع و عریض ملک میں جادوگروں کے سردار اور بزرگ ہو اور تمہاری قوت و طاقت ان سے زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ: "وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے جادو کے ذریعہ باہر نکال دیں" وہ سرزمین کہ جو تمہیں جان کی طرح عزیز ہے اور تم اس سے تعلق رکھتے ہو اور وہ تم سے تعلق رکھتی ہے (یریدان ان یخرجاکم من ارضکم بسحرهما)۔

علاوہ ازیں وہ صرف تمہیں تمہارے وطن سے نکال دینے پر ہی قانع نہیں ہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مقدسات کا بھی مذاق اڑائیں" اور تمہارے بلند مرتبہ دین اور سچے مذہب ہی کو ختم کر دیں" (ویذهبا بطریقتکم المثلیٰ)[2]

---

[1] یہ جملہ اعراب کے لحاظ سے اس طرح ہے کہ "ان" "انّ" کا مخفف ہے، اور اسی وجہ سے اس نے اپنے مابعد پر عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں "انّ" کے اسم کا رفع لغت عرب میں کمیاب نہیں ہے۔

[2] "طریقة" روش کے معنی میں ہے، اور یہاں مذہب مراد ہے۔ اور "مثلیٰ" مثل کے مادہ سے یہاں عالی اور افضل کے معنی میں ہے (ای الاشبه بالفضیلة)۔



Marfat.com

اب جب کہ یہ بات ہے تو شک و شبہ کو کسی طرح بھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دو" اور اپنی تمام طاقت، منصوبہ، مہارت و قوت جمع کرو، اور کام میں لاؤ" (فاجمعوا کیدکم)۔

"اس کے بعد سب کے سب متحد ہو کر ایک ہی صف میں، میدان مقابلہ میں قدم رکھو": (ثم ائتوا صفاً)۔

کیونکہ اس تقدیر ساز مقابلے میں وحدت و اتحاد ہی، تمہاری کامیابی و کامرانی کا ضامن ہے۔

اور آخر میں، " کامیابی تو آج اسی کے لیے ہوگی جو اپنی برتری اپنے حریف پر ثابت کر دے گا": (وقد افلح الیوم من استعلی)۔

۶۵۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ○

۶۶۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○

۶۷۔ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ○

۶۸۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○

۶۹۔ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ○

## ترجمہ

۶۵۔ (جادوگروں نے) کہا اے موسٰی! کیا تو پہلے (اپنے عصا کو) پھینکے گا یا پہلے ہم پھینکیں؟

۶۶۔ (موسٰی نے) کہا: پہلے تم پھینکو، تو فوراً ہی ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے اُسے ایسی نظر آنے لگیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں۔

۶۷۔ موسٰی — اس وقت اپنے دل میں کچھ ڈرے۔

۶۸۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں یقیناً کامیاب تو تم ہی ہوگے۔

۶۹۔ اور جو چیز تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے (زمین پر) ڈال دو، یہ اُن تمام چیزوں کو جنہیں انہوں نے بنایا ہے نگل جائے گی کیونکہ وہ تو صرف جادوگر کا مکر و فریب ہی ہیں اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا فلاح نہیں پائے گا۔



Marfat.com

# تفسیر

## موسٰی بھی میدان میں آجاتے ہیں :

جادوگر ظاہراً متحد ہو گئے اور انہوں نے عزم بالجزم کرلیا کہ موسٰی کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ جس وقت میدان میں قدم رکھا تو انہوں نے کہا : "اے موسٰی! کیا تو پہلے جادو کے آلات پھینکے گا یا ہم پہلے پھینکیں (قالوا یا موسٰی اما ان تلقی واما ان نکون اول من القٰی)۔

بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ جادوگروں کی یہ تجویز کہ موسٰی پہلے اقدام کریں، یا وہ پہل کریں، ان کی طرف سے یہ موسٰی کا ایک قسم کا احترام تھا۔ اور شاید یہی چیز تھی کہ جس نے اس قصہ کے بعد انہیں ایمان لانے کی توفیق فراہم کی۔

لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کیونکہ وہ پوری قوت کے ساتھ یہ کوشش کر رہے تھے کہ موسٰیؑ اور ان کے معجزے کو درہم برہم کریں بنا بریں یہ تعبیر شاید اس لیے ہو کہ وہ عوام پر اپنی خود اعتمادی ظاہر کریں۔

⁂

لیکن موسٰیؑ نے جلد بازی نہ کی کیونکہ انہیں اپنی کامیابی کا پورا اطمینان تھا اور اس سے قطع نظر، اس قسم کے مقابلوں میں عموماً وہ بازی لے جاتا ہے کہ جو پیش قدمی نہ کرے — انہوں نے ان سے "کہا تم پہلے پھینکو" (قال بل القوا)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسٰیؑ کی طرف سے ان کو یہ دعوتِ مقابلہ، حق کے آشکار ہونے کی ایک تمہید تھی اور جناب موسٰیؑ کی نظر میں یہ کام نہ صرف یہ کہ کوئی امر قبیح نہیں تھا بلکہ ایک امر واجب کا مقدمہ تھا۔

جادوگروں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا اور جتنی لاٹھیاں اور رسیاں وہ جادو کرنے کے لیے اپنے ہمراہ لائے تھے، ان سب کو ایک ہی بار میدان میں ڈال دیا، اور اگر ہم اس روایت کو کہ جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ : وہ ہزاروں آدمی تھے، قبول کرلیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوگا، کہ انہوں نے ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں کہ جن کے اندر ایک خاص قسم کا مواد بھرا ہوا تھا ایک لمحہ کے اندر میدان میں پھینک دیں۔

" اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے اس طرح نظر آئیں جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں (فاذا حبالھم وعصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعٰی)۔

ہاں! چھوٹے بڑے، رنگ برنگے مختلف شکلوں کے سانپ اچھلنے کودنے لگے۔ قرآن کی دوسری آیات میں اس سلسلے میں ہے :

سحروا اعین الناس واسترھبوھم وجآءو بسحر عظیم (اعراف ۱۱۶)

انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں وحشت و گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ اور یہ ان کا بہت ہی بڑا جادو تھا۔

اور سورہ شعرا کی آیہ ۴۴ کی تعبیر کے مطابق :

جادوگروں نے پکار کر کہا : وقالوا بعزۃ فرعون انا لنحن الغالبون



Marfat.com

فرعون کی عزت کی قسم ہم کامیاب ہیں ۔

بہت سے مفسرین نے لکھا ہے ۔ کہ انہوں نے بہت سا ایسا مواد جیسے "پارہ" ان رسیوں اور لاٹھیوں کے اندر بھرا ہوا تھا ۔ کہ جس سے سورج کی دھوپ میں اس مادہ کے گرم ہو جانے کی وجہ سے، غیر معمولی دوڑ بھاگ، اور مختلف قسم کی تیز حرکتیں ان میں شروع ہو گئیں یقیناً یہ حرکتیں چلنے پھرنے کی نہیں تھیں، لیکن وہ بات جو جادوگروں نے لوگوں کو پہلے سے سجھائی ہوئی تھی، اس کے ساتھ یہ خاص منظر جو وہاں وجود میں آیا اس سے لوگوں کو یوں لگا جیسے ان موجودات میں جان آگئی ہے ۔ اور وہ چل پھر رہے ہیں۔ "سحروا اعین الناس" کی تعبیر یعنی "لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا" بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح "یخیل الیہ"، یعنی موسیٰ کو یوں لگا بھی ہو سکتا ہے کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو ۔

بہر حال بہت ہی عجیب منظر تھا، جادوگر کہ جن کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اس فن سے اُن کی آگاہی بھی کمال درجہ کی تھی اور وہ اجسام کے طبیعاتی و کیمیائی خواص سے استفادہ کرنے کے طریقوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے، لہٰذا وہ حاضرین پر اس طرح اثر انداز ہونے کے قابل ہو گئے کہ انہیں یہ یقین دلا دیں کہ یہ تمام بے جان چیزیں جاندار بن گئی ہیں ۔

خوشی کا ایک شور فرعونیوں کی طرف سے بلند ہوا۔ کچھ لوگ خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے چیخنے لگے اور پیچھے کی طرف ہٹ گئے ۔

ٌ ٌ ٌ

"اس موقع پر موسیٰ نے ایک خفیف سا خوف، اپنے دل میں محسوس کیا"۔ (فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ)۔

"اوجس" "ایجاس" کے مادہ سے اصل میں "وجس" (بروزن "حبس") سے ہے ۔ جو ایک پوشیدہ آواز کے معنی سے لیا گیا ہے اس بنا پر "ایجاس" ایک پوشیدہ اور اندرونی احساس کے معنی میں ہے، اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ موسیٰ کا یہ اندرونی خوف بالکل معمولی اور خفیف سا تھا، اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں تھا ۔ کہ وہ جادوگروں کے جادو کے اثر سے، جو رُعب انگیز منظر وجود میں آیا تھا اس کی کسی اہمیت کے قائل ہو گئے تھے بلکہ انہیں خوف اس بات کا تھا کہ کہیں لوگ اس منظر سے متاثر نہ ہو جائیں ۔ اس طرح سے کہ انہیں واپس لوٹانا آسان نہ رہے ۔

یا یہ کہ اس سے پہلے کہ موسیٰ کو اپنا معجزہ دکھانے کی مہلت ملے، کچھ لوگ اس میدان سے ہی چلے جائیں، یا انہیں یہاں سے باہر نکال دیا جائے اور حق واضح نہ ہو سکے ۔

جیسا کہ نہج البلاغہ کے چھٹے خطبے میں ہے :

لم یوجس موسیٰ (ع) خیفۃ علی نفسہ بل اشفق من غلبۃ الجھال ودول الضلال

موسیٰ نے ہرگز اپنے دل میں اپنے لیے خوف محسوس نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس بات سے ڈرے کہ جاہل غالب آجائیں اور گمراہ حکومت کامیاب ہو جائے ۔ [1]

---

[1] حضرت علی علیہ السلام نے یہ بات اس وقت فرمائی ہے جبکہ وہ لوگوں کے انحراف سے پریشان تھے ۔ وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ میری پریشانی بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ مجھے حق کے متعلق کچھ شک و شبہ ہے کیونکہ میں نے تو جس دن سے حق کو دیکھا ہے ذرہ بھر شک بھی مجھے اس میں نہیں ہوا، بلکہ میں لوگوں کے انحراف کی وجہ سے پریشان ہوں ۔



Marfat.com

جو کچھ بیان ہو چکا، اب اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے خوف کے بارے میں جو دوسرے جوابات ذکر ہوئے ہیں، ہم ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

❖ ❖ ❖

بہر حال اس موقع پر خدا کی مدد اور نصرت موسیٰؑ کے پاس آپہنچی اور وحی کے فرمان نے ان کی ذمہ داری واضح کردی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ہم نے اس سے کہا: خوف کو اپنے قریب بھی نہ آنے دو یقیناً تم ہی غالب رہو گے: (قلنا لا تخف انك انت الاعلى)۔

یہ جملہ پوری قاطعیت کے ساتھ موسیٰ کو ان کی کامیابی کے بارے میں دلی اطمینان دلا رہا ہے، (لفظ "ان" اور ضمیر کا تکرار دونوں اس معنی پر ایک مستقل تاکید ہیں، اور اسی طرح اس جملے کا جملہ اسمیہ ہونا بھی) اور اس طرح سے موسیٰ نے اپنی قوت قلب کو جو لمحہ بھر کے لیے متزلزل ہوئی تھی، پھر سے مجتمع کیا۔

پھر ان سے فرمایا گیا جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اُسے نیچے ڈال دے۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ ان سب کو نگل جائے گا۔ (والق ما فی یمینك تلقف ما صنعوا)۔

چونکہ ان کا کام تو صرف جادوگر کا مکر و فریب ہے: (انما صنعوا كيد ساحر)۔

اور جادوگر جہاں کہیں بھی جائے گا کامیاب نہ ہوگا۔ (ولا یفلح الساحر حیث اتٰی)۔

"تلقف" "لقف" کے مادہ سے (جو "وقف" کے وزن پر ہے) نگلنے کے معنی میں ہے۔ لیکن راغب مفردات میں یہ کہتا ہے، کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، چاہے منہ کے ساتھ ہو یا ہاتھ کے ساتھ اور بعض ارباب لغت نے اسے "تیزی کے ساتھ پکڑنے" کے معنی میں سمجھا ہے جیسے فارسی میں اس کی جگہ "ربودن" استعمال ہوتا ہے۔[1]

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ: یہ نہیں فرمایا کہ "اپنا عصا پھینکو" بلکہ فرمایا: "جو کچھ تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے اسے پھینکو" یہ تعبیر شاید عصا سے بے اعتنائی کے عنوان سے ہو اور اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عصا کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو بات اہم ہے وہ خدا کا ارادہ اور اس کا حکم ہے۔ اگر اس کا ارادہ ہو تو عصا تو آسان ہے۔ اس سے چھوٹی اور حقیر چیز بھی اس قسم کی قدرت نمائی کر سکتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ زیر بحث آیت میں لفظ "ساحر" پہلی مرتبہ نکرہ کی شکل میں اور بعد میں اسم معرفہ کی صورت میں الف لام جنس کے ساتھ آیا ہے۔ یہ فرق شاید اس بنا پر ہو کہ پہلی مرتبہ تو مقصد یہ ہے کہ ان جادوگروں کے کام سے بے اعتنائی برتی جائے اور جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ کسی جادوگر کے مکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے لیکن دوسری مرتبہ اس حقیقت کو سمجھانا چاہتا ہے کہ نہ صرف یہ جادوگر بلکہ ہر جادوگر، جس زمانہ، اور جس جگہ پیدا ہو، وہ کامیاب اور فلاح یافتہ نہیں ہوگا۔

## چند اہم نکات:

**۱۔ جادو کی حقیقت کیا ہے؟** اگرچہ ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں بحث کر چکے ہیں، لیکن ہم اس مقام پر بھی، مختصر وضاحت کے طور پر، چند جملے بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ "سحر" دراصل ہر اس چیز اور ہر اُس کام کے معنی میں ہے کہ

[1] اردو میں اسے "اچک لینا" کہتے ہیں۔



Marfat.com

جس کا مأخذ مخفی اور پنہاں ہو لیکن روزمرہ کی زبان میں ایسے غیر معمولی کاموں کو کہا جاتا ہے کہ جو مختلف وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے انجام پاتے ہیں۔

کبھی تو اس میں محض چالاکی، دھوکہ، فریب نظر اور ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔

کبھی بعض اجسام و مواد کے طبیعاتی و کیمیائی غیر معلوم خواص سے استفادہ کیا جاتا ہے اور کبھی شیاطین سے مدد لی جاتی ہے۔

اور یہ سب مفہوم اس جامع لغوی مفہوم میں داخل ہیں۔

تاریخ میں ہمیں جادو اور جادوگروں کے بارے میں بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ اور آج بھی ہمارے اس زمانہ میں ایسے اشخاص کہ جو اس قسم کے کاموں میں مشغول ہیں کم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ موجودات کے بہت سے خواص جو گزشتہ زمانہ میں عام لوگوں سے مخفی تھے۔ ہمارے زمانے میں واضح اور آشکار ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ مختلف موجودات کے تعجب انگیز آثار کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لہٰذا جادوگروں کے جادو کا بہت سا حصہ اُن کے ہاتھ سے چھن گیا ہے۔

مثلاً آج ہم علم کیمیا کے ذریعے بہت سے ایسے اجسام کو جانتے ہیں کہ جن کا وزن ہوا سے بھی زیادہ ہلکا ہے اور اگر انہیں کسی جسم کے اندر رکھا جائے تو ممکن ہے کہ اس جسم میں حرکت پیدا ہو جائے اور کسی کو اس سے تعجب بھی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے بچوں کے بہت سے کھلونے شاید گزشتہ زمانے میں جادو کی کوئی قسم معلوم ہوتے ہوں۔

آج کل سرکسوں میں ایسی نمائشیں دکھائی جاتی ہیں، کہ جو گزشتہ زمانے کے جادوگروں کے جادو کے مشابہ ہیں، آئینے، طبیعاتی اور کیمیائی اجسام کے خواص، روشنی کی چمک سے، کئی طرح سے استفادہ کرتے ہوئے، عجیب و غریب منظر پیش کیے جاتے ہیں، کہ جنہیں دیکھ کر بعض اوقات دیکھنے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔

البتہ ریاضت کرنے والوں کے غیر معمولی اعمال اپنے مقام پر خود ایک علیحدہ داستان ہیں۔ جو بہت ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہیں۔

بہرحال جادو اور سحر کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار کیا جائے یا اُسے خرافات اور فضول باتوں سے نسبت دی جائے، چاہے گزشتہ زمانہ میں ہو یا موجودہ زمانہ میں۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جادو اسلام میں ممنوع اور گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔ کیونکہ بہت سے موقعوں میں، لوگوں کے گمراہ ہونے، حقائق کی تحریف کرنے اور سادہ لوح افراد کے عقائد کی بنیاد کو متزلزل کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ البتہ اس اسلامی حکم میں، بہت سے دوسرے احکام کی مانند، استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ منجملہ ان کے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے یا جادو کے اثر کو ان لوگوں سے دُور کرنے کے لیے کہ جو اس سے تکلیف اُٹھا رہے ہوں، جادو کا سیکھنا مستثنیٰ ہے۔

سُورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ و ۱۰۳ کے ذیل میں بھی، اس تفسیر کی پہلی جلد میں، ہم اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بات کر چکے ہیں۔

**۲۔ جادوگر، کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا؟** بہت سے لوگ پُوچھتے ہیں کہ اگر جادوگر خارقِ عادت کام — جو کہ معجزہ سے مشابہ ہیں — انجام دے سکتے ہیں تو پھر ان کے کاموں اور معجزہ میں کس طرح فرق کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جادوگر کا کام ایک محدود انسانی قوت کے سہارے



Marfat.com

سے ہوتا ہے اور معجزہ خدا کی بے پایاں اور لازوال قدرت سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔
لہٰذا جادوگر کچھ محدود کام ہی سرانجام دے سکتا ہے اور اگر وہ ان کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہے تو عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف انہی کاموں کو انجام دے سکتا ہے جن کی اُس نے پہلے سے مشق کی ہو اور ان کا ماہر ہو اور ان کے پیچ وخم سے آگاہ ہو لیکن ان کے علاوہ دوسرے کاموں میں وہ بالکل عاجز ولاچار ہوگا جبکہ انبیاء و رسل چونکہ خدا کی لازوال قدرت سے مدد لیا کرتے تھے، وہ زمین و آسمان میں ہر طرح اور ہر قسم کا خارقِ عادت کام انجام دینے پر قادر تھے۔
جادوگر لوگوں کی فرمائش کے مطابق خارقِ عادت کام انجام نہیں دے سکتا، مگر یہ کہ اتفاقیہ طور پر اس کے کام کے مطابق ہو جائے۔ (اگرچہ وہ بعض اوقات اپنے ایسے دوستوں کو جنہیں لوگ پہچانتے نہیں ہیں یہ بات سکھا دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے درمیان میں سے اُٹھ کھڑے ہوں اور وہ فرمائشیں کریں جو پہلے سے معین شدہ ہیں)۔
لیکن انبیا بارہا اور کئی اہم معجزات کہ جو حق کے متلاشی لوگ ان سے سندِ نبوت کے طور پر طلب کیا کرتے تھے انجام دیتے رہے ہیں جیسا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کی اسی سرگزشت میں مشاہدہ کریں گے۔
اس کے علاوہ جادو چونکہ ایک انحرافی کام ہے اور ایک قسم کا دھوکا اور فریب ہے۔ لہٰذا فطری طور پر ایسی طبیعتیں چاہتا ہے کہ جو اُس سے ہم آہنگ ہوں اور جادوگر بلا استثناء دھوکا باز، مکار اور فریبی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جنہیں ان کے مزاج اور اعمال وکردار کے مطالعے اور تحقیق سے، بہت جلد پہچانا جا سکتا ہے۔ جبکہ انبیاء کا اخلاص و پاکیزگی اور پاکبازی ایک ایسی سند ہے کہ جو ان کے اعجاز کے ساتھ مل کر اس کے اثر کو کئی گنا کر دیتی ہے، (غور کیجیے گا)۔
اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت کہتی ہے:
ولا یفلح الساحر حیث اتٰی
جادوگر کہیں بھی ہو، اور جن حالات اور جس زمانہ میں ہو وہ فلاح اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔
بقول معروف بہت جلد اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، کیونکہ اس کی قوت محدود ہوتی ہے اور اس کے افکار و صفات انحرافی ہوتے ہیں یہ بات صرف انہی جادوگروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ جو انبیاء کے مقابلے میں آتے تھے، بلکہ تمام جادوگروں پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ وہ جلد ہی پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

٭ ٭ ٭

۷۰۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰی ○
۷۱۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ



Marfat.com

النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ○

٧٢۔ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِىْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ○

٧٣۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○

٧٤۔ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ○

٧٥۔ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۙ○

٧٦۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۧ○

## ترجمہ

٧٠۔ (موسٰی نے اپنا عصا پھینکا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ اسے نگل گیا تو) سب کے سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے کہا ہم ہارون اور موسٰی کے پروردگار پر ایمان لائے ہیں۔

٧١۔ (فرعون نے) کہا: کیا میری اجازت کے بغیر تم اس پر ایمان لے آئے ہو، یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے کہ جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ یقیناً میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالوں گا اور کھجور کے تنوں کے اوپر تمہیں سولی چڑھا دوں گا اور تم جان لوگے کہ ہم میں سے کس کی سزا زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے۔

٧٢۔ انہوں نے کہا: اُس خدا کی قسم کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم واضح و روشن دلائل پر جو ہم تک پہنچی ہیں، تجھے ہرگز مقدم نہ رکھیں گے، جو حکم تو کرنا چاہے کر، کیونکہ تُو تو صرف اِس دُنیا کی زندگی میں حکم چلا سکتا ہے۔

٧٣۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو اور جو جادو کرنے کے لیے تُو نے ہمیں مجبور کیا اسے بخش دے



Marfat.com

اور خدا بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔

۴۔ جو شخص مجرم ہو کر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے کہ جس میں وہ نہ تو مرے گا اور نہ جیئے گا۔

۵۔ اور جو شخص مومن ہو اور اُس نے نیک عمل انجام دیئے ہوں (جب وہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوگا) تو اس کے لیے عالی درجات ہیں۔

۶۔ جنت کے دائمی باغات کہ جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ اس کی جزا ہے کہ جو اپنے آپ کو پاک کرے۔

# تفسیر

## موسٰی علیہ السلام کی عظیم کامیابی:

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے، کہ موسٰی کو یہ حکم دیا گیا، کہ وہ اپنا عصا پھینکیں، تاکہ جادوگروں کے جادو کی کارروائیوں کا خاتمہ کردیں۔

زیر بحث آیات میں بھی اسی مسئلہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ البتہ جو جملے واضح تھے وہ حذف کر دیئے گئے ہیں (یعنی موسٰی نے اپنا عصا پھینکا۔ عصا ایک عظیم سانپ میں بدل گیا اور جادوگروں کے جادو کے تمام اسباب و آلات نگل گیا، تمام لوگوں میں ایک شور و غل بلند ہوا فرعون سخت پریشان ہوا، اور اس کے مصاحبین کے منہ حیرت سے کھُلے کے کھُلے رہ گئے)۔

جادوگر۔ جنہوں نے آج تک بھی اس قسم کا منظر نہیں دیکھا تھا اور جو جادو اور دوسری باتوں کا فرق اچھی طرح سے پہچانتے تھے، انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ کام خدا کے معجزے کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہے کہ جو انہیں اُن کے پروردگار کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اُن کے دلوں میں ایک طوفان اُٹھا اور ایک عظیم انقلاب ان کی رُوح میں پھوٹ پڑا۔

اب اس بات کا آخری حصہ آیات کی زبان سے سُنتے ہیں۔

"سب کے سب جادوگر سجدے میں گر پڑے اور انہوں نے کہا: ہم موسٰی و ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں"

(فالقی السحرۃ سجدًا قالوا اٰمنا برب ھارون و موسٰی)۔

"القی" کی تعبیر (فعل مجہول سے استفادہ کرتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ موسٰی کی طرف ایسے کھنچے اور ان کے معجزے سے ایسے متاثر ہوئے کہ گویا بے اختیار سجدے میں جا پڑے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے صرف ایمان لانے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھا، کہ وہ موسٰی و ہارون کے پروردگار پر اس ایمان لانے کا ایک واضح اور روشن صُورت میں اور ایسے جملوں کے ساتھ کہ جن میں کوئی کسی قسم کا ابہام نہ ہو یعنی پُوری تاکید کے ساتھ اظہار کریں تاکہ اگر کچھ لوگ ان کے اس کام سے متاثر ہو کر گمراہ ہو گئے ہوں تو وہ پلٹ آئیں اور اس



Marfat.com

لحاظ سے کسی قسم کی جرأت ہی ان کے ذرہ باقی نہ رہے۔

یہ بات واضح اور بدیہی ہے کہ جادوگروں کے اس عمل نے فرعون کے پیکر اور اس کی جابر، خود سر اور ظالم حکومت پر ایک ضرب کاری لگائی اور اس کے تمام ارکان کو ہلا کے رکھ دیا۔

سارے ملک مصر میں اس مسئلے کے بارے میں مدتوں پروپیگنڈا ہوتا رہا تھا، اور جادوگروں کو ہر گوشہ و کنار سے اکٹھا کیا گیا تھا اور ان کے لیے کامیابی کی صورت میں طرح طرح کے انعامات اور اعزازات کا وعدہ کیا گیا تھا۔

لیکن اب وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ جو لوگ مقابلے کے لیے صفِ اول میں کھڑے تھے وہی ایک دم دشمن کے آگے جھک گئے اور نہ صرف یہ کہ وہ سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں بلکہ وہ تو بڑی سختی کے ساتھ اس کا دفاع کرنے لگے اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس کے بارے میں فرعون سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بلاشک و شبہ لوگوں میں سے بھی ایک گروہ جادوگروں کی پیروی کرتے ہوئے موسٰی اور ان کے دین سے وابستہ ہو گیا تھا۔

لہٰذا فرعون کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ شور و غل اور سخت اور غلیظ قسم کی دھمکیوں کے ساتھ، اپنی رہی سہی حیثیت کو بچائے۔ جادوگروں کی طرف رُخ کرتے ہوئے اس نے کہا: کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو (قال اٰمنتم له قبل ان اٰذن لکم)۔

یہ جابر و متکبر، نہ صرف اس بات کا مدعی تھا، کہ اس کی لوگوں کے جسم و جان پر حکومت ہے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل بھی میرے ہی قبضہ و اختیار میں ہیں اور مجھ ہی سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا تمہارے دل کا ارادہ بھی میری اجازت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ یہ وہی کام ہے کہ جو ہر زمانے اور ہر عصر کے فرعون اپناتے ہیں۔

ان میں سے بعض تو فرعونِ مصر کی طرح، پریشانی کے وقت کھلم کھلا اپنی زبان سے کہہ دیتے ہیں اور بعض پُر اسرار طریقے سے ذرائع ابلاغ اور ربطِ اجتماعی سے استفادہ کر کے اور مختلف قسم کے سنسر لگا کر، عملی طور پر اپنے لیے اس حق کے قائل ہیں، اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ لوگوں کو آزادانہ طور پر سوچنے کی اجازت نہیں دینا چاہیئے، بلکہ کبھی کبھی تو آزادیٔ فکر کے نام تک سے، لوگوں کی آزادی کو سلب کر لینا چاہیئے۔

بہر حال فرعون نے اسی بات پر قناعت نہ کی، بلکہ فوراً ہی جادوگروں پر ایک فقرہ چست کیا، اور ان پر اتہام لگاتے ہوئے کہا کہ "یہ تمہارا بڑا ہے، اسی نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور یہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ایک سازش ہے": (انه لکبیرکم الذی علمکم السحر)۔

بلاشک فرعون کو معلوم تھا اور اُسے اس بات کا یقین تھا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے جھوٹ ہے اور بنیادی طور پر اس قسم کی سازش کہ جو سارے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور اس کے جاسوسوں اور خفیہ کارندوں کو خبر ہی نہ ہو ممکن نہیں ہے۔ اصولی طور پر موسٰی کو فرعون نے اپنی آغوش میں پالا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ وہ مصر سے غائب رہے ہیں۔ اگر وہ مصر کے جادوگروں سے بڑے ہوتے تو ہر جگہ اس عنوان سے مشہور ہو جاتے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جسے چھپایا جا سکتا۔

لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس وقت بے لگام اور خود سر لوگ اپنی نامشروع حیثیت کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو وہ کسی قسم کے جھوٹ اور تہمت لگانے سے باک نہیں کرتے۔



Marfat.com

پھر اس بات پر ہی بس نہ کی بلکہ جادوگروں کو نہایت سخت لہجے میں موت کی دھمکی دیتے ہوئے کہا: "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھوں کو اور دوسری طرف کے پاؤں کو قطع کر دوں گا اور بلند کھجور کے تنے پر تمہیں سُولی چڑھا دوں گا تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ میرا عذاب زیادہ دردناک اور زیادہ پائیدار ہے یا موسٰی و ہارون کے خدا کا عذاب" (فلاُقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاُصلبنّکم فی جذوع النخل ولتعلمن اینا اشد عذابا وابقٰی[1])

درحقیقت "اینا اشد عذابا" کا جُملہ اُس تہدید کی طرف اشارہ ہے کہ جو موسٰی نے پہلے کی تھی اور اس قصّے سے پہلے ہی خصوصیت کے ساتھ جادوگروں کو سُنا دی تھی کہ اگر تم خدا پر جھُوٹ باندھو گے تو وہ تمہیں اپنے عذاب سے نیست و نابود کر دے گا۔

"من خلاف" کی تعبیر (تمہارے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے کے خلاف کاٹوں گا) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دائیں ہاتھ کے ساتھ بایاں پاؤں یا اس کے برعکس۔ شاید جادوگروں کے لیے اس قسم کی سزا کا انتخاب اس لیے تھا کیونکہ اس طرح سے انسان زیادہ دیر میں مرتا ہے یعنی خونریزی زیادہ سُست ہوگی اور تکلیف بیشتر ہوگی۔ علاوہ ازیں گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تمہارے بدن کو دونوں طرف سے ناقص کر دوں گا۔

باقی رہی یہ دھمکی کہ تمہیں کھجور کے درخت پر سُولی دوں گا، تو یہ شاید اس بنا پر ہو کہ یہ درخت زیادہ اُونچے اور بلند ہوتے ہیں اور نزدیک و دُور سے سب لوگ اس شخص کو دیکھ لیتے ہیں جو اس پر لٹکایا گیا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اس زمانے میں اس طرح سے سولی نہیں چڑھایا جاتا تھا جس طرح سے ہمارے زمانہ میں سولی دیا جاتا ہے وہ سولی کی رسّی کو اُس شخص کی گردن میں جسے سولی دینا مطلوب ہوتا تھا، نہیں ڈالتے تھے بلکہ اس کے ہاتھوں یا شانوں سے باندھ دیتے تھے، تاکہ وہ تکلیف اُٹھاتا رہے۔

❊ ❊ ❊

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ فرعون کی ان شدید دھمکیوں کے جواب میں جادوگروں نے کیا ردِّ عمل دکھایا؛ وہ نہ صرف یہ کہ مرعوب نہیں ہوئے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور میدان سے باہر نہ نکلے بلکہ وہ میدان میں مضبوطی سے ڈٹے رہے اور کہا: "اُس خدا کی قسم کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہمیں جو واضح دلائل میسر آئے ہیں، ہم اُن پر ہرگز تجھے مقدم نہ رکھیں گے" (قالوا لن نؤثرک علٰی ماجاءنا من البینات والذی فطرنا)۔

"تو جو فیصلہ کرنا چاہے کر لے" : (فاقض ما انت قاض)۔

"لیکن یہ جان لے کہ تُو تو صرف اس دنیاوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے؛ (مگر آخرت میں ہم کامیاب ہوں گے اور تو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا) (انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا)۔

اس طرح سے انہوں نے تین، دوٹوک جُملے فرعون سے کہے۔ پہلا یہ کہ تم جان لو کہ، ہم نے جو ہدایت پائی ہے، اُسے کسی چیز سے نہیں بدلیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم تیری دھمکیوں سے کبھی بھی ہراساں نہ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ تیری حکومت و فعالیت یہی چار روزہ ہے۔

[1] مشہور یہ ہے کہ "ولاُصلبنکم فی جذوع النخل" میں "فی" کا لفظ "علی" کے معنی میں ہے یعنی تمہیں کھجور کے درختوں پر سولی لٹکاؤں گا لیکن فخرِ رازی کا نظریہ ہے کہ "فی" یہاں پر اپنا ہی معنی دیتا ہے کیونکہ "فی" ظرفیت کے لیے ہوتا ہے اور ہر چیز کی ظرفیت اس سے مناسبت رکھتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سولی کی لکڑی اُس شخص کیلئے بطور ظرف استعمال ہوتی ہے کہ جسے سولی چڑھایا جائے (لیکن یہ توجیہ کچھ صحیح نظر نہیں آتی)۔



Marfat.com

پھر انہوں نے مزید کہا: " اگر تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، تو یہ اس لیے ہے تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے " (ہم جادو اور جادوگری کی وجہ سے بہت سے گناہوں کے مرتکب ہو چکے ہیں) (انا آمنا بربنا لیغفر لنا خطایانا)۔

اور اسی طرح " وہ بڑا گناہ (یعنی رسول خدا کے مقابلے میں جادو کا مظاہرہ) جس کے کرنے پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اللہ ہمیں معاف کرتے ہوئے اپنی رحمت میں شامل کرے اور خدا ہر چیز سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے" (وما اکرھتنا علیہ من السحر واللہ خیر وابقٰی)۔

مختصر یہ کہ ہمارا مقصد گزشتہ گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ اُن میں سے (ایک گناہ) خدا کے سچے پیغمبر کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی ہے ہم اس طرح سے یہ چاہتے ہیں کہ سعادت ابدی حاصل کر لیں لیکن تو ہمیں اس دنیا کی موت سے ڈرا رہا ہے۔ یہ تھوڑا سا ضرر اُس عظیم بھلائی کے مقابلے میں ہمیں قبول ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جادوگروں نے ظاہراً خود اپنی خوشی سے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اگرچہ فرعون نے اُن سے بہت سے وعدے کیے تھے۔ تو پھر زیر بحث آیت میں " اکراہ " (مجبور کرنا) کیوں آ رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی دلیل ایسی نظر نہیں آتی کہ جادوگر شروع سے ہی اس دعوت کو قبول کرنے پر مجبور نہیں تھے بلکہ " یأتوک بکل ساحر علیم " (مامورین جا کر ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں) (اعراف - ۱۱۲) کے جملہ کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ ہر جادوگر کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا لازمی و ضروری تھا۔ یقیناً فرعون کی خود سر اور استبدادی حکومت میں یہ کام بالکل طبعی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور ارادوں کی تکمیل کے لیے لوگوں کو مجبور کرتے تھے۔ باقی رہا اُن میں شوق پیدا کرنے کے لیے انعام و اکرام مقرر کرنا ــ تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے لگام ستمگر حکومتیں زور اور طاقت سے کام لینے کے ساتھ ساتھ مادی لالچ سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جادوگر جونہی حضرت موسیٰ کے سامنے آئے کچھ قرائن سے ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں یا کم از کم وہ شک و شبہ میں پڑ گئے تھے اور اسی بنا پر ان میں گومگو کی حالت پیدا ہو گئی تھی جیسا کہ ہم نے اِسی سورہ کی آیہ ۶۲ میں پڑھا ہے:

فتنازعوا امرھم بینھم

فرعون اور اس کے درباری اِس صورتِ حال سے آگاہ ہوئے تو اُنہوں نے اُنہیں مقابلہ جاری رکھنے پر مجبور کیا۔

جادوگروں نے اس کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایمان لے آئے ہیں تو اس کی دلیل واضح و روشن ہے:

" کیونکہ جو شخص بے ایمان اور گنہگار قیامت میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو گا، اُس کے لیے دوزخ کی جلانے والی آگ ہے": (انہ من یأت ربہ مجرماً فان لہ جھنم)۔

اور دوزخ میں سب سے بڑی مصیبت اس کے لیے یہ ہے کہ: " اس میں نہ تو وہ مرے گا اور نہ زندہ ہو گا" (لا یموت فیھا ولا یحیٰی)۔

بلکہ وہ ہمیشہ موت اور زندگی کی کشمکش میں رہے گا ایسی زندگی کہ جو موت سے زیادہ تلخ اور تکلیف دہ ہو گی۔



Marfat.com

"اور جو شخص اس عظیم بارگاہ میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ پہنچے گا، وہ عالی درجوں پر فائز ہوگا": (ومن یأتہ مؤمنا قد عمل الصالحات فاولئک لھم الدرجات العلیٰ)۔

"ہمیشہ باقی رہنے والی جنتیں کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے": (جنات عدن تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا)۔

"اور یہ اس شخص کی جزا ہے کہ جو ایمان اور اطاعت پروردگار کے ساتھ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرے" (وذالک جزاء من تزکیٰ)۔

آخر کی تین آیات جادوگروں کی اس گفتگو کا حصہ ہیں جو انہوں نے فرعون کے سامنے کی تھی یا خدا کی طرف سے مستقل جملے ہیں کہ جو بیان ان کی گفتگو کی تکمیل کے لیے فرمائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض انہیں جادوگروں کی گفتگو کا آخری حصہ سمجھتے ہیں اور "شاید" انہ" سے شروع ہونا کہ جو واقعاً علت کے بیان کرنے کے لیے آتا ہے، اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔

لیکن وہ تفصیل جو ان تینوں آیات میں صالح مومنین اور مجرم کافروں کے مستقبل کے بارے میں بیان ہوئی ہے اور "ذالک جزاء من تزکیٰ" (یہ اس کی جزا ہے جو پاکیزگی اختیار کرے) کے جملہ پر ختم ہوتی ہے اور وہ اوصاف بھی کہ جو جنت اور دوزخ کے بارے میں اس میں بیان ہوئے ہیں، دوسرے نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ کیونکہ جادوگر ایسی بات جبھی کر سکتے تھے کہ انہوں نے اس مختصر سی مدت میں معرفت و علوم الٰہی کا وافر حصہ حاصل کر لیا ہو، کہ جس کی بنا پر وہ جنت و دوزخ اور مومنین و مجرمین کے انجام کے بارے میں اس قسم کا دوٹوک اور آگاہانہ فیصلہ کر سکیں۔

مگر یہ کہ ہم یہ کہیں کہ خدا نے ان کے ایمان کی وجہ سے یہ پُرمعنی باتیں ان کی زبان پر جاری کر دی تھیں۔ اگرچہ یہ بات خدائی تربیت اور نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں ڈالتی کہ خدا نے خود فرمایا ہو یا خدا کی طرف سے تعلیم یافتہ مومنین نے خاص طور پر جبکہ قرآن اسے تائید کے لہجے میں بیان کر رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

## چند اہم نکات :

**۱۔ علم، ایمان و انقلاب کا سرچشمہ ہے :** سب سے اہم مسئلہ کہ جو زیر بحث آیات میں نظر آتا ہے، موسیٰ کے مقابلے میں آنے پر جادوگروں میں پیدا ہونے والی گہری اور فوری تبدیلی ہے۔ وہ جس وقت حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، تو ان کے انتہائی سخت دشمن تھے لیکن حضرت موسیٰؑ کا پہلا ہی معجزہ دیکھ کر اس طرح سے ہل گئے، بیدار ہو گئے اور انہوں نے اپنے راستے کو بدل لیا کہ سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔

کفر سے ایمان کی طرف، انحراف سے درستی و استقامت کی طرف، کجی سے راستی کی طرف اور ظلمت سے نور کی طرف، اس فوری اور تیزی کے ساتھ راستے کی تبدیلی نے سب کو ایسی بوکھلاہٹ میں ڈالا کہ شاید فرعون کو بھی اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ لہٰذا اس نے کوشش کی کہ اسے ایک پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ اور سازش قرار دے حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ بات جھوٹی ہے۔

کونسا عامل اس گہرے اور سریع انقلاب ذہنی کا سبب بنا اور کونسے عامل نے نور ایمان اس قوت سے ان کے دل میں چمکایا کہ وہ



Marfat.com

اپنے وجود اور ہستی تک کو اس کام کی خاطر داؤ پر لگانے کے لیئے تیار ہو گئے —— یہاں تک کہ تاریخ کہتی ہے کہ فرعون نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا اور انہیں اس وحشیانہ طریقے سے شہید کر دیا۔

کیا علم و آگاہی کے سوا کوئی اور عامل یہاں دکھائی دیتا ہے؟ وہ چونکہ جادو کے فنون اور رموز سے آشنا تھے، اور انہوں نے صاف طور پر جان لیا تھا کہ موسیٰؑ کا کام جادو نہیں ہے بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی جرأت سے اور قاطع انداز میں اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔
اس سے ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ افراد یا معاشرے میں تبدیلی لانے اور ایک تیز اور سچا انقلاب پیدا کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے انہیں علم و آگاہی دینے کی ضرورت ہے۔[1]

**۲۔ ہم تجھے "بیّنات" پر مقدم نہیں کرتے:** یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ انہوں نے بے منطق و دلیل فرعون کے مقابلے میں منطقی ترین تعبیر کو اختیار کیا۔ پہلے انہوں نے کہا کہ ہم نے موسیٰ کی حقانیت اور اس کی خدائی دعوت پر روشن اور واضح دلائل پائے ہیں اور ہم کسی بھی چیز کو ان روشن اور واضح دلائل پر مقدم نہیں کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے "والذی فطرنا" (قسم ہے اس کی جس نے ہمیں خلق فرمایا) کہہ کر اس مطلب کی تاکید کی۔ کلمہ "فطرنا" ان کی فطرتِ توحیدی کی طرف گویا ایک اشارہ ہے یعنی ہم اپنی رُوح کے اندر بھی نورِ توحید کی جھلک دیکھ رہے ہیں اور دلیل عقل سے بھی سمجھ رہے ہیں۔ تو ان واضح و آشکار دلائل کے ہوتے ہوئے، ہم اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر کیسے چل سکتے ہیں؟

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے "والذی فطرنا" کو قسم کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اسے "ماجائنا من البینات" پر عطف جانا ہے۔ اس بنا پر پُورے جملے کا معنی اس طرح ہو گا: "ہم تجھے ان واضح و روشن دلائل اور اُس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے ہرگز مقدم نہ کریں گے۔"

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر عطف کچھ مناسب نہیں ہے (غور کیجیئے گا)۔

**۳۔ مجرم سے کون مراد ہے؟** زیر بحث آیات میں ہے: "جو شخص بھی میدان محشر میں مجرم (کی حیثیت سے) وارد ہو گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔"

اس کا ظاہری معنی ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر مجرم کا انجام یہی ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ بعد والی آیات میں کہ جو اس کے فریق مقابل کو بیان کرتی ہیں، لفظ "مؤمن" آیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "مجرم" سے مراد کافر ہے۔ علاوہ ازیں اس لفظ کا کافر کے معنی میں استعمال قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں دکھائی دیتا ہے۔

مثلاً، قوم لوط کے بارے میں کہ جو ہرگز اپنے پیغمبر پر ایمان نہیں لائی، یہ بیان ہوا ہے کہ:

واَمطرنا علیهم مطرًا فانظر کیف کان عاقبة المجرمین

ہم نے اُن پر پتھروں کی بارش کی، پس دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا؟ (اعراف - ۸۴)

---

[1] اس سلسلے میں ہم —— سورہ اعراف کی آیہ ۱۲۳ تا ۱۲۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔ دیکھئے جلد ۶ ص ۲۵۹ (اردو ترجمہ)



Marfat.com

اور سورہ فرقان کی آیہ ۳۱ میں ہے:

وكذالك جعلنا لكل نبی عدوا من المجرمين

ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے کچھ دشمن قرار دیئے ہیں۔

**۴۔ ماحول کی مجبوری ایک بہانہ ہے:** زیرنظر آیات میں جادوگروں کی سرگزشت نے یہ بات واضح کردی ہے کہ ماحول کی مجبوری کا مسئلہ ایک جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان فاعل مختار ہے اور ارادے کی آزادی کا مالک ہے۔ جس وقت بھی وہ مصمم ارادہ کرے اسی وقت باطل کی طرف سے حق کی جانب اپنے راستے کو بدل سکتا ہے، چاہے اس کے ماحول کے تمام لوگ گناہ میں غرق اور منحرف ہی ہوں۔ وہ جادوگر جو سالہا سال سے اسی شرک آلود ماحول میں نہایت شرک آمیز اعمال کے خود مرتکب ہو رہے تھے، جس وقت انہوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ حق کو قبول کریں اور اس کے راستہ میں عاشقانہ انداز میں ڈٹ جائیں تو وہ کسی دھمکی سے نہ ڈرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی کے قول کے مطابق:

"کانوا اول النهار کفاراً سحرة و اخر النهار شهداء بررة!"

وہ صبح کے وقت تو کافر اور جادوگر تھے اور شام کے وقت راہِ حق کے نیکوکار شہید بن گئے۔[1]

اس سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح اور روشن ہوجاتی ہے کہ مذہب کی پیدائش کے بارے میں مادیین خصوصاً مارکسسٹوں کے افسانے کس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں، وہ ہر تحریک کا عامل اور سبب اقتصادی مسائل ہی کو سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا کیونکہ جادوگر شروع میں ایک طرف تو فرعون کے غلبہ و اقتدار کے دباؤ سے، اور دوسری طرف اس کے اقتصادی لالچ میں آکر حق کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تھے لیکن اللہ پر ایمان نے ان سب چیزوں کو ختم کردیا۔ انہوں نے مال و مقام کو بھی کہ جس کا فرعون نے اُن سے وعدہ کیا تھا ایمان کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنی عزیز جان بھی اس عشق میں قربان کردی۔

⁂

۷۷۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ○

۷۸۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝

۷۹۔ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ○

⁂

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۴، ص ۴۶۳ (آیہ ۱۲۶ سورہ اعراف کے ذیل میں)۔



Marfat.com

# ترجمہ

۷۷۔ ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے) اپنے ساتھ لے جا اور ان کے لیے دریا میں سے خشک راستہ بنا دے تاکہ نہ تو (فرعونیوں کے) تعاقب سے تجھے خوف ہو اور نہ دریا میں غرق ہونے کا ڈر ہو۔

۷۸۔ (اس طرح سے) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور دریا نے انہیں (اپنی پرخروش موجوں کے درمیان) پوری طرح چھپا لیا۔

۷۹۔ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور ہرگز ہدایت نہ کی۔

# تفسیر

## بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کا غرق ہونا:

جب حضرت موسٰیؑ نے جادوگروں پر دو ٹوک اور نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور کثیر تعداد میں موجود یہ جادوگر آپ پر ایمان لے آئے تو آپ کا دین باقاعدہ طور پر مصر کے لوگوں کے افکار و اذہان میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ قبطیوں کی اکثریت نے اُسے قبول نہیں کیا لیکن یہ ان کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ بنا رہا۔ مصر میں بنی اسرائیل اقلیت میں تھے تاہم حضرت موسٰیؑ کی رہبری میں ہمیشہ کے لیے آل فرعون کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔

کئی سال اسی طرح سے گزر گئے اور کئی تلخ و شیریں حادثات پیش آئے۔ جن کے بعض حصے قرآن نے سورۂ اعراف کی آیہ ۱۲۷ کے بعد بیان کیے ہیں۔

زیر بحث آیات میں ان واقعات کا آخری حصہ یعنی بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:
ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے باہر نکال کر لے جا (ولقد اوحینا الی موسٰی ان اسر بعبادی)۔

بنی اسرائیل، معینہ علاقے (فلسطین) کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن جس وقت وہ دریائے نیل کے کنارے پر پہنچے تو فرعونیوں کو خبر ہو گئی۔ فرعون نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو دریا اور دشمن کے محاصرہ میں پایا۔ ایک طرف عظیم دریائے نیل اور دوسری طرف غیض و غضب میں ڈوبا ہوا طاقتور اور خونخوار دشمن۔

لیکن خدا تو یہ چاہتا تھا کہ اس صاحب ایمان، محروم و ستم رسیدہ قوم کو ظالموں کے چنگل سے نجات بخشے اور ستمگروں کو ہلاک و نابود کر دے۔

اُس نے موسٰی کو حکم دیا: "ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا دے" (فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا)۔
ایسا راستہ کہ جس وقت تم اس میں قدم رکھو تو "نہ فرعونیوں کے پیچھا کرنے کا خوف ہو اور نہ ہی دریا میں غرق ہونے کا":



Marfat.com

(لا تخاف درکاً ولا تخشیٰ)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نہ صرف راستہ بن گیا بلکہ یہ راستہ، خدا کے حکم سے ایک خشک راستہ تھا۔ حالانکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اگر دریا یا سمندر کا پانی ہٹ بھی جائے تو پھر بھی اس کی نشیبی جگہیں مدتوں قابلِ عبور نہیں ہوتیں۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے کہ "درک" (بروزن "مرگ") سمندر کی گہرائی کے سب سے نچلے حصہ کے معنی میں ہے اور اُس رسّی کو بھی "درک" (بروزن "محک") کہا جاتا ہے جسے دوسری رسی کے ساتھ اس لیے جوڑتے ہیں تاکہ وہ پانی تک پہنچ جائے۔ اسی طرح وہ خسارے، جو انسان کو اُٹھانے پڑتے ہیں انہیں بھی "درک" کہتے ہیں۔ "درکات نار" "درجات جنت" کے مقابلہ میں، دوزخ کے نچلے مراحل کے معنی میں ہے۔

لیکن سورۂ شعراء کی آیت ۶۱ کے مطابق — جب بنی اسرائیل فرعون کے لشکر کی آمد سے باخبر ہوئے تو انہوں نے موسیٰ سے کہا "انا لمدرکون" "ہم تو فرعونیوں کے چنگل میں پھنس گئے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "درک" سے مراد یہ ہے کہ تمہیں اس طرح سے گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا، اور "لا تخشیٰ" کا مطلب یہ ہے کہ دریا کا بھی تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

٭ ٭ ٭

اس طرح موسیٰ اور بنی اسرائیل ان راستوں میں داخل ہوگئے کہ جو دریا میں پانی کے ہٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے۔ اس موقع پر فرعون اپنے لشکر کے ساتھ دریا کے کنارے پر پہنچ گیا اور اس نے یہ غیر متوقع اور حیرت انگیز منظر دیکھا "اور فرعون نے اپنے لشکر کو بنی اسرائیل کے پیچھے لگا دیا۔ اور خود بھی اسی راستہ پر چلنے لگا" (فاتبعهم فرعون بجنوده)[1]

مسلّمہ طور پر فرعون کا لشکر شروع میں اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس خطرناک ناشناختہ جگہ میں قدم رکھے اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرے۔ کم از کم ایسے عجیب و غریب معجزے کا مشاہدہ اُنہیں اس راستے پر چلنے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن فرعون — جس کے دماغ میں غرور و نخوت کی ہوا بھری ہوئی تھی — ہٹ دھرمی اور سرکشی پر تلا ہوا تھا، وہ ایک ایسے عظیم معجزے کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر گیا اور اپنے لشکر کو ان انجانے دریائی راستوں میں داخل ہونے کے لیے اُبھارا۔

ادھر فرعون کے لشکر کا پہلا آدمی دریا میں اُترا اور اُدھر بنی اسرائیل کا آخری شخص دریا سے باہر نکل گیا۔

اُس وقت پانی کی موجوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئیں، موجیں اُس فرسودہ عمارت کی مانند کہ جس کی بنیادیں نکال دی جائیں، ایک دم ان کے اُوپر آ پڑیں: "اور وہ پوری طرح دریا کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کے نیچے چھپ گئے" (فغشيهم من اليم ما غشيهم)[2]

اور اس طرح سے ایک جابر و ستمگر اپنے طاقتور اور زبردست لشکر کے ساتھ پانی کی موجوں میں غوطے کھانے لگا اور اُس کے لشکری

---

[1] اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "با" "بجنوده" میں "مع" کے معنی میں ہے اور اس جملہ کا یہ معنی ہے: "فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کیا" اگرچہ ان دونوں تفسیروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

[2] "یم" سمندر کے معنی میں ہے اور عظیم دریا کے معنی بھی دیتا ہے۔ بعض محققین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک قدیم مصری لغت کا لفظ ہے نہ کہ عربی۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد صـ ۲۸۲ (اُردو ترجمہ) کے حاشیہ کی طرف رجوع کریں۔



Marfat.com

دریا کی مچھلیوں کا لقمہ بن گئے۔

ہاں "فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہرگز انہیں ہدایت نہ کی" (واضل فرعون قومه وماهدٰی)۔

یہ ٹھیک ہے کہ "اضل" اور "ماهدٰی" کے جملے تقریباً ایک ہی مفہوم دیتے ہیں اور شاید اسی بنا پر بعض مفسرین نے اسے تاکید سمجھا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں فرق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "اضل" تو گمراہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اور "ماهدٰی" گمراہی کے واضح اور روشن ہونے کے بعد ہدایت نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ، ایک رہبر سے بعض اوقات اشتباہ بھی ہو جاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو غلط اور انحرافی راستہ پر چلانے لگتا ہے لیکن جب وہ متوجہ ہو تو فوراً انہیں صحیح راستہ کی طرف پلٹا کرلے جاتا ہے لیکن فرعون اس قدر ہٹ دھرم تھا کہ گمراہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اس نے اپنی قوم سے حقیقت کو بیان نہیں کیا اور انہیں اس طرح سے بے راہ روی کی طرف کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اور اس کی قوم سب نابود ہو گئے۔

بہرحال یہ جملہ درحقیقت فرعون کی اُس بات کی کہ جو سورۂ مومن کی آیہ ۲۹ میں بیان ہوئی ہے نفی کرتا ہے:

وما اهديكم الاسبيل الرشاد

میں تمہیں سیدھی راہ کی ہی ہدایت کرتا ہوں۔

واقعات نے نشاندہی کر دی ہے کہ اس کا یہ جملہ ــ اس کے دوسرے جھوٹوں کی طرح ــ ایک بہت بڑا جھوٹ تھا۔

٭ ٭ ٭

۸۰۔ يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى ۝

۸۱۔ كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَلَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ‌ ۚ وَمَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى ۝

۸۲۔ وَاِنِّىۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰى ۝

## ترجمہ

۸۰۔ اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمن (کے چنگل) سے نجات دی اور کوہِ طور کی دائیں طرف کے لیے تمہارے ساتھ وعدہ کیا اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا۔



Marfat.com

۸۱ - وہ پاکیزہ رزق کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کھاؤ۔ لیکن اس میں سرکشی نہ کرو (ورنہ) میرا غضب تم پر آئے گا اور جس پر میرا غضب آیا وہ تباہ ہو گیا۔

۸۲ - میں ان لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کر لیں، ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، اس کے بعد ہدایت پر رہیں۔

# تفسیر

## نجات کی واحد راہ :

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی آل فرعون کے چنگل سے نجات کا بیان ایک عظیم معجزہ کی صورت میں کیا گیا تھا۔ اب زیر نظر تینوں آیات میں بنی اسرائیل سے عمومی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اور انہیں وہ عظیم نعمتیں یاد دلائی جا رہی ہیں جو خدا نے انہیں بخشی ہیں اور انہیں راہ نجات کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : اے بنی اسرائیل ! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن کے چنگل سے رہائی بخشی (یا بنی اسرائیل قد انجیناکم من عدوکم)۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مثبت فعالیت کی بنیاد دوسروں کے تسلط اور غلبہ سے نجات پانا اور استقلال و آزادی کا حصول ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلے اسی چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : "ہم نے تمہیں ایک مقدس وعدہ گاہ کی طرف دعوت دی۔ کوہ طور کے دائیں طرف، جو وحی الٰہی کا مرکز ہے : (وواعدناکم جانب الطور الایمن)۔

یہ حضرت موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے ساتھ طور کی وعدہ گاہ کی طرف جانے کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی وعدہ گاہ میں خدا نے موسیٰؑ پر تورات کی الواح نازل کیں اور اُن سے باتیں کیں اور پروردگار کے جلوۂ خاص کا سب نے مشاہدہ کیا۔[۱]

اس کے بعد ایک اہم مادی نعمت ــ کہ جو بنی اسرائیل کے لیے خدا کا ایک لطفِ خاص تھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ہم نے تم پر "من" و "سلویٰ" نازل کیا: (و نزلنا علیکم المن والسلویٰ)۔

جب تم اُس بیابان میں سرگردان تھے۔ پاس کوئی مناسب غذا نہیں تھی، تو لطفِ خدا تمہاری مدد کے لیے آگے بڑھا۔ لذیذ اور خوش مزہ کھانا اتنی مقدار میں کہ جتنی تمہیں ضرورت تھی، تمہیں مہیا کیا۔ تم اُس سے استفادہ کرتے رہے۔

اس بارے میں کہ "من وسلویٰ" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت بحث کی ہے، جیسے ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں (سورہ بقرہ کی آیہ ۵۷ کے ذیل میں) بیان کیا ہے اور مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد ہم نے لکھا ہے کہ، بعید نہیں ہے کہ "من" ایک قسم کا طبیعی شہد ہو کہ جو اس بیابان کے قریب کے پہاڑوں میں پایا جاتا تھا، یا یہ ایک مخصوص قسم کا قوت بخش نباتی شیرہ ہو، کہ جو اس بیابان کے اطراف میں اُگے ہوئے درختوں سے نکلتا تھا اور "سلویٰ" ایک قسم کا حلال گوشت کبوتر کے مشابہ پرندہ تھا (مزید وضاحت

---

[۱] اس واقعہ کی تفصیل چھٹی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۵۵، ۱۵۶ کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔



Marfat.com

کے لیے جلد اوّل میں مذکورہ آیت کے ذیل میں رجوع کریں)۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں ان تینوں بیش بہا نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انہیں اس طرح سے خطاب کرتا ہے: ہم نے جو پاکیزہ روزی تمہیں دی ہے اس میں سے کھاؤ، لیکن اس میں سرکشی نہ کرنا (کلوا من طیبات مارزقناکم ولا تطغوا فیه)۔

نعمتوں میں طغیان یہ ہے کہ انسان ان سے خدا کی اطاعت اور اپنی سعادت کے لیے استفادہ کرنے کی بجائے، ان کو گناہ، ناشکری، کفرانِ نعمت، سرکشی اور اِدھر اُدھر کے افکار کا اسیر بننے کا ذریعہ بنالے جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ ان کو یہ تمام خدائی نعمتیں حاصل تھیں اور پھر بھی کفر و طغیان و گناہ کی راہ پر چل پڑے۔

اس کے بعد انہیں خبردار کیا گیا ہے: اگر تم طغیان و سرکشی کرو گے تو میرا غضب تمہیں دامن گیر ہو جائے گا (فیحل علیکم غضبی)۔

اور جس پر میرا غضب نازل ہو جائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے: (ومن یحلل علیه غضبی فقد هوی)۔

"هوی" دراصل بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے، کہ جس کا نتیجہ عام طور پر نابود ہونا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر مرتبہ و مقام سے گرنا، اور قربِ پروردگار سے دُوری اور اس کی جناب سے راندۂ درگاہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

چونکہ یہ بات ہمیشہ ضروری ہے کہ تنبیہ و تہدید کے ساتھ ساتھ تشویق و بشارت بھی ہو تاکہ اُمید و بیم کی قوت کو — کہ جو ارتقاء و تکامل کے لیے بنیادی عامل ہے — یکساں طور پر اُبھارے اور توبہ کرنے والوں کے لیے واپسی کے دروازوں کو کھُلا رکھے۔ لہٰذا بعد والی آیت کہتی ہے: میں اُن لوگوں کو بخش دوں گا کہ جو توبہ کرلیں، ایمان لے آئیں، نیک عمل انجام دیں۔ اور اس کے بعد ہدایت پر بھی قائم رہیں: (وانی لغفار لمن تاب وآمن وعمل صالحاً ثم اهتدی)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "غفار" مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خدا اس قسم کے لوگوں کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ بار بار، اپنی بخشش اور مغفرت سے نوازتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ توبہ کی پہلی شرط گناہ کا ترک کرنا ہے اور جب انسان کی رُوح سے گناہوں کی آلودگی برطرف ہو جائے تو اس کے بعد دوسری شرط یہ ہے کہ خدا پر ایمان اور توحید کا نور اس میں جلوہ گر ہو۔

اور تیسرے مرحلہ میں ایمان و توحید کے شگوفے — جو کہ اعمالِ صالح اور پسندیدہ کام ہیں — وجودِ انسان کی شاخوں پر پھُوٹنے چاہئیں۔ لیکن قرآن کی دوسری تمام آیات کے برخلاف — کہ جو صرف توبہ، ایمان اور عملِ صالح کی بات کرتی ہیں — یہاں پر چوتھی شرط کا "ثم اهتدی" کے عنوان کے تحت اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کے معنی کے بارے میں مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کی مختلف تفسیروں میں دو زیادہ جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہیں۔

**پہلی تفسیر:** تو یہ ہے کہ یہ راہِ ایمان و تقویٰ اور عملِ صالح کو دوام بخشنے اور جاری رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی توبہ گزشتہ گناہوں کو تو دھو ڈالتی ہے اور باعثِ نجات بنتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر اُسی شرک و گناہ کے گڑھے میں نہ جا گرے



Marfat.com

اور وہ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھے کہ شیطانی وسوسے اور اس کا نفس اُسے سابقہ راستے پر ہی نہ لے جائیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ جملہ خدائی رہبروں کی رہبری کو قبول کرنے اور ان کی ولایت کو تسلیم کرنے کے وجوب کی طرف اشارہ ہے یعنی توبہ و ایمان و عمل صالح اسی وقت باعثِ نجات ہو سکتے ہیں کہ جب یہ خدائی رہبروں کی ہدایت کے زیرِ سایہ انجام پذیر ہوں۔ وہ ایک زمانے میں موسیٰؑ تھے، دوسرے زمانہ میں پیغمبر اسلامؐ تھے۔ ان کے بعد امیرالمومنین علی علیہ السلام تھے اور آج حضرت مہدی (سلام اللہ علیہ) ہیں۔

کیونکہ ارکانِ دین میں سے ایک پیغمبر کی دعوت اور ان کی رہبری کو قبول کرنا ہے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔

مرحوم طبرسی اس آیت کے ذیل میں امام باقرؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"ثم اھتدٰی" کے جملہ سے مراد ہم اہل بیتؑ کی ولایت کی ہدایت ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

فواللہ لوان رجلا عبد اللہ عمرہ مابین الرکن والمقام ثم مات ولم یجیٔ بولایتنا لاکبہ اللہ فی النار علی وجھہ

خدا کی قسم اگر کوئی شخص تمام عمر (خانہ کعبہ کے پاس) رکن و مقام کے درمیان عبادت کرے اور پھر دنیا سے اس حالت میں جائے کہ ہماری ولایت کو اُس نے قبول نہ کیا ہو، تو خدا اُسے منہ کے بل جہنم کی آگ میں پھینکے گا۔

اس روایت کو اہلِ سُنّت کے مشہور محدث "ابوالقاسم حاکم حسکانی" نے بھی نقل کیا ہے۔[۱]

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اصل کو ترک کرنا، کس حد تک موجب ہلاکت و تباہی ہے، بعد کی آیات میں غور و فکر کرنا ہی کافی ہے کہ بنی اسرائیل، موسیٰؑ اور اُن کے جانشین ہارونؑ کی ولایت کے دامن کو چھوڑنے اور ان کی ہدایت کی پیروی سے باہر نکل جانے کے سبب کس طرح سے گوسالہ پرستی اور شرک و کفر میں گرفتار ہو گئے۔

آلوسی نے تفسیر رُوح المعانی میں ان روایات میں سے کچھ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اہلِ بیتؑ کی محبت واجب ہونے میں تو ہمارے نزدیک بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا بنی اسرائیل اور موسیٰؑ کے زمانے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے ——

ہماری مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ آلوسی کا یہ اشکال بے بنیاد ہے۔

چونکہ اول تو بحث محبت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بات رہبری کو قبول کرنے سے متعلق ہے اور دوسرے اہل بیتؑ میں رہبری کو منحصر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ موسیٰؑ کے زمانے میں وہ اور ان کے بھائی ہارون رہبر تھے، اور ان کی ولایت کو قبول کرنا واجب تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آنحضرتؐ کی ولایت اور آئمہ اہلِ بیتؑ کے زمانے میں اُن کی ولایت کو قبول کرنا واجب تھا۔

---

[۱] مجمع البیان، آیۂ زیر بحث کے ذیل میں۔



Marfat.com

یہ بات بھی بالکل واضح و روشن ہے کہ اس آیت کے مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں لیکن یہ بات انہیں میں منحصر نہیں ہے بلکہ جو بھی شخص یا گروہ ان چاروں مراحل کو طے کرے گا، خدا کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال ہوگی۔

* * *

۸۳۔ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ○

۸۴۔ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ○

۸۵۔ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ○

۸۶۔ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ○

۸۷۔ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ ○

۸۸۔ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۵ فَنَسِىَ ○

۸۹۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ○ع

۹۰۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِىْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِىْ ○

۹۱۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ○



Marfat.com

# ترجمہ

۸۳۔ اے موسیٰ! کیا سبب ہوا کہ تو (کوہِ طور پر آنے کے لیے) اپنی قوم سے جلدی کر کے آگے پہنچ گیا؟

۸۴۔ عرض کیا: پروردگارا! وہ تو میرے پیچھے پیچھے (آ رہے) ہیں اور میں نے تیری طرف (آنے کی اس لیے) جلدی کی ہے تاکہ تُو مجھ سے راضی ہو۔

۸۵۔ فرمایا: ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

۸۶۔ موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے پلٹے اور (ان سے) کہا: اے میری قوم! کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہو گئی ہے یا تم یہ چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب ٹوٹ پڑے کہ تم نے میرے وعدے کی مخالفت کی ہے۔

۸۷۔ انہوں نے کہا: ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے تو تیرے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (ہوا یہ کہ) ہم (فرعون کی) قوم کے کچھ زیورات اٹھا لائے تھے، ہم نے ان کو (آگ میں) ڈال دیا اور سامری نے بھی اسی طرح (زیور آگ میں) ڈال دیا۔

۸۸۔ پھر اُس نے (انہی پگھلے ہوئے زیورات سے) ان کے لیے ایک بچھڑا بنا ڈالا وہ ایک ایسی مورت تھی جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی اور لوگوں نے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا بھی یہی ہے۔ (مگر) اُس (سامری) نے فراموش کر دیا۔ (اُس عہد و پیمان کو جو اُس نے خدا سے باندھا تھا)۔

۸۹۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ (یہ بچھڑا) ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔

۹۰۔ اور ہارون نے اُن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے (میری) قوم! تمہاری اس بچھڑے کے ذریعے سے آزمائش کی گئی ہے اور بلاشبہ تمہارا پروردگار (تو) خدائے رحمٰن ہے۔ پس تم میری پیروی کرو اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔

۹۱۔ (اس پر) انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تو (عبادت کے لیے) اسی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ (اور بچھڑے کی پرستش ہی جاری رکھیں گے) جب تک کہ خود موسیٰ ہمارے پاس پلٹ کر نہ آئیں۔

# تفسیر

## سامری کا شور و غوغا:

ان آیات میں موسیٰ اور بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور اہم حصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کے نمائندوں کے ساتھ کوہِ طور کی وعدہ گاہ پر جانے اور پھر ان کی غیبت کے زمانے میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔ پروگرام یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ تورات کے احکام حاصل کرنے کے لیے کوہِ طور پر جائیں اور بنی اسرائیل کے کچھ افراد بھی اس سفر



Marfat.com

میں ان کے ساتھ رہیں تاکہ اس سفر میں خدا شناسی اور وحی کے بارے میں نئے حقائق ان کے لیے آشکار ہوں۔

پروردگار سے مناجات کا شوق اور وحی کی آواز سننے کا اشتیاق حضرت موسیٰؑ کے دل میں موجزن تھا۔ اس طرح سے کہ گویا آپ کو اپنی خبر نہ تھی، اور یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ آپ کو کھانے پینے اور آرام کا ہوش نہ تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ یہ راستہ طے کیا اور دوسروں سے پہلے اکیلے ہی پروردگار کی وعدہ گاہ میں پہنچ گئے۔

یہاں آپ پر وحی نازل ہوئی "اے موسیٰ! کیا سبب ہوا کہ اپنی قوم سے پہلے ہی آ پہنچا اور اس قدر جلدی کی کہ ( وما اعجلك عن قومك یاموسیٰ)۔

موسیٰ نے فوراً عرض کیا: پروردگارا! وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں اور میں نے تیری میعادگاہ اور محضرِ وحی تک پہنچنے کے لیے اس لیے جلدی کی ہے تاکہ تو مجھ سے راضی اور خوشنود ہو ( قال ھم اولاء علیٰ اثری وعجلت الیك رب لترضیٰ)۔

نہ صرف تیری مناجات اور تیری بات سننے کے عشق نے مجھے بے قرار کیا ہوا تھا بلکہ میں مشتاق تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے تیرے قوانین و احکام حاصل کروں اور تیرے بندوں تک انہیں پہنچاؤں اور اس طرح خوب تیری رضا حاصل کروں۔ ہاں! میں تیری رضا کا عاشق ہوں اور تیرا فرمان سننے کا مشتاق ہوں۔

❊ ❊ ❊

لیکن آخر میں، پروردگار کے معنوی جلووں کے دیدار کی مدت تیس راتوں سے بڑھا کر چالیس راتیں کر دی گئی اس طرح مختلف قسم کے اسباب جو پہلے سے ہی بنی اسرائیل میں انحراف کے لیے موجود تھے، اپنا کام کر گئے۔ سامری جیسا ہوشیار اور منحرف آدمی استاد بن گیا۔ اس نے کچھ چیزوں سے کام لے کر ایک بچھڑا بنایا اور قوم کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ چند ایسی باتیں رونما ہوئیں کہ جو مل کر توحید سے کفر کی طرف اُن کے عظیم انحراف کا سبب بنیں جیسے مصریوں کی گوسالہ پرستی یا دریائے نیل کو عبور کرنے کے بعد بُت پرستی (گاؤ پرستی) کا منظر دیکھنا اور ان کا اُنہیں کی مانند بت بنانے کی خواہش کرنا اور اسی طرح موسیٰؑ کی طور پر ٹھہرنے کی مدت بڑھ جانا اور منافقین کی طرف سے ان کی موت کی خبر اُڑانا اور آخر کار اس قوم کی جہالت و نادانی نے اثر دکھایا کیونکہ اجتماعی واقعات و حادثات عام طور پر کسی تمہید کے بغیر پیش نہیں آتے۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو یہ مقدمات آشکار اور واضح ہوتے ہیں اور کبھی چھپے ہوئے۔

بہرحال شرک اپنی بدترین صورت میں بنی اسرائیل کو دامن گیر ہو گیا۔ خاص طور پر جبکہ قوم کے بزرگ بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ میعادگاہ میں موجود تھے اور اس قوم کے رہبر صرف ہارونؑ ہی تھے اور ان کا کوئی مؤثر حامی و مددگار بھی موجود نہیں تھا۔

آخر کار یہی موقع تھا کہ خدا نے موسیٰؑ کو اسی میعادگاہ میں فرمایا: ہم نے تمہاری قوم کی تمہارے بعد آزمائش کی ہے لیکن وہ اس امتحان میں پورے نہیں اُترے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے: ( قال فانا قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری)۔

حضرت موسیٰؑ یہ بات سنتے ہی ایسے پریشان ہو گئے گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ شاید وہ دل ہی دل میں



Marfat.com

کھتے ہوں گے۔ میں نے سالہا سال تک خونِ جگر پیا، زحمتیں اُٹھائیں، ہر قسم کے خطرے کا سامنا کیا۔ تب جا کر کہیں اس قوم کو توحید سے آشنا کیا لیکن افسوس صد افسوس امیری چند روزہ غیبت میں میری محنتیں برباد ہوگئیں۔

لہذا فوری طور پر "موسیٰ غصے میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف پلٹے" (فرجع موسیٰ الی قومه غضبان اسفاً)۔

جس وقت ان کی نگاہ، گوسالہ پرستی کے اِس تکلیف دہ منظر پر پڑی تو وہ چیخ اُٹھے، اے میری قوم! "کیا تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا": (قال یا قوم الم یعدکم ربکم وعداً حسناً)۔

یہ اچھا وعدہ یا تو وہ وعدہ تھا کہ جو بنی اسرائیل سے تورات کے نزول اور اس میں آسمانی احکام کے بیان کے سلسلے میں کیا گیا تھا یا یہ نجات پانے اور آلِ فرعون پر کامیابی حاصل کرنے اور زمین کی حکومت کا وارث بن جانے کا وعدہ تھا یا یہ اُن لوگوں کے لیے کہ جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح بجالائیں، مغفرت اور بخشش کا وعدہ تھا یا ان تمام امور سے متعلق وعدہ تھا۔

اس کے بعد مزید کہا: "کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہوگئی ہے؟" (افطال علیکم العھد)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: میں نے مانا کہ میری واپسی کی مدت تیس دن سے بڑھ کر چالیس دن ہوگئی تھی مگر یہ کوئی ایسا زیادہ طولانی زمانہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں خود ہی نہیں چاہیئے تھا کہ اس مختصر سی مدت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے۔ یہاں تک کہ اگر میں سالہا سال بھی تم سے دُور رہتا تو بھی خدا کا دین کہ جس کی میں نے تمہیں تعلیم دی ہے اور وہ معجزات کہ جن کا تم نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے ـــ تمہارے پیش نظر ہونے چاہئیں تھے اور تمہیں میری تعلیمات کی پیروی کرنا چاہیئے تھی۔

"یا تم اپنے اس قبیح عمل کے ذریعے یہ چاہتے تھے کہ تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو، جبھی تو تم نے مجھ سے باندھے ہوئے عہد کی مخالفت کی ہے" (ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی)۔[1]

میں نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم عقیدۂ توحید، اور پروردگار کی خالص اطاعت کی راہ پر قائم رہوگے اور اس سے معمولی سا انحراف بھی نہیں کروگے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری عدم موجودگی میں میری ان ساری باتوں کو بھلا دیا اور میرے بھائی ہارون کا حکم ماننے سے بھی تم نے انکار کر دیا۔

⁂

بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ موسیٰؑ ان پر سخت غصے میں ہیں اور اس بات پر متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے بہت ہی بُرا کام انجام دیا ہے تو عذر تراشی پر اُتر آئے اور کہنے لگے: ہم نے اپنے اختیار کے ساتھ تو تیرے عہد کی خلاف ورزی نہیں کی" (قالوا ما اخلفنا موعدك بملكنا)۔[2]

---

[1] یہ بات واضح ہے کہ کسی بھی شخص کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لیے پروردگار کا غضب خریدے لہذا اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ تمہارا عمل اس قسم کا ہے کہ گویا تم نے خود اپنے لیے اس قسم کا ارادہ کر لیا ہے۔

[2] "مَلک" (بروزن درک) اور "مُلک" (بروزن پلک) دونوں کسی چیز کے مالک ہونے کے معنی میں ہیں اور بنی اسرائیل کی اس سے مراد یہ تھی کہ ہم اس کام کے کرنے میں صاحب اختیار اور مالک نہیں تھے بلکہ ہم اس سے ایسے متاثر ہوئے کہ دین و دل ہاتھ سے جاتا رہا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)



Marfat.com

دراصل ہم خود اپنے ارادے سے گوسالہ پرستی کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے۔" فرعونیوں کے کچھ قیمتی زیورات ہمارے ساتھ تھے کہ جنہیں ہم نے اپنے سے دُور پھینک دیا اور سامری نے بھی انہیں پھینک دیا" (ولٰکنا حملنا اوزارًا من زینة القوم فقذفناها فکذالك القی السامری)۔

اِس بارے میں کہ بنی اسرائیل نے کیا کیا اور سامری نے کیا کیا اور اُوپر والی آیات کے جملوں کا حقیقتاً کیا معنی ہے؟ اس میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں کہ جن میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "قذفناها" یعنی ہم نے اُن زیورات کو جنہیں مصر سے چلنے سے پہلے فرعونیوں سے لیا تھا۔ آگ میں پھینک دیا۔ سامری کے پاس بھی جو کچھ تھا، اُس نے بھی آگ میں پھینک دیا۔ یہاں تک کہ وہ پگھل گئے تو اُس نے اُن سے گوسالہ بنا لیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے زیورات کو اپنے سے دُور پھینک دیا اور سامری نے انہیں اٹھا کر آگ میں ڈال دیا تاکہ اس سے گوسالہ بنائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فکذالك القی السامری" ان سارے منصوبوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سامری نے جاری کیے تھے۔

بہرحال یہ عام معمول ہے کہ جس وقت کوئی بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو اُس گناہ کے بارے میں کہ جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں ملامت کرتا ہے، تو وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی طرف سے گناہ کی تردید کریں اور کسی دوسرے کی گردن پر ڈال دیں۔ بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی کرنے والوں نے بھی، جو اپنے ارادہ اور رغبت کے ساتھ توحید سے شرک کی طرف مائل ہوئے تھے۔ یہی چاہا کہ سارا گناہ سامری کی گردن پر ڈال دیں۔

بہرحال سامری نے فرعونیوں کے آلاتِ زینت سے کہ جو فرعونیوں نے ظلم وستم کے ذریعے حاصل کیے ہوئے تھے اور جن کا اس کے علاوہ اور کوئی مصرف نہیں تھا کہ وہ اِس قسم کے فعل حرام پر خرچ ہوں، " ان کے لیے ایک بچھڑے کا مجسمہ بنایا جو ایک ایسی مورت تھی، جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی"۔ (فاخرج لهم عجلاً جسدًا له خوار[1])

بنی اسرائیل نے جب یہ منظر دیکھا تو اچانک حضرت موسیٰؑ کی تمام توحیدی تعلیمات کو بھول گئے" اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا"۔ (فقالوا هٰذا الٰهکم و اله موسٰی)۔

یہ احتمال بھی ہے، کہ یہ بات کہنے والے سامری، اس کے یار و مددگار اور اس کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے تھے۔

" اور اس طرح سامری نے موسیٰ کے ساتھ، بلکہ موسیٰ کے خدا کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد و پیمان بھلا دیا اور لوگوں کو گمراہی میں دھکیل دیا

---

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

بعض مفسرین نے اس جملہ کو بنی اسرائیل کی ایک اقلیت سے متعلق سمجھا ہے کہ جنہوں نے گوسالہ کی پرستش نہیں کی تھی۔ (کہتے ہیں کہ اُن میں سے چھ لاکھ افراد گوسالہ پرستی کرنے لگ گئے تھے۔ صرف بارہ ہزار افراد توحید پر باقی رہے) لیکن جو تفسیر ہم نے اُوپر بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

[1] "خوار" گائے اور گوسالہ کی آواز کے معنی میں ہے، اور کبھی اُونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔



Marfat.com

(فنسی)۔

بعض مفسرین نے یہاں "نسیان" کی گمراہی اور بے راہ روی کے معنی میں تفسیر کی ہے، یا نسیان کا فاعل موسیٰؑ کو جانا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ جملہ سامری کا کلام ہے، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ: موسیٰؑ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ یہی بچھڑا تمہارا خدا ہے لیکن یہ تمام تفسیریں آیت کے ظاہر کے مخالف ہیں کہ سامری نے موسیٰؑ اور موسیٰؑ کے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو بھلا دیا اور بُت پرستی کا راستہ اختیار کرلیا۔

٭ ٭ ٭

یہاں خدا ان بت پرستوں کو توبیخ و سرزنش کے عنوان سے کہتا ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بچھڑا ان کا جواب تک نہیں دیتا۔ نہ تو اُن سے کسی قسم کے ضرر کو دُور کرسکتا ہے، اور نہ ہی انہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے: (افلا یرون الا یرجع الیھم قولا ولا یملك لھم ضرا ولا نفعا)۔

ایک حقیقی معبود کو کم از کم اپنے بندوں کے سوالات کے جواب تو دینے چاہئیں۔ کیا صرف اس مجسمہ طلائی سے آواز کا سنائی دینا — ایسی آواز کہ جس میں کسی ارادہ و اختیار کا احساس نہیں ہے — پرستش کرنے کی دلیل بن سکتا ہے؟

اور فرض کریں کہ ان کی باتوں کا جواب دے بھی دے، تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک ایسا وجود ہوگا، جیسا کہ ایک ناتوان انسان ہے کہ جو نہ کسی دوسرے کے نفع و نقصان پر قادر ہے اور نہ ہی خود اپنے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ کیا کوئی اس صورت میں بھی معبود ہوسکتا ہے؟

کونسی عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انسان ایک بے جان مجسمہ کی کہ جس سے کبھی کبھی بے معنی آواز نکلتی ہو، پرستش کرے اور اس کے سامنے سر تعظیم جھکائے؟

٭ ٭ ٭

اس میں شک نہیں کہ اس شور و غوغا میں حضرت موسیٰؑ کے جانشین اور خدا کے بزرگ پیغمبر ہارونؑ نے اپنی رسالت کے فرائض کو پورے طور پر انجام دیا — اور انحراف و فساد سے مقابلہ کرنے کا فریضہ جتنا ان کے لیے ممکن تھا ادا کرتے رہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"ہارون نے موسیٰ کے میعاد گاہ سے واپس آنے سے پہلے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی تھی کہ تم سخت آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہو۔ لہٰذا تم دھوکا نہ کھاؤ اور راہِ خدا (توحید) سے منحرف نہ ہو" (ولقد قال لھم ھارون من قبل یا قوم انما فتنتم بہ)۔

اس کے بعد مزید کہا: "تمہارا پروردگار مسلماً وہی بخشنے والا خدا ہے کہ جس نے یہ سب نعمتیں تمہیں مرحمت فرمائی ہیں" (وان ربکم الرحمٰن)۔

تم غلام تھے، اس نے تمہیں آزادی دی۔ تم اسیر تھے، اس نے تمہیں رہائی بخشی۔ تم گمراہ تھے، اُس نے تمہیں ہدایت کی۔ تم پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں ایک الٰہی انسان کی رہبری کے زیر سایہ جمع اور متحد کیا۔ تم جاہل اور بھٹکے ہوئے تھے، اُس نے تمہیں علم کے نور سے اُجالا بخشا اور توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف تمہاری ہدایت کی۔



Marfat.com

"اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو: (فاتبعونی واطیعوا امری)۔
کیا تم یہ بات بھول گئے ہو کہ میرے بھائی موسیٰ نے مجھے اپنا جانشین بنایا ہے اور میری اطاعت تم پر فرض اور واجب قرار دی ہے۔ پھر تم عہدشکنی کیوں کر رہے ہو اور کس لیے خود کو ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں گرا رہے ہو؟

٭ ٭ ٭

لیکن بنی اسرائیل اس طرح ہٹ دھرمی کے ساتھ اس بچھڑے سے لپٹے ہوئے تھے کہ اس مرد خدا اور ہمدرد رہبر کی یہ قوی منطق اور روشن دلائل ان کے اوپر اثرانداز نہ ہوئے۔ انہوں نے صراحت کے ساتھ حضرت ہارونؑ کی مخالفت کا اعلان کیا اور کہا "ہم تو اسی طرح اس گوسالہ کی پرستش کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ خود موسیٰ ہمارے پاس پلٹ کر آئیں" (قالوا لن نبرح علیه عاکفین حتیٰ یرجع الینا موسیٰ)[1]

خلاصہ یہ کہ انہوں نے ہٹ دھرمی نہ چھوڑی اور کہنے لگے کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چلے گا کہ گوسالہ پرستی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ موسیٰ لوٹ آئیں اور اُن سے اس بات کا فیصلہ کرائیں۔ ہوسکتا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ مل کر گوسالہ کے سامنے سجدہ کریں۔ لہٰذا تم خود کو زیادہ ہلکان نہ کرو اور ہمارا پیچھا چھوڑو۔

اس طرح انہوں نے عقل کے مسلّمہ حکم کو بھی پاؤں تلے روند ڈالا اور اپنے رہبر کے جانشین کے فرمان کی بھی پرواہ نہ کی۔

لیکن جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے — اور قاعدہ بھی یہی ہے — کہ ان حالات میں جب ہارون نے اپنی رسالت کو انجام دیا اور اکثریت نے اُسے قبول نہ کیا تو آپ اس گنی چنی اقلیت کے ساتھ کہ جو ان کی تابع تھی اُن سے الگ ہوگئے اور اُن سے دوری اختیار کرلی کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے ساتھ میل جول ان کے انحرافی طرزعمل کی تصدیق کی دلیل بن جائے۔[2]

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ انحرافی تبدیلیاں صرف گنتی کے چند دنوں کے اندر اندر واقع ہوگئیں۔ جب موسیٰ کو میعاد گاہ کی طرف گئے ہوئے ۳۵ دن گزر گئے تو سامری نے اپنا کام شروع کردیا اور بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام زیورات جو اُنہوں نے فرعونیوں سے عاریتاً لیے تھے اور ان کے غرق ہوجانے کے بعد وہ انھیں کے پاس رہ گئے تھے انہیں جمع کریں۔ چھتیسویں، سینتیسویں اور اڑتیسویں دن انہیں ایک کٹھالی میں ڈالا اور پگھلا کر اس سے گوسالہ کا مجسمہ بنا دیا اور اُنتالیسویں دن انہیں اس کی پرستش کی دعوت دی اور ایک بہت بڑی تعداد (کچھ روایات کی بناء پر چھ لاکھ افراد) نے اسے قبول کرلیا اور ایک روز بعد یعنی چالیس روز گزرنے پر موسیٰ واپس آگئے۔

لیکن بہرحال ہارونؑ تقریباً بارہ ہزار ثابت قدم مومنین کی اقلیت کے ساتھ اس قوم سے الگ ہوگئے جبکہ جاہل اور ہٹ دھرم اکثریت اس بات پر آمادہ ہوچکی تھی کہ انہیں قتل کردے۔

---

[1] "نبرح" "برح" کے مادہ سے زائل ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ "برح الخفاء" کا جملہ آشکار واضح ہونے کے معنی میں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خفاء کا زائل ہونا ظہور کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور چونکہ "لن" کا معنی نفی ہے تو "لن نبرح" کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مسلسل یہ کام کرتے رہیں گے۔

[2] مجمع البیان۔ زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

# چند اہم نکات :

۱۔ شوق دیدار : جو لوگ عشق خدا کے جذبے سے بے خبر ہیں انہیں موسیٰ کی وہ گفتگو جو انہوں نے پروردگار کے اس سوال — کہ تم میعاد گاہ کی طرف اتنی تیزی اور جلدی سے کیوں چلے آئے — کے جواب میں کی، ممکن ہے عجیب معلوم ہوتی ہو۔ کیونکہ وہ یہ جواب دیتے ہیں :

وعجلت الیك رب لترضٰی

پروردگارا ! میں نے تیری طرف (آنے کے لیے اس لئے) جلدی کی تاکہ تیری رضا حاصل کروں۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ٭ آتش عشق تیز تر گردد

جب وعدہ وصل کا وقت نزدیک آ جاتا ہے تو عشق کی آگ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کونسی پُراسرار قوت موسیٰ کو "اللہ" کی میعادگاہ کی طرف کھینچ کرلے جا رہی تھی اور وہ اتنی تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ ان افراد کو بھی کہ جو ان کے ساتھ تھے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

موسیٰ نے اس سے پہلے بھی دوست کے وصال کی حلاوت اور پروردگار کے ساتھ مناجات کا مزہ چکھا ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پوری دنیا بھی اس مناجات کے ایک لمحہ کے برابر نہیں ہو سکتی۔

ہاں، ان لوگوں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے — جو عشق مجازی سے گزر کر، عشق حقیقی اور عشق معبودِ جاودانی کے مرحلے میں قدم رکھ چکے ہیں — اس خدا کا عشق کہ جس کی ذاتِ پاک میں فنا کی گنجائش ہی نہیں ہے اور وہ کمال مطلق ہے اور بے حد و انتہا خوبی کا مالک ہے۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند او تنہا دارد

بلکہ سب میں جو الگ الگ خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اس کی جاوداں خوبی کا ایک معمولی سا پرتو ہے۔

اے عظیم پروردگار ! اس مقدس عشق کا ایک ذرہ ہمیں بھی چکھا دے۔

ایک روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"المشتاق لا یشتھی طعامًا، ولا یلتذ شرابًا، ولا یستطیب رقادًا، ولا یأنس حمیمًا، ولا یأوی دارًا ۔ ۔ ۔ ویعبد اللہ لیلًا ونھارًا راجیًا بان یصل الیٰ ما یشتاق الیہ ۔ ۔ ۔ کما اخبر اللہ عن موسیٰ بن عمران فی میعاد ربہ بقولہ وعجلت الیك رب لترضٰی۔

عاشق بے قرار کو نہ تو کھانے کا ہوش ہوتا ہے، نہ اسے خوشگوار شربت کی طلب ہوتی ہے نہ اُسے چین کی نیند آتی ہے نہ اس کا کسی دوست سے جی لگتا ہے۔ اور نہ ہی کسی گھر میں اُسے آرام آتا ہے ۔ ۔ ۔ بلکہ وہ خدا کی رات دن بندگی کرتا ہے۔ اس امید پر کہ اپنے



Marfat.com

محبوب (اللہ) تک پہنچ جائے ۔۔۔ جس طرح سے کہ خدا موسیٰ بن عمران کے بارے میں اس کے پروردگار کی میعادگاہ (میں پہنچنے) کے سلسلے میں بیان فرماتا ہے ۔ کہ

"عجلت اليك رب لترضیٰ "[1]

**۲۔ انبیاء کے انقلاب کی مخالف تحریکیں:** عام طور پر ہر انقلاب کے مقابلے میں ایک انقلاب دشمن تحریک وجود میں آجاتی ہے جو یہ کوشش کرتی ہے کہ انقلاب نے جو کچھ پیش کیا ہے اُسے درہم برہم کر دیا جائے اور معاشرے کو انقلاب سے پہلے والی حالت کی طرف پلٹا دیا جائے ۔ اس تاریخ کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ ایک انقلاب کے برپا ہونے سے تمام گزشتہ فاسد عناصر یک دم نابود اور ختم نہیں ہو جاتے بلکہ عام طور پر کچھ نہ کچھ تلچھٹ اس کی باقی رہ جاتی ہے ۔ وہ لوگ اپنے وجود کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حالات کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق کھلم کھلا یا خفیہ طریقے سے انقلاب دشمن کاموں میں مصروف رہتے ہیں ۔

بنی اسرائیل کی آزادی اور توحید و استقلال کی طرف موسیٰ بن عمران کی انقلابی تحریک میں سامری اس رجعت پسند تحریک کا سربراہ تھا وہ جو کہ ۔ تمام رجعت پسند تحریکوں کے لیڈروں کی طرح ۔ اپنی قوم کے کمزور پہلوؤں سے اچھی طرح باخبر تھا اور جانتا تھا کہ ان کمزوریوں سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کیا جا سکتا ہے ، اس نے کوشش کی کہ ان زیورات اور طلائی چیزوں سے کہ جو دنیا پرستوں کا معبود ہے اور عوام الناس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے، گوسالہ بنائے اور اسے ایک خاص طریقے سے ہوا کے چلنے کے رُخ پر کھڑا کر دے (یا کسی اور طریقے سے کام لے) تاکہ اُس سے کوئی آواز نکلے ۔ موسیٰ کی چند روزہ غیبت کو اُس نے غنیمت جانا یہ بات اُس کی نظر میں تھی کہ بنی اسرائیل نے دریا سے نجات پانے کے بعد اور ایک بُت پرست قوم کے قریب سے گزرتے ہوئے موسیٰ سے (اپنے لیے) ایک بُت بنانے کا تقاضا کیا تھا ۔ خلاصہ یہ کہ اُس نے تمام نفسیاتی کمزوریوں اور زمانی و مکانی مناسب موقعوں سے استفادہ کرتے ہوئے ، اپنے مخالف توحید منصوبے کا آغاز کر دیا اور اس کے مواد کو اس طرح سے ماہرانہ انداز میں منظم کیا کہ تھوڑی سی مدت میں بنی اسرائیل کی ایک بڑی اکثریت کو راہِ توحید سے منحرف کر کے شرک کی راہ کی طرف کھینچ لے گیا ۔

یہ سازش اگرچہ موسیٰ کے واپس آتے ہی اُن کی قدرتِ ایمانی اور نورِ وحی کے پرتو میں ان کی منطق سے ناکام ہو گئی لیکن ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اگر موسیٰ واپس نہ آتے تو کیا ہوتا ؟ یقیناً یا تو وہ ان کے بھائی ہارون کو قتل کر دیتے یا وہ انہیں اس طرح سے گوشہ نشین کر دیتے کہ اُن کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچتی ۔

ہاں ! ہر انقلاب کے آغاز میں اسی طرح کی مخالف تحریکیں ہوتی ہیں اور (اُن سے) پورے طور پر خبردار رہنا چاہیئے اور رجعت پسندوں کی معمولی سے معمولی شرک آلود حرکتوں کو نظر میں رکھنا چاہیئے اور دشمن کی سازشوں کو شروع میں ہی کچل دینا چاہیئے ۔

ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ بہت سے سچے انقلابات ، مختلف دلائل و وجوہ کی بنا پر آغاز میں کسی فرد یا کچھ مخصوص افراد کے سہارے برپا ہوتے ہیں اگر وہ بیچ میں نہ رہیں تو انقلاب کے اُلٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جتنا بھی جلدی ہو سکے ، انقلابی معیاروں کو معاشرے کی گہرائی میں اُتار دیں اور لوگوں کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ انقلاب کے مخالف تمام طوفان انہیں کسی طرح بھی اپنے مقام سے نہ ہلا سکیں اور وہ پہاڑ کی مانند ہر رجعت پسند

---

[1] تفسیر نور الثقلین ، جلد ۳ ، ص ۳۸۸ ۔



Marfat.com

قدامت پرست تحریک کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

یا دوسرے لفظوں میں یہ سچے رہبروں کی ایک ذمہ داری ہے کہ وہ معیاروں کو ــــ اپنے معاشرے کی طرف منتقل کریں اس میں شک نہیں کہ اس اہم کام کے لیے کچھ مدت چاہیئے لیکن کوشش کرنا چاہیئے کہ یہ زمانہ جتنا ممکن ہو ــــ کم سے کم ہو۔

اس بارے میں کہ سامری کون تھا اور اس کا انجام کیا ہوا، انشاء اللہ ہم بعد والی آیات میں گفتگو کریں گے۔

٭　٭　٭

۳۔ رہبری کے مراحل : اس میں شک نہیں کہ حضرت ہارونؑ نے حضرت موسیٰؑ کی غیبت کے زمانے میں اپنی رسالت کے انجام دینے میں معمولی سے معمولی سستی بھی نہیں کی لیکن ایک طرف سے تو لوگوں کی جہالت نے اور دوسری طرف سے مصر میں غلامی اور بت پرستی کے دور کی رسومات نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

مذکورہ بالا آیات کے مطابق انہوں نے اپنی ذمہ داری کو چار مرحلوں میں پورا کیا:

پہلا مرحلہ: یہ کہ ان پر یہ ظاہر کیا کہ یہ واقعہ ایک انحرافی راستہ اور تم سب کے لیے ایک خطرناک آزمائش کا میدان ہے تاکہ سوئے ہوئے دماغ بیدار ہوں اور لوگ بیٹھ کر سوچیں اور اہم چیز یہی تھی (یا قوم انما فتنتم بہ)۔

دوسرا مرحلہ: یہ تھا کہ خدا کی وہ قسم قسم کی نعمتیں، جو موسیٰ کے قیام کی ابتداء سے لے کر فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے زمانے تک، بنی اسرائیل کے شامل حال ہوئی تھیں، وہ انہیں یاد دلائیں اور خصوصیت کے ساتھ خدا کی عمومی صفت رحمت کے ساتھ اس کی توصیف کی تاکہ اس کا زیادہ گہرا اثر ہو اور انہیں اس بہت بڑی خطا کی بخشش کی بھی اُمید دلائی جاسکے (وان ربکم الرحمٰن)۔

تیسرا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں اپنے مقامِ نبوت اور اپنے بھائی موسیٰ کی جانشینی کی طرف متوجہ کیا (فاتبعونی)۔

چوتھا مرحلہ: یہ تھا کہ انہیں ان کی الٰہی ذمہ داریوں سے باخبر کیا (واطیعوا امری)۔

۴۔ ایک اعتراض کا جواب : مشہور مفسر فخرالدین رازی نے یہاں ایک اعتراض پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے : شیعہ حضرات علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث : انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ :

" تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰ کو ہارون سے تھی " سے ولایت علی کے لئے استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہارون نے بت پرستوں کے عظیم انبوہ کے مقابلہ میں ہرگز تقیہ اختیار نہیں کیا تھا اور صراحت کے ساتھ لوگوں کو اپنی پیروی اور دوسروں کی متابعت ترک کرنے کی دعوت دی تھی۔

اگر واقعاً اُمت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی رحلت کے بعد خطا کی راہ اختیار کرلی تھی، تو علی (علیہ السلام) پر یہ واجب تھا کہ وہ بھی ہارون کا سا طرزِ عمل اپناتے۔ منبر پر جاتے اور کسی قسم کا خوف اور تقیہ کیے بغیر" فاتبعونی واطیعوا امری" کہتے۔ چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اُمت کا طریقہ کار اس زمانے



Marfat.com

میں حق اور درست تھا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فخرالدین رازی نے اِس بارے میں دو بنیادی نکات سے غفلت کی ہے۔

ا۔ یہ جو اُنہوں نے کہا ہے کہ علی علیہ السلام نے اپنی خلافت بلا فصل کے متعلق کسی بات کا اظہار نہیں کیا، اشتباہ ہے اور غلط ہے کیونکہ ہمارے پاس بیشمار حوالے ایسے موجود ہیں کہ امامؑ نے مختلف مواقع پر اس امر کو بیان فرمایا ہے۔ کبھی صریح اور کھلم کھلا طور پر اور کبھی در پردہ طریقے سے۔ کتاب نہج البلاغہ میں آپ کے کلام کے مختلف حصّے نظر آتے ہیں، مثلاً خطبہ شقشقیہ، خطبہ سوم، خطبہ ۸۷، خطبہ ۹۷، خطبہ ۹۴، خطبہ ۱۵۴ اور خطبہ ۱۴۷، کہ جو سب کے سب اس سلسلے میں بیان ہوئے ہیں۔

تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۶۷ کے ذیل میں واقعہ غدیر کے بیان کرنے کے بعد ہم نے متعدد روایات نقل کی ہیں کہ خود حضرت علیؑ نے بارہا اپنی حیثیت اور خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے، حدیث غدیر سے استناد کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد پنجم، ص ۳۸ کے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کریں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مخصوص حالات تھے۔ وہ منافق کہ جو وفات پیغمبر کے انتظار میں دن گن رہے تھے انہوں نے خود کو ازسرِ نو اسلام پر آخری ضرب لگانے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اصحاب الردہ (اسلامی انقلاب کے مخالف گروہ) نے فوراً ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں قیام کیا۔ اگر مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور ہوشیاری نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ اسلام پر ناقابل تلافی ضربیں لگاتے۔ علیؑ نے اِس امر کی خاطر بھی خاموشی اختیار کی کہ دشمن غلط فائدہ نہ اُٹھائے۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بھی — باوجود اس کے کہ موسیٰؑ زندہ تھے — بھائی کی سرزنش کے جواب میں کہ تُو نے کوتاہی کیوں کی صریحاً یہی کہا کہ:

انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل

میں اس بات سے ڈرا کہ تو مجھ سے یہ کہے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔ (طٰہٰ ۹۴)

اور یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ علیؑ نے بھی اختلاف کے خوف سے ایک حد تک خاموشی اختیار کی۔

٭ ٭ ٭

۹۲۔ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝

۹۳۔ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝

۹۴۔ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝



Marfat.com

۹۵۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ○

۹۶۔ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ
فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○

۹۷۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ
لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ
عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ○

۹۸۔ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ○

## ترجمہ

۹۲۔ (موسیٰ نے) کہا: اے ہارون! جس وقت تو نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں، تو تجھے کس چیز نے روکا۔

۹۳۔ کہ تو نے میری پیروی نہ کی۔ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟

۹۴۔ (ہارون نے) کہا: اے ماں جائے! میری داڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میں تو اس بات سے ڈرا کہ تُو یہ کہنے لگے کہ تو نے
بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔

۹۵۔ (پھر موسیٰ نے سامری کی طرف رُخ کیا اور) کہا: اے سامری! تُو نے یہ کام کیوں کیا؟

۹۶۔ (سامری نے) کہا: میں نے ایسی چیز دیکھی جو انہوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے (خدا کے بھیجے ہوئے) رسول
کے آثار میں سے کچھ حصہ اُٹھالیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈال دیا اور میرے نفس نے اِس مطلب کو اسی طرح خوشنما بنایا۔

۹۷۔ (موسیٰ نے) کہا: تیرا دنیا کی زندگی میں حصہ (صرف) یہ ہے کہ (جو شخص تیرے نزدیک ہوگا) تو (اس سے) کہے گا:
مجھے مت چھُونا اور تیرے لیے (خدا کی طرف سے عذاب کا) ایک وقت مقرر ہے کہ ہرگز اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ (اب)
تو اپنے معبود کی طرف دیکھ، جس کی تو مسلسل پرستش کرتا رہا ہے اور دیکھ پہلے تو ہم اسے جلائیں گے اور پھر اس کے ذرّات کو
دریا میں بکھیر دیں گے۔

۹۸۔ تمہارا معبود تو صرف وہی خدا ہے کہ جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔



Marfat.com

# تفسیر

## سامری کا عبرت ناک انجام :

اس بحث کے بعد جو موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی شدید مذمت کے بارے میں کی تھی اور جو اس سے پہلی آیات میں بیان ہوچکی ہے، زیر بحث آیات میں پہلے موسیٰ کی اپنے بھائی ہارون کے ساتھ گفتگو اور اس کے بعد سامری کے ساتھ جو باتیں ہوئیں، کو بیان کیا جارہا ہے۔

پہلے اپنے بھائی ہارونؑ کی طرف رُخ کرکے "کہا : اے ہارون! جس وقت تُو نے یہ دیکھا کہ یہ قوم گمراہ ہوگئی ہے تو تو نے میری پیروی کیوں نہ کی" (قال یا ھارون ما منعك اذ رأیتھم ضلوا الا تتبعن)۔

کیا مَیں نے اُس وقت جبکہ میں میعاد گاہ کی طرف جانا چاہتا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ تُو میرا جانشین ہے اور اس گروہ کے درمیان اصلاح کرنا اور مفسدین کے راستے کو اختیار نہ کرنا۔[1]

تو ان بت پرستوں کے ساتھ مقابلے کے لیے کیوں اُٹھ کھڑا نہ ہوا ؟

اس بنا پر "الا تتبعن" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بُت پرستی کے بارے میں میری شدتِ عمل کی رَوِش کی۔ تو نے پیروی کیوں نہ کی۔

لیکن یہ بات، جو بعض نے بیان کی ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ تو اُس اقلیت کے ساتھ کہ جو توحید پر باقی رہ گئی تھی میرے پیچھے پیچھے کوہِ طور پر کیوں نہ آیا، بہت ہی بعید نظر آتی ہے اور یہ اُس جواب کے ساتھ کہ جو ہارونؑ نے بعد کی آیات میں دیا ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد موسیٰ نے مزید کہا : کیا تو نے میرے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے: (افعصیت امری)۔

❊ ❊ ❊

موسیٰؑ انتہائی شدت اور سخت غصہ کی حالت میں، یہ باتیں اپنے بھائی سے کر رہے تھے اور ان کے سامنے چیخ رہے تھے جبکہ ان کی داڑھی اور سر کو پکڑا ہوا تھا، اور کھینچ رہے تھے۔

ہارونؑ نے جب اپنے بھائی کو شدید پریشان دیکھا تو اس لیے کہ انہیں لطف و مہربانی کی طرف لائیں اور ان کی بے قراری اور بے چینی میں کمی کریں اور ضمنی طور پر اس واقعے کے سلسلے میں اپنا عذر پیش کریں کہا : اے میرے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ، میں نے تو یہ سوچا کہ اگر میں مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ان کی گرفت کرتا ہوں، تو بنی اسرائیل میں ایک شدید تفرقہ پڑ جائے گا اور میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں تو واپسی پر کہنے لگے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ کیوں ڈالا اور میری غیبت کے زمانے میں میری نصیحت کا خیال نہیں کیا: (قال یا بن ام لا تأخذ بلحیتی ولا برأسی انی خشیت ان تقول فرقت بین

[1] اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین ۵ (اعراف ۱۴۲)



Marfat.com

بنی اسرائیل ولم ترقب قولی)۔

درحقیقت حضرت ہارونؑ کی نظر اسی بات کی طرف ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ نے میعاد گاہ کی طرف جانے سے پہلے کہی تھی کہ جس کا معنی و مفہوم اصلاح کی طرف دعوت دینا ہے۔ ( اعراف - ۱۴۲)

وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں اُن پر سختی اور گرفت کرتا، تو وہ تیرے حکم کے برخلاف ہوتا اور پھر تجھے یہ حق پہنچتا کہ مجھ سے مواخذہ کرے۔

اس طرح حضرت ہارونؑ نے اپنی بے گناہی کو ثابت کر دیا۔ خصوصاً ایک اور جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو سورۂ اعراف کی آیہ ۱۵۰ میں آیا ہے:

ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی

اس نادان قوم نے مجھے ضعیف کر دیا اور ہم لوگ تھوڑے رہ گئے اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل ہی کر دیں میں بے گناہ ہوں بے گناہ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ موسیٰؑ و ہارونؑ دونوں، بلاشک و شبہ پیغمبر اور معصوم تھے تو پھر موسیٰؑ کی طرف سے ایسی کھینچا تانی، بحث اور شدید عتاب و خطاب اور وہ دفاع کہ جو اپنا ہارونؑ کر رہے ہیں، کس طرح قابلِ توجیہ ہے؟

اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ موسیٰؑ کو یقین تھا کہ ان کا بھائی بے گناہ ہے لیکن وہ اس طریقے سے دو باتیں ثابت کرنا چاہتے تھے: پہلی یہ کہ وہ بنی اسرائیل کو یہ سمجھا دیں کہ وہ بہت ہی عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایسا گناہ کہ جو موسیٰؑ کے بھائی تک کو بھی کہ جو خود ایک عالی قدر پیغمبر تھے مواخذے کے لیے عدالت کی طرف کھینچ کر لے گیا اور وہ بھی اتنا شدتِ عمل کے ساتھ یعنی یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ جتنا بعض بنی اسرائیل نے سمجھ لیا ہے۔ توحید سے انحراف اور شرک کی طرف بازگشت، وہ بھی ان تمام تعلیمات اور ان تمام معجزات اور عظمتِ حق کے آثار دیکھنے کے بعد۔ یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لہذا جتنا زیادہ سے زیادہ قاطعیت کے ساتھ ہو سکے اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی عظیم حادثہ واقع ہو جاتا ہے تو انسان ہاتھ بڑھا کر اپنا ہی گریبان چاک کر لیتا ہے اور اپنا ہی سر پیٹ لیتا ہے، تو اپنے بھائی کو موردِ عتاب و خطاب قرار دینے کی تو بات ہی کچھ نہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہدف اور مقصد کی حفاظت اور افرادِ منحرف میں نفسیاتی اثر پیدا کرنے کے لیے اور ان پر گناہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے، اس قسم کا طرزِ عمل بہت مؤثر ہوتا ہے اور ہارون بھی اس طریقے میں بالکل راضی تھے۔

دوسرا یہ کہ ہارونؑ کی بے گناہی ان توضیحات کے ساتھ کہ جو وہ دے رہے تھے، سب پر ثابت ہو جائے اور بعد میں انہیں اپنی رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کا اتہام نہ لگائیں۔

اپنے بھائی سے گفتگو کرنے اور ان کے بری الذمہ ثابت ہونے کے بعد، سامری سے بازپرس شروع کی اور کہا: "یہ کام تھا کہ جو تُو نے انجام دیا ہے اور اے سامری! تجھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا" (قال فما خطبك یا سامری)۔

٭ ٭ ٭



Marfat.com

اس نے جواب میں کہا: "میں کچھ ایسے مطالب سے آگاہ ہوا کہ جو انہوں نے نہیں دیکھے اور وہ اس سے آگاہ نہیں ہوئے" (قال بصرت بما لم یبصروا بہ)۔

"میں نے ایک چیز خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آثار میں سے لی اور پھر میں نے اسے دُور پھینک دیا اور میرے نفس نے اس بات کو اسی طرح مجھے خوش نما کرکے دکھایا" (فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتھا وکذالك سولت لی نفسی)۔

اس بارے میں کہ اس گفتگو سے سامری کی کیا مراد تھی، مفسرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں:

پہلی یہ کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کے لشکر کے دریائے نیل کے پاس آنے کے موقع پر میں نے جبرئیل کو ایک سواری پر سوار دیکھا کہ وہ لشکر کو دریا کے خشک شدہ راستوں پر ورود کے لیے تشویق دینے کی خاطر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ میں نے کچھ مٹی ان کے پاؤں کے نیچے سے یا ان کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے اُٹھالی اور اسے سنبھال رکھا اور اسے سونے کے بچھڑے کے اندر ڈالا اور یہ صدا اسی کی برکت سے پیدا ہوئی ہے۔

دُوسری تفسیر یہ ہے کہ میں ابتدا میں خدا کے اس رسول (موسیٰؑ) کے کچھ آثار پر ایمان لے آیا۔ اس کے بعد مجھے اس میں کچھ شک اور تردد ہوا۔ لہٰذا میں نے اُسے دُور پھینک دیا اور بُت پرستی کے دین کی طرف مائل ہوگیا اور یہ میری نظر میں زیادہ پسندیدہ اور زیبا ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق لفظ "رسول" جبرئیلؑ کے معنی میں ہے جبکہ دُوسری تفسیر کے مطابق "رسول" موسیٰؑ کے معنی میں ہے۔

لفظ "اثر" پہلی تفسیر کی رُو سے "پاؤں کے نیچے کی مٹی" کے معنی میں ہے، اور دوسری تفسیر میں "تعلیمات کا کچھ حصّہ" کے معنی میں ہے۔

"نبذتھا" کا لفظ پہلی تفسیر میں مٹی کو گوسالہ میں ڈالنے کے معنی میں ہے اور دوسری تفسیر میں تعلیمات موسیٰؑ کو دُور پھینکنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں ہے، اور آخر میں "بصرت بما لم یبصروا بہ" پہلی تفسیر میں جبرئیلؑ کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک گھڑ سوار کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے (شاید کچھ اور لوگوں نے بھی انہیں دیکھا لیکن پہچانا نہیں) لیکن دوسری تفسیر میں دین موسیٰ کے بارے میں کچھ خاص معلومات کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال ان دونوں تفاسیر میں سے ہر ایک کے طرفدار ہیں اور ان میں کچھ روشن یا مبہم نکات موجود ہیں لیکن دوسری تفسیر کئی جہات سے بہتر نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ کتاب "احتجاج طبرسی" میں ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب امیرالمومنین علی علیہ السلام نے بصرہ کو فتح کرلیا تو لوگ آپؑ کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں حسن بصری بھی تھا اور وہ اپنے ساتھ کچھ تختیاں لے کر آیا تھا کہ امیرالمومنینؑ جو بات کرتے وہ اُسے فوراً یادداشت کے طور پر لکھ لیتا۔ امامؑ نے بلند آواز کے ساتھ ان لوگوں میں سے اسے مخاطب کرکے فرمایا: تو کیا کر رہا ہے، تو اُس نے عرض کیا کہ میں آپ کے آثار اور ارشادات کو لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کے لیے انہیں بیان کروں، امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

اما ان لکل قوم سامریًا، وھذا سامری ھذہ الامة، انہ لایقول لامساس ولکنہ یقول لاقتال:

یہ بات ذہن نشین کرلو کہ ہر قوم اور ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی سامری ہوتا ہے اور یہ (حسن بصری)



Marfat.com

اس اُمت کا سامری ہے۔ اس کا موسیٰ کے زمانے کے سامری سے صرف اتنا فرق ہے کہ
جو شخص اُس سامری کے قریب ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا "لا مساس" (کوئی شخص مجھے نہ چھوئے)
لیکن یہ لوگوں سے یہ کہتا ہے کہ "لا قتال" (یعنی کسی سے جنگ نہیں کرنا چاہیئے، حتیٰ کہ
منحرفین سے بھی۔ یہ اُس پروپیگنڈہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو حسن بصری جنگ جمل کے خلاف کرتا تھا)[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سامری بھی ایک منافق آدمی تھا کہ جس نے حق کے کچھ مطالب سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کو منحرف کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ معنی دوسری تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔[2]

یہ بات صاف طور پر واضح اور روشن ہے کہ موسیٰؑ کے سوال کے جواب میں سامری کی بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی لہٰذا حضرت موسیٰ نے اس کے مجرم ہونے کا فرمان اسی عدالت میں صادر کر دیا اور اُسے اور اس کے گوسالہ کے بارے میں تین حکم دیئے:

پہلا حکم یہ کہ اس سے کہا " تو لوگوں کے درمیان سے نکل جا اور کسی کے ساتھ میل ملاپ نہ کر اور تیری باقی زندگی میں تیرا حصّہ صرف اتنا ہے کہ جو شخص بھی تیرے قریب آئے گا تو اُس سے کہے گا کہ " مجھ سے مس نہ ہو" (قال فاذهب فان لك في الحيوة ان تقول لا مساس)۔

اس طرح ایک قاطع اور دو ٹوک فرمان کے ذریعے سامری کو معاشرے سے باہر نکال پھینکا اور اُسے مطلق گوشہ نشینی میں ڈال دیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ " لا مساس" کا جملہ شریعت موسیٰؑ کے ایک فوجداری قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جو بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے صادر ہوتا تھا۔ وہ شخص ایک ایسے موجود کی حیثیت سے کہ جو پلید ونجس و ناپاک ہو، قرار پاجاتا تھا۔ کوئی اس سے میل ملاپ نہ کرتا اور نہ اُسے یہ حق ہوتا تھا کہ وہ کسی سے میل ملاپ رکھے۔[3]

سامری اس واقعے کے بعد مجبور ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل اور ان کے شہر و دیار سے باہر نکل جائے اور بیابانوں میں جا رہے اور یہ اس جاہ طلب انسان کی سزا ہے کہ جو اپنی بدعتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ بڑے بڑے گروہوں کو منحرف کر کے اپنے گرد جمع کرے۔ اسے ناکام ہی ہونا چاہیئے یہاں تک کہ ایک بھی شخص اس سے میل ملاپ نہ رکھے۔ اور اس قسم کے انسان کے لیے یہ مکمل بائیکاٹ موت اور قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ ایک پلید اور آلودہ وجود کی صورت میں ہر جگہ سے راندہ اور دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ سامری کا بڑا جرم ثابت ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اس کے بارے میں نفرین کی اور خدا نے اُسے ایک پُراسرار بیماری میں مبتلا کر دیا کہ جب تک وہ زندہ رہا کوئی شخص اُسے چھو نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی اُسے چھو لیتا تو وہ بھی بیماری میں گرفتار ہو جاتا۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۳۹۲۔

[2] اس حدیث سے کوئی خاص تائید دوسری تفسیر کی نہیں ہوتی اور آیت کا ظاہر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم (مترجم)۔

[3] تفسیر فی ظلال، جلد ۵، صفحہ ۲۹۲۔



Marfat.com

یا یہ کہ سامری ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں جو ہر شخص سے وسواس شدید اور وحشت کی صورت میں تھی گرفتار ہو گیا۔ اس طرح سے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا وہ چلاتا کہ " لا مساس " ( مجھے مت چھونا )۔[1]

سامری کے لیے دوسری سزا یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ نے اسے قیامت میں ہونے والے عذاب کی بھی خبر دی۔ اور کہا: تیرے آگے ایک وعدہ گاہ ہے۔ خدائی دردناک عذاب کا وعدہ ۔ کہ جس سے ہرگز نہیں بچ سکے گا ( وان لك موعدًا لن تخلفه )۔[2]

تیسرا کام یہ تھا کہ جو موسیٰؑ نے سامری سے کہا: " اپنے اس معبود کو کہ جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا تھا ذرا دیکھ اور نگاہ کر۔ ہم اس کو جلا رہے ہیں اور پھر اس کے ذرّات کو دریا میں بکھیر دیں گے " ( وانظر الی الٰهك الذی ظلت علیه عاكفًا لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفًا )۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ " لنحرقنه " ( ہم اس کو یقیناً جلائیں گے )، اس بات کی دلیل ہے کہ گوسالہ ایک جلانے کے قابل جسم تھا اور یہ چیز ان لوگوں کے نظریہ کی کہ جو یہ کہتے ہیں کہ گوسالہ طلائی نہیں تھا، بلکہ جبرئیل کے پاؤں کی خاک کی وجہ سے ایک زندہ وجود میں تبدیل ہو گیا تھا، تائید کرتا ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ " جسدًا له خوار " کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ گوسالہ ایک بے جان مجسمہ تھا۔ کہ جس سے گوسالہ کی آواز کے مشابہ آواز ( جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے ) نکلتی تھی۔ باقی رہا جلانے کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ دو اسباب میں سے کسی ایک سبب سے ہو: ایک تو یہ کہ یہ مجسمہ صرف سونے کا نہیں تھا بلکہ احتمال یہ ہے کہ اس میں لکڑی بھی استعمال ہوئی تھی اور سونا صرف اس کے سرپوش کے طور پر اس پر چڑھا تھا۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ وہ سارے کا سارا سونا ہی تھا، تب بھی اس کا جلانا، اس کی تحقیر و توہین اور اس کی شکل و صورت کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ جیسا کہ یہ عمل ہمارے زمانے کے جابر بادشاہوں کے دھات کے مجسموں کے بارے میں دہرایا گیا ہے۔ اس بنا پر اسے جلانے کے بعد بعض ذرائع سے ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کے ذرّات کو دریا میں پھینک دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس سارے سونے کو دریا میں پھینکنا جائز تھا اور اسراف شمار نہیں ہوتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایک اہم اور عالی مقصد کی خاطر مثلاً: بُت پرستی کے عقیدہ کی سرکوبی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ بُت کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فساد کا مادہ لوگوں کے درمیان باقی رہ جائے اور پھر بعض لوگوں کے لیے وسوسہ کا سبب بن جائے۔

زیادہ واضح عبارت میں، اگر موسیٰ اس سونے کو کہ جو گوسالہ کے بنانے میں استعمال ہوا تھا، باقی رہنے دیتے یا اُسے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تو پھر یہ ممکن تھا کہ کسی دن جاہل اور نادان لوگ اُسے ہی مقدس سمجھنے لگ جاتے اور گوسالہ پرستی کی رُوح نئے سرے سے ان میں زندہ ہو جاتی۔ یہاں پر ضروری تھا کہ اس گراں قیمت مادہ کو لوگوں کے اعتقاد کی حفاظت پر قربان کر دیا جائے اور اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۶، ص ۴۲۸

[2] " لن تخلفه " ایک فعل مجہول ہے کہ جس کا نائب فاعل یہاں سامری ہے اور اس کی خبر دوسرا مفعول ہے اور اس کا فاعل اصل میں خدا ہے اور سارے جملے کا معنی اس طرح ہے: تیرے لیے ایک وعدہ گاہ کہ جس سے خدا تیرے بارے میں تخلف نہیں کرے گا۔



Marfat.com

حضرت موسیٰ نے سامری کے بارے میں بھی اور اس کے گوسالہ کے بارے میں بھی انتہائی قاطع اور سخت روش اختیار کی تبھی گوسالہ پرستی کے فتنہ کو ختم کرنے پر قادر ہوئے اور اس کے نفسیاتی اثرات لوگوں کے ذہنوں سے پاک کیے۔ بعد میں بھی ہم دیکھیں گے آپ نے گوسالہ پرستوں کے ساتھ جس دو ٹوک طریقہ سے ٹکر لی اُس نے بنی اسرائیل کے دماغوں میں ایسا نفوذ کیا کہ وہ آگے چل کر کبھی بھی ان انحرافی راستوں پر چلنے۔

٭ ٭ ٭

آخری جملہ میں حضرت موسیٰ نے مسئلہ توحید پر بہت زیادہ تاکید کرتے ہوئے "اللہ" کی حاکمیت کو واضح کیا اور اس طرح کہا :
"تمہارا معبود صرف اللہ ہے۔ وہی اللہ کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہی کہ جس کے علم نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے" :
( انما الٰھکم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو وسع کل شیء علمًا )۔
وہ گھڑے ہوئے بتوں کی طرح نہیں ہے کہ جو نہ کسی بات کو سنتے ہیں، نہ کوئی جواب دیتے ہیں، نہ کوئی مشکل حل کرتے ہیں اور نہ کسی نقصان کو دور کرتے ہیں۔
واقع میں "وسع کل شیء علمًا" اس توصیف کے مدّ مقابل آیا ہے کہ جو قبل کی چند آیات میں گوسالہ اور اس کی نادانی اور ناتوانی کے بارے میں بیان ہوئی تھی۔

٭ ٭ ٭

# چند اہم نکات :

۱۔ **مشکلات کے مقابل ڈٹ جانا چاہیئے :** بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی روش سخت اور پیچیدہ انحرافات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر زمان و مکاں کے لیے ایک قابل تقلید روش ہے۔
اگر حضرت موسیٰ یہ چاہتے کہ صرف پند و نصیحت اور کچھ وعظ و استدلال کے لیے لاکھوں گوسالہ پرستوں کے سامنے کھڑے ہوں تو مسلّم طور پر اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ انہیں یہی چاہیئے تھا کہ وہ اس موقع پر تین امور کے لیے قاطعانہ اور جرأتمندانہ طور پر کھڑے ہو جائیں اپنے بھائی کے سامنے، سامری کے سامنے اور گوسالہ پرستوں کے سامنے پہلے انہوں نے اپنے بھائی سے کام شروع کیا۔ ان کی ریش مبارک پکڑ لی اور اُسے اپنی طرف کھینچا اور چیخنے اور چلّانے لگے اور حقیقت میں ان کے لیے یہ ایک عدالت قائم کی، (اگرچہ آخرکار ہارونؑ کی بیگناہی لوگوں پر ثابت ہوگئی) تاکہ دوسرے اپنا حساب خود سوچ لیں۔
اس کے بعد اس سازش کے اصلی عامل یعنی سامری کی طرف گئے اور اُسے ایسی سزا دی کہ جو قتل کرنے سے بھی بدتر تھی۔ اُسے معاشرے سے باہر نکال دیا، اس کو گوشہ نشین کر دیا اور اُسے ایک نجس اور آلودہ وجود قرار دیا کہ جس سے سب کا دُوری اختیار کرنا ضروری ہوگیا اور اس کے لیے

---

لہ اس دو ٹوک ٹکر کی ایک نظیر انحرافی افکار کی بیخ کنی کے لیے مسجد ضرار کے بارے میں قرآن میں اشارے کے طور پر اور تاریخ و حدیث میں تفصیلی طور پر بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ مسجد ضرار کو پہلے جلادیں اور جو کچھ باقی رہ جائے اس کو ویران کردیں اور اس کی جگہ کو مدینہ کے لوگوں کے لیے کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ قرار دیں (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۸ سورہ توبہ کی آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ کے ذیل میں ملاحظہ کریں)۔



Marfat.com

پروردگار کی طرف سے دردناک عذاب کی تہدید کی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستوں کی طرف آئے اور انہیں سمجھایا کہ تمہارا یہ گناہ اس قدر بڑا ہے کہ جس سے توبہ کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے درمیان تلوار رکھ دو اور ایک گروہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو اور یہ گندہ خون معاشرے کے جسم سے نکال دیا جائے اور اس طرح گنہگاروں کی ایک جماعت کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے مارے جائیں تاکہ یہ انحرافی فکر ہمیشہ کے لیے ان کے دماغ سے نکل جائے۔ اس واقعہ کی تفصیل ہم جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۵۱ تا ۵۴ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

تو اس طرح سب سے پہلے جمعیت کے رہبر کی جواب طلبی ہونی چاہیئے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے یا نہیں اور اس کی بے گناہی ثابت ہونے کے بعد عامل فساد کا پیچھا کیا جائے اور اس کے بعد فساد کے طرفداروں اور ہوا خواہوں کا پیچھا کیا جانا چاہیئے۔

**۲۔ سامری کون ہے؟** اصل لفظ "سامری" عبرانی زبان میں "شمری" ہے اور چونکہ یہ معمول ہے کہ جب عبرانی زبان کے الفاظ عربی زبان میں آتے ہیں تو "شین" کا لفظ "سین" سے بدل جاتا ہے، جیسا کہ "موشی" "موسیٰ" سے اور "یشوع" "یسوع" سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر سامری بھی "شمرون" کی طرف منسوب تھا، اور "شمرون" "یشاکر" کا بیٹا تھا، جو یعقوبؑ کی چوتھی نسل ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عیسائیوں کا قرآن پر یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ کہ قرآن نے ایک ایسے شخص کو کہ جو موسیٰ کے زمانہ میں رہتا تھا اور وہ گوسالہ پرستی کا سرپرست بنا تھا، شہر سامرہ سے منسوب "سامری" کے طور پر متعارف کرایا ہے، جب کہ شہر سامرہ اس زمانے میں بالکل موجود ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "سامری" شمرون کی طرف منسوب ہے نہ کہ سامرہ شہر کی طرف۔[۱]

بہرحال سامری ایک خود خواہ اور منحرف شخص ہونے کے باوجود بڑا ہوشیار تھا۔ وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ بنی اسرائیل کے ضعف کے نکات اور کمزوری کے پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہوئے اس قسم کا عظیم فتنہ کھڑا کرنے پر قادر ہو گیا کہ جو ایک قطعی اکثریت کے بت پرستی کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے اپنی اس خود خواہی اور فتنہ انگیزی کی سزا بھی اسی دنیا میں دیکھ لی۔

۹۹۔ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚۖ

۱۰۰۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۙ

۱۰۱۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ

[۱] اعلام قرآن ص ۳۵۹۔



Marfat.com

۱۰۲۔ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۝
۱۰۳۔ یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝
۱۰۴۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ
اِلَّا یَوْمًا ۝

## ترجمہ

۹۹۔ ہم اسی طرح سے تمہارے لیے گزری ہوئی خبروں کو بیان کرتے ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے تجھے ذکر (قرآن) عطا فرمایا۔
۱۰۰۔ جو شخص اس سے منہ پھیرلے وہ قیامت کے دن (گناہ اور جوابدہی کا) سنگین بوجھ (اپنے کندھے پر) اٹھائے گا۔
۱۰۱۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور قیامت کے دن ان کے اٹھانے کے لیے بہت ہی برا بوجھ ہے۔
۱۰۲۔ وہ دن کہ جس میں صور پھونکا جائے گا اور اس دن ہم مجرمین کو نیلے بدنوں کے ساتھ جمع کریں گے۔
۱۰۳۔ وہ آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہوں گے (بعض کہیں گے) تم نے (عالم برزخ میں) صرف دس شبانہ روز قیام کیا ہے۔
۱۰۴۔ وہ جو کچھ کہیں گے ہم اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ جب کہ وہ شخص جس کی روش ان میں سے سب سے بہتر ہے کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو۔

## تفسیر

**ان کے کندھوں پر بدترین بوجھ**، گزشتہ آیات اگرچہ موسیٰ، بنی اسرائیل، سامری اور فرعونیوں کی تاریخ کے بارے میں تھیں۔ اس کے باوجود ان آیات کے متن کی مناسبت سے طرح طرح کی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ان مباحث کے اختتام پر قرآن ایک کلی نتیجہ بھی پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ: ہم اسی طرح سے گزری ہوئی خبروں کو یکے بعد دیگرے تیرے لیے بیان کرتے ہیں (کذالك نقص علیك من انباء ما قد سبق)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے اپنی طرف سے تجھے قرآن دیا (وقد اٰتیناك من لدنا ذکرًا)۔

وہ قرآن، کہ جو دروس عبرت، دلائل عقلی، گزشتہ قوموں کی سبق آموز خبروں اور آئندہ آنے والے لوگوں کو بیدار کرنے والے مسائل سے معمور ہے۔

اصولی طور پر قرآن مجید کا اہم حصہ گزشتہ لوگوں کی سرگزشت کا بیان ہے۔



Marfat.com

قرآن ایک انسان ساز کتاب ہے ــــ اس میں گزرے ہوئے لوگوں کی یہ تمام تاریخ بلاوجہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی وجہ ان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں، کامیابی و شکست کے عوامل اور سعادت و بدبختی کے اسباب سے اور ان کی تاریخ کے صفحات میں پہنچے ہوئے فراواں تجربات سے استفادہ کرنا ہے ۔

کُلی طور پر علوم میں سے سب سے زیادہ قابلِ اطمینان تجرباتی علوم ہیں کہ جو تجربہ گاہوں میں تجربے سے گزارے جاتے ہیں اور ان کے عینی نتائج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔

تاریخ ، انسانوں کی زندگی کی عظیم تجربہ گاہ ہے اور اس تجربہ گاہ میں، اقوام کی سربلندی و شکست ، کامیابی و ناکامی، خوش بختی و بدبختی سب کی سب تجربے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اُن کے عینی نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور ہم زندگی کے مسائل کے سلسلہ میں اپنے علوم و دانش کے زیادہ قابلِ اطمینان حصّہ کو اُن سے سیکھ سکتے ہیں ۔

دوسرے لفظوں میں انسان کی زندگی کا حاصل ــــ ایک لحاظ سے ــــ تجربہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے ۔ اور تاریخ ــــ میں کسی قسم کی تحریف نہ کی گئی ہو تو انسانوں کے ہزاروں سال کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہے اور یہ سب کچھ مطالعہ کرنے والوں کو ایک ہی جگہ سے مل جاتا ہے ۔

اسی بناء پر امیرالمومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو اپنے حکیمانہ پند و نصائح میں خصوصاً اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

ای بنی انی وان لو اکن عمرت عمر من کان قبلی، فقد نظرت فی اعمالھو و فکرت فی اخبارھو، وسرت فی اٰثارھو حتّٰی عدت کاحدھو، بل کانی بما انتھی الیّ من امورھو قد عمرت مع اولھو الی اٰخرھو، فعرفت صفو ذالك من کدرہ ونفعہ من ضررہ فاستخلصت لك من کل امر نخیلہ :

اے بیٹا ! یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ان تمام لوگوں جتنی ، کہ جو مجھ سے پہلے ہو گزرے ہیں، زندگی نہیں گزاری لیکن میں نے ان کے کردار پر نظر ڈالی اور ان کی خبروں میں غور و فکر کیا اور انکے آثار میں سیر و سیاحت کی ۔ یہاں تک کہ میں ان میں سے ایک کی طرح ہو گیا ہوں، بلکہ چونکہ ان کی تاریخ مجھ تک پہنچی ہے تو گویا میں اُن سب کے ساتھ اولِ دنیا سے لے کر آج کے دن تک رہا ہوں ۔ میں نے ان کی زندگی کے صاف و شفاف حصّہ کو گدلے اور تاریک حصّہ سے الگ کر کے پہچان لیا ہے ۔ ان کے نفع و نقصان کو جان لیا ہے اور ان تمام میں سے تیرے لیے اہم اور منتخب حصّوں کا خلاصہ بیان کیا ہے [1]

اس بناء پر تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جو گزشتہ زمانہ کو عیاں کرتا ہے اور ایک ایسا حلقہ ہے کہ جو آج کو کل کے ساتھ متصل کر دیتا ہے ۔ تاریخ انسان کی عمر کو اس کے اندازے سے بڑا بنا دیتی ہے ۔

---

[1] نہج البلاغہ کا خط ۳۱ (خطوط کا حصّہ)۔



Marfat.com

تاریخ ایک ایسا معلم ہے کہ جو انسانوں کی عزت اور ذلت کے بھیدوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ تاریخ ستمگروں کو پہلے زمانے کے ظالموں کے بُرے انجام سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ ظالم جو اُن سے زیادہ طاقتور تھے۔ تاریخ مردانِ حق کو بشارت دیتی ہے اور استقامت اور پامردی کی دعوت دیتی ہے اور انہیں اپنے سفر کے لیے گرماتی ہے۔

تاریخ ایک ایسا چراغ ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کے راستوں کو روشن کرتا ہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے لیے راہیں کھولتا اور ہموار کرتا ہے۔ تاریخ آج کے انسانوں کی تربیت کرتی ہے اور آج کے انسان کل کی تاریخ بناتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائی ہدایت کے اسباب میں سے ایک تاریخ ہے۔

لیکن اس بارے میں کوئی اشتباہ اور غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ ایک سچی تاریخ کا بیان جس قدر تعمیری اور تربیتی ہے اسی قدر جعلی اور تحریف شدہ تاریخیں گمراہی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی بناء پر جن لوگوں کے دل بیمار ہیں انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ تاریخ میں تحریف کر کے انسانوں کو دھوکا دیں اور خدا کے راستہ سے روکیں۔ ہمیشہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تاریخ میں بہت زیادہ تحریف ہوتی ہے

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "ذکر" یہاں اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی آیات انسانوں کی بیداری اور ہوشمندی کے لیے تذکر اور یادآوری کا موجب ہوتی ہیں۔

* * *

اسی بناء پر بعد والی آیت ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ جو قرآن کے حقائق اور تاریخ کے عبرت انگیز سبق کو بھول جاتے ہیں، جو قرآن سے منہ پھیرے لے گا وہ قیامت میں گناہ اور جوابدہی کا سنگین بوجھ کندھے پر اُٹھائے ہوئے ہوگا:

(من اعرض عنه فانه يحمل يوم القيامة وزرًا)۔

ہاں! پروردگار سے روگردانی، انسان کو اس طرح سے بے راہ روی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے کہ قسم قسم کے گناہوں اور فکری و عقیدتی انحرافات کا سنگین بوجھ اس کے کندھے پر رکھ دیتی ہے (اصولی طور پر لفظ "وزر" خود سنگین بوجھ کے معنی میں ہے اور اسے نکرہ کی شکل میں پیش کرنا، اس بارے میں مزید تاکید ہے)۔

* * *

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ اپنے ان اعمال کے بوجھ تلے ہمیشہ ہمیشہ دبے رہیں گے: (خالدين فيه)۔

"اور گناہ کا یہ سنگین بوجھ، ان کے لیے قیامت کے دن بہت ہی بُرا بوجھ ہے" (وساء لهم يوم القيامة حملًا)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ "فیہ" کی ضمیر اس آیت میں "وزر" کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ اسی "وزر" جوابدہی اور اپنے سنگین بوجھ میں ہمیشہ رہیں گے (ہمارے پاس اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہاں پر کسی چیز کو مقدر مانیں اور یہ کہیں کہ وہ عذاب میں یا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے) نیز یہ آیت خود تجسم اعمال کے مسئلہ کی طرف ایک اشارہ ہے اور یہ کہ انسان اُنہی اعمال اور کاموں کی وجہ سے کہ جو اس نے اس جہان میں انجام دیئے ہیں قیامت میں اچھی جزا یا بُری سزا دیکھے گا۔

---

۱۔ ہم نے تاریخ اور اس کی اہمیت کے بارے میں سورہ یوسف کی ابتداء اور آخر میں" جلد ۹، صفحہ ۲۷۹ اُردو ترجمہ اور جلد ۱۰ صفحہ ۹۵ اُردو ترجمہ اور اسی طرح سورہ ھود جلد ۹ صفحہ ۲۶۳ اُردو ترجمہ میں بحث کی ہے۔



Marfat.com

اس کے بعد قیامت کے دن کی توصیف اور اس کے آغاز کے بیان کو شروع کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: وہی دن کہ جس میں صور پھونکا جائے گا اور ہم گنہگاروں کو نیلے اور سیاہ بدنوں کے ساتھ، اس دن جمع کریں گے (یوم ینفخ فی الصور و نحشر المجرمین یومئذٍ زرقًا)۔

جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام اور دوسرے جہان کا آغاز، دو انقلابی اور ناگہانی جنبشوں کے ساتھ صورت پذیر ہوگا کہ جن میں سے ہر ایک کو "نفخۂ صور" (صور پھونکنے) سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی تشریح ہم انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں کریں گے۔

لفظ "زرق" "ازرق" کی جمع ہے جو عام طور پر نیلی آنکھ والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کبھی اس شخص پر بھی کہ جس کا بدن درد اور تکلیف کی شدت کی وجہ سے سیاہ اور نیلا ہو چکا ہو، بولا جاتا ہے کیونکہ بدن درد اور تکلیف کے وقت نحیف اور کمزور ہو کر اپنی طراوت اور رطوبت کو کھو بیٹھتا ہے اور نیلا نیلا سا نظر آتا ہے۔

بعض نے اس لفظ کی "نابینا" کے معنی سے بھی تفسیر کی ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیلی آنکھ والے افراد کی بینائی بہت کمزور ہوتی ہے اور عام طور پر ان کے بدن کے بال بھی کمزور ہوتے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کی تفسیر میں بیان کیا ہے، شاید وہ سب سے بہتر ہو۔

٭ ٭ ٭

اس حالت میں مجرمین آپس میں عالم برزخ میں اپنے توقف کی مقدار کے بارے میں آہستہ آہستہ گفتگو کریں گے۔ بعض کہیں گے کہ تم تو صرف دس راتیں (یا دس رات دن) عالم برزخ میں رہے ہو۔ (یتخافتون بینھم ان لبثتم الا عشرًا)[له]

اس میں شک نہیں کہ عالم برزخ میں ان کے توقف کی مدت بہت طولانی تھی لیکن قیامت کی عمر کے مقابلہ میں بہت ہی مختصر نظر آتی ہے۔

ان کا یہ آہستہ آہستہ کہنا یا تو اس شدید وحشت اور رعب کی وجہ سے ہوگا کہ جو قیامت کا منظر دیکھ کر انہیں لاحق ہوگا یا ضعف و ناتوانی کے اثر سے ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ دنیا میں ان کے توقف کی طرف اشارہ ہے کہ جو آخرت اور اس کے وحشت ناک حوادث کے مقابلہ میں چند مختصر دن ہی معلوم ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم اس سے کہ جو وہ کہتے ہیں مکمل طور پر آگاہ ہیں: (نحن اعلم بما یقولون)۔
چاہے وہ آہستہ سے کہیں یا بلند آواز سے۔

"اور اس موقع پر وہ شخص کہ جو سب سے بہتر راہ و روش اور عقل و شعور رکھتا ہے، یہ کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو"

---

له عربی ادب کے لحاظ سے چونکہ "عشرًا" یہاں مذکر کی شکل میں آیا ہے لہٰذا یقیناً اس کا مضاف الیہ "لیال" ہونا چاہیئے جو کہ مؤنث ہے۔ اور اگر اس کا مضاف الیہ "ایام" ہوتا تو "عشرۃ" کہا جاتا۔ لیکن بعض عرب ادبا کہتے ہیں کہ جس وقت عدد تنہا شکل میں ظاہر ہو اور اس کی تمیز محذوف ہو تو پھر سابقہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ لہٰذا "عشر" یہاں دس دنوں کی طرف اشارہ ہے۔



Marfat.com

(اذ یقول امثلھم طریقۃً ان لبثتم الا یومًا)۔

مسلمہ طور پر نہ تو دس دن کی طولانی مدت ہے اور نہ ہی ایک دن کی لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ ایک دن تو اکائیوں میں سے سب سے کمتر عدد کی طرف اشارہ ہے اور دس دن دھائیوں میں سے کم عدد کی طرف ۔ لہٰذا پہلا زیادہ کم مدت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اسی لیے قرآن نے اس کے کہنے والے کے بارے میں " امثلھم طریقۃ " (جس کی روش اور طریقہ بہتر ہے) فرمایا ہے ۔ کیونکہ عمر دنیا کی کوتاہی یا برزخ کا چھوٹا ہونا، آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں اور اسی طرح ان کی کیفیت کا ناچیز ہونا اس کی کیفیت کے مقابلہ میں کم سے کم عدد کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے ۔ (غور کیجئے گا)۔

✣ ✣ ✣

۱۰۵- وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝

۱۰۶- فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝

۱۰۷- لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝

۱۰۸- يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ

لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝

۱۰۹- يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ

رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۝

۱۱۰- يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ

بِهٖ عِلْمًا ۝

۱۱۱- وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝

۱۱۲- وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ

ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ۝

✣ ✣ ✣



Marfat.com

# ترجمہ

۱۰۵۔ "اور تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تم کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں (ریزہ ریزہ کرکے) تباہ کردے گا"
۱۰۶۔ پھر زمین کو صاف ہموار اور بے آب و گیاہ چھوڑ دے گا۔
۱۰۷۔ (اس طرح سے کہ) تو اس میں کسی قسم کی پستی اور بلندی نہیں دیکھے گا۔
۱۰۸۔ اس دن سب کے سب خدائی دعوت کرنے والے کی پیروی کریں گے (اور نئی زندگی کے لیے اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے) اور تمام آوازیں عظمتِ خدا کے سامنے خاضع ہوں گی اور سوائے آہستہ آواز کے تو کچھ نہ سنے گا۔
۱۰۹۔ اس دن (کسی شخص کی) شفاعت فائدہ نہیں دے گی، سوائے اس شخص کے کہ جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہے اور وہ اس کی گفتگو سے راضی ہے۔
۱۱۰۔ جو کچھ ان (مجرمین) نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ اسے جانتا ہے۔
۱۱۱۔ اور (اس دن) تمہارے چہرے خدائے حیّ و قیوم کے سامنے خاضع ہوں گے اور مایوس (اور زیاں کار) وہ لوگ ہوں گے کہ جنہوں نے ظلم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔
۱۱۲۔ (لیکن) وہ شخص کہ جو مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل انجام دے گا، نہ تو اسے کسی ظلم کا خوف ہوگا اور نہ ہی اپنے حق کے نقصان کا۔

# تفسیر

## قیامت کا ہولناک منظر:

چونکہ گزشتہ آیات میں اختتامِ دنیا اور آغازِ قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، زیرِ بحث آیت میں بھی وہی مسئلہ جاری ہے۔

پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبرِ اسلام سے، دنیا کے اختتام کے موقع پر پہاڑوں کے انجام کے بارے میں سوال کیا ہوگا۔ شاید اس بنا پر کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے موجودات کہ جن کی جڑیں زمین کی گہرائی میں گئی ہوئی ہیں اور سر آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں اور اگر یہ بات ہو کہ انہیں جڑ سے ہی اکھاڑ دیا جائے گا، تو وہ کونسا طوفان اور آندھی ایسی ہے کہ جو ایسا کر سکے گی۔

لہٰذا قرآن کہتا ہے: تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (ویسئلونک عن الجبال)۔

جواب میں اُن سے "کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں بکھیر کر سنگریزوں میں تبدیل کر دے گا اور پھر انہیں تباہ و برباد کر دے گا":

(فقل ینسفھا ربی نسفا)[1]

پہاڑوں کے انجام کے بارے میں، قرآن کی تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدانِ قیامت میں مختلف مراحل طے کریں گے۔

(1 اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)



Marfat.com

پہلے تو وہ لرزہ براندام ہوں گے :

یوم ترجف الارض والجبال (مزمل - ۱۴)

پھر وہ چلنے لگ جائیں گے :

وتسیر الجبال سیرا (طور - ۱۰)

اور تیسرے مرحلے میں وہ بکھر کر سنگریزوں کی شکل اختیار کرلیں گے :

وکانت الجبال کثیبا مہیلا (مزمل ۱۴)

اور آخری مرحلے میں طوفان اور آندھیاں انہیں اپنی جگہ سے اٹھا کر فضا میں بکھیر دیں گی کہ وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح نظر آئیں گے :

وتکون الجبال کالعھن المنفوش (قارعہ - ۵)

بعد والی آیت کہتی ہے کہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور ان کے ذرات کے بکھر جانے کے ساتھ " خدا صفحۂ زمین کو ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ چٹیل میدان کی طرح کر دے گا" : ( فیذرھا قاعا صفصفا )۔[1]

اس طرح سے کہ تم اس میں کسی طرح کا ٹیڑھا پن اور پستی و بلندی نہ دیکھو گے " : ( لا تری فیھا عوجا ولا امتا )[2]

" اس وقت خدا کی طرف سے دعوت کرنے والا ، زندہ ہو کر محشر میں جمع ہونے اور حساب کتاب کی دعوت دے گا اور بے کم و کاست سب کے سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں گے ۔ اور اس کی پیروی کریں گے " : ( یومئذ یتبعون الداعی لا عوج لہ )۔

کیا یہ دعوت کرنے اور پکارنے والا " اسرافیل " ہوگا یا خدا کے بزرگ فرشتوں میں سے کوئی اور عظیم فرشتہ ہوگا ؟ قرآن سے واضح نہیں ہوتا لیکن جو کوئی بھی ہو ، اس کا حکم اس طرح سے نافذ ہوگا کہ کسی شخص میں اس کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت نہ ہوگی ۔

" لا عوج لہ " ( کسی قسم کا انحراف اور کجی نہیں رکھتا ) ممکن ہے کہ اس دعوت کرنے والے کی دعوت کا وصف ہو یا جن کو دعوت دی جائے گی ان کی توصیف ہو یا یہ دونوں کے لیے ہو ۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جس طرح سطح زمین اس طرح صاف اور ہموار ہو جائیگی کہ اس میں معمولی سا ٹیڑھا پن بھی باقی نہ رہے گا ، اسی طرح خدا کا فرمان اور اس کی صاف دعوت دینے والا بھی ویسا ہی صاف و مستقیم ہوگا اور اس کی پیروی بھی ایسی صاف ستھری ہوگی کہ اس میں کسی قسم کی کجی اور انحراف نظر نہیں آئے گا ۔

اس موقع پر پروردگار رحمان کی عظمت کے سامنے تمام کی تمام آوازیں خاضع ہو جائیں گی اور آہستہ آہستہ سی آوازوں کے سوا تمہیں کوئی

---

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ) " نسف " کا مادہ لغت میں غذائی دانوں کو چھلنی میں ڈال کر ہلانے اور پھٹکنے کے معنی میں ہے تا کہ چھلکے دانوں سے علیحدہ ہو جائیں اور یہاں پہاڑوں کے بکھرنے ، خراب ہونے اور اس کے بعد تباہ و برباد ہو جانے کی طرف اشارہ ہے ۔

(اس صفحے کا حاشیہ)

[1] " قاع " صاف و ہموار زمین کو کہتے ہیں ۔ بعض نے اس کو ایک ایسی جگہ کہ جس میں پانی جمع ہو سے تفسیر کیا ہے ۔ رہا " صفصف " تو یہ کبھی تو ایسی زمین کے معنی میں آتا ہے کہ جو ہر قسم کی گھاس سے خالی ہو اور کبھی صاف زمین کے معنی میں ۔ ان دونوں صفات کے مجموعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دن پہاڑ اور گھاس وغیرہ سب کچھ زمین سے ختم ہو جائیں گے اور صاف اور سادہ زمین باقی رہ جائے گی ۔

[2] " عوج " کجی اور گڑھے کے معنی میں ہے اور " امت " اونچی زمین اور ٹیلے کے معنی میں ہے ۔ اس بنا پر آیت مجموعی طور پر یہ معنی دے گی کہ اس دن کسی قسم کی پستی و بلندی زمین میں نظر نہیں آئے گی ۔



Marfat.com

چیز سنائی نہ دے گی" (وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همسًا)۔[1]

آوازوں کی یہ خاموشی یا تو عرصہ محشر میں عظمتِ الٰہی کے رعب کی وجہ سے ہوگی کہ جس کے سامنے سب کے سب خضوع کریں گے یا حساب وکتاب اور نتیجہ اعمال کے خوف سے اور یا دونوں وجوہ سے۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس اشتباہ میں گرفتار ہو جائیں کہ گناہوں میں غرق ہونے کے باوجود کچھ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے ذریعہ بچنا ممکن ہو جائے گا تو فوراً فرمایا گیا ہے: اُس دن کسی کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی۔ سوائے اُن لوگوں کی شفاعت کے کہ جنہیں خدائے رحمٰن شفاعت کی اجازت دیدے گا اور اس سلسلے میں ان کی گفتگو سے راضی ہوگا (یومئذٍ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمٰن ورضی له قولاً)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں شفاعت بے حساب نہیں ہوگی بلکہ شفاعت کا پروگرام، شفاعت کرنے والوں کے بارے میں بھی اور جن کی شفاعت ہو سکے گی، اُن کے بارے میں بھی، ایک دقیق پروگرام ہے اور جب تک لوگوں میں اس بات کی لیاقت اور استحقاق نہ ہو کہ ان کی شفاعت کی جائے، شفاعت بے معنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ شفاعت کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور اُسے بلا تشبیہ دنیا کی پارٹی بازیوں کی طرح سمجھتے ہیں حالانکہ شفاعت اسلام کی منطق کے لحاظ سے تربیت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے اور ان لوگوں کے لیے کہ جو راہ حق میں جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں ایک درس ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی اعمال کی کمی اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ لغزشیں مایوسی اور ناامیدی میں گرفتار کر دیں۔ اس مقام پر شفاعت ایک قوی محرک کے طور پر ان کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ مایوس نہ ہو اور راہِ حق پر اسی طرح چلتے رہو اور اس راہ میں سعی و کوشش سے دستبردار نہ ہو اور اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو ایسے شفاعت کرنے والے موجود ہیں کہ جو خدائے رحمٰن کی اجازت ــــ کہ جس کی عمومی رحمت نے سب کو گھیر رکھا ہے ــــ تمہاری شفاعت کریں گے۔

یہ شفاعت سستی اور کاہلی یا مسئولیت وجوابدہی سے فرار، یا ارتکابِ گناہ کے لیے سبز باغ نہیں ہے۔ بلکہ شفاعت راہِ حق میں استقامت اور جہاں تک ممکن ہو سکے، گناہوں کو کم سے کم کرنے کی دعوت ہے۔

اگرچہ ہم شفاعت کی بحث جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں اور جلد دوم سورہ بقرہ آیہ ۲۵۵ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں، البتہ کوئی حرج نہیں ہے کہ یہاں بھی ایک عمدہ داستان کا اضافہ کریں اور وہ یہ ہے کہ عالم ربانی مرحوم یاسری کہ جو علمائے تہران میں سے تھے۔ اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ایک شاعر جس کا نام حاجب تھا، مسئلہ شفاعت میں عامیانہ اشتباہات میں گرفتار تھا۔ اس نے اس مضمون کا ایک شعر کہا:

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است
من ضامنم کہ ہر چہ بخواہی گناہ کن

اے حاجب! اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے، تو میں ضامن ہوں تم جتنے چاہو

---

[1] "همس" (بروزن لمس) جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، آہستہ اور پنہاں آواز کے معنی میں ہے۔ بعض اس کو پاؤں کی آہستہ چاپ (ننگے پاؤں سے چلنے کی آواز) کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں اور بعض لبوں کی حرکت سے بغیر اس کے کہ ان کی آواز سنی جائے۔ ان تمام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔



Marfat.com

گناہ کرو۔

وہ رات کے وقت عالم خواب میں امیرالمومنین علی علیہ السلام کو دیکھتا ہے کہ وہ جناب انتہائی غصہ اور غضب کی حالت میں ہیں اور فرمارہے ہیں کہ (اے حاجب) تونے شعر ٹھیک نہیں کہا ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ پھر کیا کہوں؟ تو آپؑ فرماتے ہیں کہ تو اپنے شعر کی اس طرح اصلاح کر:

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است
شرم از رخ علیؑ کن و کمتر گنہ کن

اے حاجب! اگر حشر کا معاملہ علی کے ہاتھ میں ہے، تو علیؑ کے چہرے سے شرم کر
اور گناہوں کو چھوڑ دے۔

٭ ٭ ٭

اور چونکہ لوگوں کا قیامت کے میدان میں حساب اور جزا کے لیے حاضر ہونا، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خدا ان کے اعمال و کردار سے آگاہ ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں اس طرح اضافہ کیا گیا ہے: خدا ان تمام باتوں کو جو انہوں نے آگے بھیجی ہیں اور جنہیں وہ دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، جانتا ہے اور ان کے تمام افعال و اقوال اور نیات سے جو وہ پہلے رکھتے تھے اور اس جزا و سزا سے کہ جو انہیں آئندہ پیش آنے والی ہے سب سے باخبر ہے لیکن وہ پروردگار کے بارے میں احاطہ علمی نہیں رکھتے (یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یحیطون بہ علما)۔[1]

اس طرح سے خدا کا علمی احاطہ ان کے اعمال کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جزا کے سلسلہ میں بھی اور یہ دونوں حقیقت میں کامل اور عادلانہ قضاوت کے دو رکن ہیں کہ قاضی ان حادثات سے بھی کہ جو رونما ہوتے ہیں کامل طور پر باخبر ہو اور ان کے فیصلہ اور جزا سے بھی آگاہ ہو۔

٭ ٭ ٭

"اور اس دن تمام لوگ خدائے حیّ و قیوم کے سامنے مکمل طور پر خاضع ہوں گے": (وعنت الوجوہ للحی القیوم)۔

"عنت" "عنوۃ" کے مادہ سے خضوع اور ذلت کے معنی میں ہے۔ لہٰذا قیدی کو "عانی" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ قید کرنے والے کے ہاتھ میں خاضع اور ذلیل ہوتا ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں پر خضوع کی "وجوہ" (چہروں) کی طرف نسبت دی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نفسیاتی اظہارات۔ کہ جن میں سے ایک خضوع بھی ہے ۔ سب سے پہلے اس کے آثار چہروں پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "وجوہ" یہاں پر رؤسا اور امرا اور صاحبانِ اقتدار کے معنی میں ہے کہ اس دن وہ سب کے سب بارگاہ میں ذلیل و خاضع ہوں گے (لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)۔

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ پہلے جملے میں جمع کی ضمیر، شفاعت کرنے والوں کی طرف لوٹتی ہیں اور بعض نے یہ بھی احتمال ذکر کیا ہے کہ "بہ" کی ضمیر مجرمین کے اعمال اور ان کے نتائج کی طرف لوٹتی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے (غور کیجئے گا)



Marfat.com

اِس مقام پر خدا کی تمام صفات میں سے "حیّ و قیوم" کا انتخاب اِس وجہ سے ہے کیونکہ یہ دونوں صفات قیامت کے مسئلہ کے ساتھ کہ جو سب کی زندگی اور قیام کا دن ہے، مناسبت رکھتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: خدائی ثواب سے مایوس اور ناامید وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ظلم و ستم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہوا ہے (وقد خاب من حمل ظلماً)۔

گویا ظلم و ستم ایک ایسے عظیم بوجھ کی طرح ہے کہ جو انسان کے کندھوں پر وزن ڈالتا ہے اور اس کو خدا کی دائمی نعمتوں کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے ظالم ہمگر چاہے انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہو یا دوسروں پر ناامید ہو کر اُن کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے اِس لیے کہ اس دن اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ہلکے بوجھ والے جنت کی طرف چلے جا رہے ہیں لیکن وہ ظلم کے سنگین بوجھ میں دبے ہوئے جہنم کے قریب گھٹنے ٹیکے ہوئے ہیں۔

۞ ۞ ۞

چونکہ قرآن کی روش عام طور پر مسائل میں مطابقت کو بیان کرنا ہے لہٰذا اس دن ظالموں اور مجرموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: باقی رہے وہ لوگ کہ جو اعمال صالح بجا لائیں اور وہ مومن بھی ہوں، تو وہ نہ تو کسی ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی اپنے حق کا نقصان ہو جانے سے (ومن یعمل من الصالحات وھو مؤمن فلا یخاف ظلما ولا ھضما)[1]۔

"من الصالحات" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تمام نیک اعمال کو انجام نہیں دے سکتے، تو کم از کم اُن میں سے کچھ تو بجا لائیں کیونکہ ایمان عملِ صالح کے بغیر ایک ایسا درخت ہے کہ جس پر پھل نہ لگتے ہوں۔ جیسا کہ عمل صالح ایمان کے بغیر ایسا درخت ہے کہ جس کی جڑیں نہ ہوں، جو ممکن ہے کچھ دن کھڑا رہے، لیکن آخر کار خشک ہو جائے گا۔ اسی بنا پر عمل صالح کے ذکر کے بعد زیر نظر آیت میں "وھو مؤمن" شرط کا ذکر ہے۔

اصولی طور پر عمل صالح ایمان کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر کبھی بے ایمان لوگ کوئی نیک کام انجام دیں تو بلاشک و شبہ وہ محدود کمزور اور استثنائی ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس غرض سے کہ عملِ صالح مسلسل، پائیدار اور گہرا انجام پائے، اسے پاک اور صحیح عقیدے سے سیراب ہونا چاہیئے۔

## چند نکات:

**۱۔ "ظلم" اور "ہضم" میں فرق:** زیر بحث آیات کے آخری جملہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالح مومنین اس دن نہ تو ظلم سے ڈریں گے اور نہ ہی ہضم سے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ظلم" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس دادگاہ عدل میں ہرگز اس بات کا خوف نہیں ہوگا کہ ان پر کوئی ظلم و ستم ہوگا اور کسی ایسے گناہ پر ان کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جسے انہوں نے انجام نہیں دیا۔

[1] "ہضم" لغت میں "نقص" اور کمی کے معنی میں ہے اور اگر بدن میں غذا کے جذب ہونے کو ہضم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا ظاہراً کم ہو جاتی ہے اور اس کی تلچھٹ باقی رہ جاتی ہے۔



Marfat.com

اور "ہضم" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اپنے ثواب میں کمی کے بارے میں بھی کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی جزا پوری پوری بے کم وکاست انہیں دی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ پہلا لفظ تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اپنی تمام نیکیوں کے برباد ہوجانے کا خوف نہیں ہوگا۔ اور دوسرا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں اس میں تھوڑی سی کمی ہو جانے کے بارے میں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی کیونکہ خدائی حساب دقیق ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان صالح مومنین سے کچھ لغزشیں بھی سرزد ہوگئی تھیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان لغزشوں کو اس سے زیادہ کہ جتنی یہ ہیں، ان کے لیے نہیں لکھا جائے گا اور ان کے اعمالِ صالح کے ثواب میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کی جائے گی۔ مذکورہ بالا تفاسیر کیونکہ ایک دوسرے کے منافی نہیں لہٰذا ہوسکتا ہے کہ زیرِ بحث جملہ ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو۔

**۲۔ قیامت کے مرحلے:** زیرِ بحث آیات میں حوادث کے ایک سلسلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو دَورِ قیامت شروع ہونے سے پہلے اور اس کے بعد ظاہر ہوں گے:

۱۔ مُردے نئی زندگی کی طرف پلٹیں گے (یوم ینفخ فی الصور)۔
۲۔ گنہگار مجتمع اور محشور ہوں گے (نحشر المجرمین)۔
۳۔ زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے اور سطحِ زمین بالکل صاف ہموار ہوجائے گی (ینسفھا ربی نسفًا)۔
۴۔ سب کے سب خدا کی طرف سے پکارنے والے کے فرمان پر کان دھرے ہوئے ہوں گے۔ اور تمام آوازیں خاموش اور دھیمی ہوجائیں گی (یومئذ یتبعون الداعی ۔۔۔)۔
۵۔ اس دن اذنِ خدا کے بغیر شفاعت مؤثر نہیں ہوگی (یومئذ لا تنفع الشفاعۃ ۔۔۔)۔
۶۔ خدا اپنے بے انتہا علم کے ساتھ تمام کو حساب وکتاب کے لیے حاضر کرے گا (یعلم ما بین ایدیھم)۔
۷۔ سب کے سب اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے (وعنت الوجوہ للحی القیوم)۔
۸۔ ظالم وستمگر مایوس ہوجائیں گے (وقد خاب من حمل ظلمًا)۔
۹۔ اور مومن لطفِ پروردگار کے اُمیدوار ہوں گے (ومن یعمل من الصالحات وھو مؤمن ۔۔۔)۔

۱۱۳۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ○

۱۱۴۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ



Marfat.com

يُقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ○

## ترجمہ

۱۱۳۔ اور اسی طرح سے ہم نے اس قرآن کو (فصیح و بلیغ زبان) عربی میں اُتارا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے خوف دلایا ہے کہ شاید وہ تقویٰ اختیار کرلیں یا یہ ان کے لیے (نصیحت اور) یاد دہانی کا سبب بنے۔

۱۱۴۔ پس بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے اور تم قرآن پڑھنے میں، اس سے پہلے کہ اس کی وحی تجھ پر پوری ہو جلدی نہ کیا کرو۔ اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار! میرے علم کو اور زیادہ کر دے۔

## تفسیر

### پروردگارا ! میرے علم کو اور زیادہ کر دے :

گزشتہ آیات میں قیامت اور وعدو وعید سے مربوط تربیتی مسائل کے بارے میں جو کچھ آیا ہے تو درحقیقت اِن آیات میں اُس کی طرف مجموعی اعتبار سے اشارہ ہے۔

فرمایا گیا ہے: اسی طرح سے ہم نے اسے عربی (فصیح و بلیغ زبان میں) قرآن کی صورت میں اُتارا ہے اور ہم نے اس میں مختلف بیانات و عبارات کے ذریعے ڈرایا ہے کہ شاید وہ تقویٰ اور پرہیزکاری اختیار کریں۔ یا کم سے کم ان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہو۔ (وكذالك انزلناه قراٰنًا عربيًا وصرفنا فيه من الوعيد لعلهم يتقون او يحدث لهم ذكرًا)۔

"كذالك" کی تعبیر حقیقت میں ان مطالب کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس آیت سے پہلے بیان ہوئے ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انسان کسی دوسرے کے لیے بیدارکن اور عبرت انگیز مطالب بیان کرے اور اس کے بعد کہے کہ یوں پند و نصیحت کرنا چاہیئے — (اس بناء پر ہمیں دوسری تفسیروں کی ضرورت نہیں رہتی جو بعض مفسرین نے اس مقام پر بیان کی ہیں۔ اور وہ آیت کے معنی کے ساتھ کوئی مطابقت بھی نہیں رکھتیں)۔

لفظ "عربی" اگرچہ عربی زبان کے معنی میں ہے لیکن دو لحاظ سے یہاں قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کے مفاہیم کے رسا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

**پہلا** یہ کہ اصولی طور پر عربی زبان — دنیا بھر کے زبان شناسوں کی تصدیق کے مطابق — ایک رساترین زبان ہے اور اس کا ادب قوی ترین ادب ہے۔

**دُوسرا** یہ کہ کبھی "صرفنا" مختلف قسم کے بیانات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو قرآن ایک حقیقت بیان کرنے میں اختیار کرتا ہے مثلاً وعید اور مجرموں کی سزا کبھی گزشتہ اُمتوں کی سرگزشت کے لباس میں کبھی حاضرین سے خطاب کی صورت میں کبھی میدانِ قیامت میں ان کے



Marfat.com

حالات کی تصویر کشی کی صورت میں اور کبھی کسی دوسرے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

"لعلهم یتقون" کا "یحدث لهم ذکرا" سے فرق ممکن ہے کہ اس لحاظ سے ہو کر پہلے جملے میں تو وہ یہ کہتا ہے کہ مقصد تقویٰ کا کامل صورت میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر مکمل طور پر تقویٰ پیدا نہیں ہوتا تو کم از کم بیداری و آگاہی تو ہونا چاہیئے تاکہ اس وقت تک تو کچھ حدود میں اسے محدود کر دے اور آئندہ کے لیے مثبت حرکت کا سرچشمہ بن جائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ تو غیر پرہیزگاروں کے لیے پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا جملہ پرہیزگاروں کے لیے نصیحت اور یاددہانی کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲ میں بیان ہوا ہے:

اذا تلیت علیهم آیاته زادتهم ایمانا

جس وقت قرآن کی آیات مومنین کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دراصل زیر بحث آیت میں تعلیم و تربیت کے دو مؤثر اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے: اول بیان کی صراحت اور عبارات کے رسا ہونے اور ان کے روشن و دلنشین ہونے کا مسئلہ ہے اور دوسرے مطالب کو طرح طرح کے لباسوں میں بیان کرنا ہے تاکہ تکرار کا موجب نہ ہو اور دلوں میں اتر جانے کا باعث ہو۔

⁂

بعد والی آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے: بلند مرتبہ ہے وہ خدا کہ جو بادشاہ برحق ہے: (فتعالی الله الملك الحق)۔

ممکن ہے لفظ "حق" کا ذکر لفظ "ملک" کے بعد اس بناء پر ہو کہ لوگ عام طور پر لفظ "ملک" (بادشاہ) سے بُرا مفہوم لیتے ہیں اور اس سے ان کے ذہن میں ظلم و ستم اور خود سری کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: خدا بادشاہ برحق ہے۔

بعض اوقات پیغمبر اکرمؐ آیات قرآن حاصل کرنے کے اشتیاق اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے حفظ کرنے کی خاطر نزول وحی کے وقت جلدی فرمایا کرتے تھے اور جبرئیلؑ کو پورے طور پر اس بات کی مہلت نہ دیتے تھے کہ وہ اپنی بات کو تمام کر لیں۔ اس آیت کے آخر میں انہیں نصیحت کی جا رہی ہے: قرآن کے لیے جلدی نہ کیا کرو، اس سے پہلے کہ اس کی وحی پوری ہو: (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیك وحیه)۔

"اور یہ کہا کرو کہ اے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما (وقل رب زدنی علما)۔

قرآن کی بعض دوسری آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر میں نزول وحی کے وقت ایک خاص کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی کہ جو اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ حصول وحی میں جلدی کریں۔ مثلاً:

لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه و قرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه

اپنی زبان کو جلدی کی خاطر وحی حاصل کرتے وقت حرکت نہ دیا کرو۔ اسے تیرے سینے میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے تاکہ تو اسے تلاوت کر سکے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر تو اس کی



Marfat.com

تلاوت کی پیروی کرو۔[1]

# چند نکات :

## ۱۔ حصولِ وحی تک میں عجلت نہ کرو :

ان جملوں میں چند تربیتی سبق موجود ہیں۔ اُن میں سے ایک حصولِ وحی کے وقت عجلت کرنے سے نہی ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ کسی بات کرنے والے کی بات سُنتے وقت ابھی اس کا مطلب ختم ہونے نہیں پاتا کہ اسے دہرانے یا پُورا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس کام کی بنیاد کبھی تو بے صبری ہوتی ہے اور کبھی غرور و خود نمائی۔ البتہ بعض اوقات مطلب حاصل کرنے اور ماموریت کی انجام دہی کے لیے اشتیاق اور لگاؤ بھی انسان کو اس کام کے لیے آمادہ کر دیتا ہے۔ اس صورت میں عجلت پر اُبھارنے والا جذبہ تو مقدس ہوتا ہے لیکن نفس عمل یعنی عجلت کرنا عام طور پر مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے زیر بحث آیات میں اس کام سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ صحیح مقصد کے لیے ہی ہو۔ اصولی طور پر وہ کام جو جلد بازی میں انجام پاتے ہیں عیب و نقص سے خالی نہیں ہوتے۔ یقیناً طور پر پیغمبر اکرمؐ کا کام مقام عصمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطا و اشتباہ سے محفوظ تھا لیکن چونکہ انہیں ہر چیز میں لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہونا چاہیئے تاکہ لوگ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ جہاں وحی کو حاصل کرنے میں جلد بازی کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر باقی کاموں کا معاملہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

البتہ عجلت کا سرعت کے ساتھ اشتباہ نہیں کرنا چاہیئے۔ سرعت تو اس کو کہتے ہیں کہ پروگرام مکمل طور پر منظم ہو چکا ہے اور تمام مسائل کی جانچ پڑتال کر لی گئی ہے۔ اس کے بعد وقت ضائع کیے بغیر بلا تاخیر اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا جائے۔ لیکن عجلت اس کو کہتے ہیں کہ ابھی پروگرام اچھی طرح بنا نہیں ہے اور اس کے لیے ابھی تکمیل اور غور و خوض کی ضرورت ہے اور کام شروع کر دیا جائے۔ اسی بنا پر "سرعت" ایک پسندیدہ عمل ہے اور "عجلت" اور جلد بازی کرنا ناپسندیدہ کام ہے۔

البتہ اس جملہ کی تفسیر میں بعض دوسرے احتمالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ بعض اوقات وحی کے آنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ بے تاب ہو جایا کرتے تھے۔ یہ آیت آپؐ کو یہ تعلیم دے رہی ہے کہ بے تاب نہ ہوں۔ ہم برمحل جو کچھ ضروری ہوا آپ پر وحی کریں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کی آیات چونکہ مجموعی صورت میں ایک ہی مرتبہ شب قدر میں قلب پیغمبرؐ پر نازل ہو گئی تھیں اور دوسری مرتبہ بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوئیں۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تدریجی طور پر نازل ہوتے وقت کبھی کبھی جبرئیل سے پہلے ہی پڑھنے لگ جایا کرتے تھے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ تم اس کام میں عجلت مت کرو اور نزول تدریجی کو اس کے موقع اور محل پر انجام پانے دو۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

**۲۔ علم میں اضافے کے طلبگار رہو :** اس سبب سے کہ وحی حاصل کرتے وقت جلد بازی سے ممانعت ممکن ہے یہ وہم پیدا کرے کہ یہاں زیادہ علم حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : یہ کہا کرو کہ اے پروردگار ! میرے علم میں اضافہ فرما ( قل ربّ زدنی علمًا )۔

---

[1] سورہ قیامت ۱۵ تا ۱۷۔



Marfat.com

اس جملے سے مذکورہ خیال کو رد کیا گیا ہے۔ یعنی عجلت اور جلد بازی درست نہیں ہے۔ لیکن علم میں اضافے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ پہلے جملے میں نبی کریمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آیات کے تمام پہلوؤں کو دوسری آیات میں وضاحت سے پہلے سمجھنے میں جلدی نہ کیا کرو اور دوسرے جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا سے قرآن کی آیات کے مختلف مفاہیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی طلب کرو۔

بہر حال جہاں رسول اللہؐ اس علم سے سرشار اور آگہی سے معمور روح کے باوجود اس بات پر مامور ہوں کہ آخری عمر تک خدا سے علم میں اضافے کی دعا کرتے رہیں تو دوسروں کی ذمہ داری کامل طور پر واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اسلام کی نظر میں علم کی کوئی حد یا سرحد نہیں ہوتی۔ بہت سے امور میں زیادتی اور اضافے کا مطالبہ مذموم ہے لیکن علم میں ممدوح ہے۔ افراط بری چیز ہے لیکن علم میں افراط کا کوئی معنی نہیں ہے۔

علم کی کوئی مکانی سرحد نہیں ہے۔ چین اور ثریا تک بھی اس کی طلب میں دوڑنا چاہیئے۔ علم کوئی زمانی سرحد بھی نہیں رکھتا۔ گہوارے سے لے کر قبر تک جاری ہے۔

اسلام معلم اور استاد کے لحاظ سے بھی کوئی سرحد نہیں بناتا کیونکہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ جس شخص کے پاس سے اُسے ملے اس سے حاصل کرے اور اگر کوئی موتی کسی ناپاک منہ سے گرے تو اسے اٹھالے۔

تلاش و کوشش کی نظر سے بھی اس کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں جائے اور علم حاصل کرے۔ یہاں تک کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عزیز جان بھی دے دے۔

اس طرح سے منطق اسلام میں لفظ "فارغ التحصیل" ایک بے معنی لفظ ہے۔ ایک سچے مسلمان کی تحصیل علم ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہی علم کا متلاشی اور طالب علم رہتا ہے۔ چاہے وہ بہترین اُستاد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

ہم ہر شب جمعہ ایک خاص سرور اور خوشی حاصل کرتے ہیں۔

اُس نے عرض کیا:

خدا اس خوشی میں اور زیادتی کرے۔ یہ کونسی خوشی ہے۔

تو آپؑ نے فرمایا:

اذا کان لیلة الجمعة وافی رسول اللہ (ص) العرش ووافی الائمة (علیہم السلام) ووافینا معهم فلا نرد ارواحنا بابداننا الا بعلم مستفاد ولولا ذالك لا نفدنا۔

جب شب جمعہ ہوتی ہے تو رسول اللہ (ص) کی رُوح پاک اور آئمہ (علیہم السلام) کی ارواح اور ہم ان کے ساتھ عرش خدا کی طرف جاتے ہیں اور ہماری رُوحیں بدنوں کی طرف نہیں لوٹتیں مگر نئے علم کے ساتھ اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارے علوم ختم ہو جائیں۔[1]

یہ مضمون متعدد روایات میں مختلف عبارات کے ساتھ بیان ہوا ہے جو کہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ کے علم میں ہمیشہ

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۳۹۶۔



Marfat.com

اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب تک دنیا ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔[1]

ایک اور روایت میں پیغمبر بزرگوار اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

اذا اتی علیّ یوم لا ازداد فیہ علماً یقربنی الی اللّٰہ فلا بارک اللّٰہ لی فی طلوع شمسہ۔

جو دن مجھ پر ایسا آئے کہ اُس میں کسی علم کا مجھ میں اضافہ نہ ہو کہ جو مجھے اللہ کے قریب کرے :
اس دن کا طلوع آفتاب مجھ پر مبارک نہ ہو۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے :

اعلم الناس من جمع علم الناس الی علمہ، واکثر الناس قیمۃ اکثرھم علماً واقل الناس قیمۃ اقلھم علماً۔

لوگوں میں سے سب سے زیادہ صاحب علم وہ ہے کہ جو لوگوں کے علم کا اپنے علم میں اضافہ کرے۔
تمام لوگوں میں سے زیادہ گراں قدر وہ شخص ہے جس کا علم زیادہ ہو اور سب سے کم قدر و قیمت والا وہ شخص ہے کہ جس کا علم سب سے کم اور تھوڑا ہو۔[2]

یہ ہے علم کی قدر و قیمت اسلام کی نظر میں ۔

⁂

۱۱۵۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ○

۱۱۶۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ○

۱۱۷۔ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ○

۱۱۸۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ○

۱۱۹۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ○

---

۱۔ تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین و صافی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔
۲۔ سفینۃ البحار جلد ۲، ص ۲۱۹ (مادہ علم)



Marfat.com

۱۲۰۔ فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ○

۱۲۱۔ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ٘ وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ○

۱۲۲۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰی ○

## ترجمہ

۱۱۵۔ ہم نے آدم سے پہلے پہل عہد لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم و استقامت نہ پائی۔

۱۱۶۔ جس وقت ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا (اور سجدہ نہ کیا)

۱۱۷۔ ہم نے کہا : اے آدم ! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے باہر نکال دے کیونکہ اس طرح تو تم زحمت اور مشقت میں پڑ جاؤ گے۔

۱۱۸۔ (لیکن بہشت میں تم راحت و آرام سے ہو) اس میں تمہیں نہ تو بھوک لگے گی اور نہ ہی تم برہنہ ہو گے۔

۱۱۹۔ اور اس میں نہ تمہیں پیاس لگے گی نہ سورج کی دھوپ تمہیں تکلیف پہنچائے گی۔

۱۲۰۔ لیکن شیطان نے اُسے وسوسہ میں ڈال دیا اور کہا : اے آدم ! کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ میں تجھے عمرِ جاوداں کے درخت اور لافانی ملک کی طرف رہنمائی کروں ؟

۱۲۱۔ آخرکار دونوں نے اس میں سے کھا لیا (اور ان کا بہشتی لباس اُتر گیا) اور ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں بہشت کے درختوں کے پتوں کو اپنے اُوپر لپیٹنے لگے اور (آخرکار) آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور (اس کے انعامات سے) محروم ہو گیا۔

۱۲۲۔ اس کے بعد اس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ بنا لیا اور اس کی توبہ کرلی اور اسے ہدایت کی۔

## تفسیر

### شیطان کی فریب کاری :

اس سورہ کا ایک اہم حصہ موسیٰ و بنی اسرائیل کی سرگزشت اور فرعون اور اس کے حواریں کے ساتھ ان کے مقابلے کے ذکر پر مشتمل تھا لیکن



Marfat.com

زیر بحث آیات آدم و حوا کی داستان اور ابلیس کی اُن سے دشمنی اور مقابلہ کرنے کے بارے میں ہیں۔

شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ آج اور کل اور موسٰی و فرعون میں منحصر نہیں ہے۔ یہ ابتدائے آفرینش آدم سے جاری ہے اور اسی طرح سے جاری رہے گی۔

اگرچہ آدم و ابلیس کی سرگزشت بارہا قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے لیکن ہر موقع پر کچھ نئے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں پر پہلے آدم کے خدا سے عہد و پیمان کی بات ہو رہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے آدم سے پہلے عہد و پیمان لے لیا تھا لیکن وہ اُسے بھول گیا اور اپنے عہد و پیمان کا پابند نہ رہا (ولقد عهدنا الیٰ اٰدم من قبل فنسی ولم نجد له عزماً)۔

اس بارے میں کہ اس عہد سے کونسا عہد مراد ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ ممنوعہ درخت کے نزدیک نہ جانے کا خدا کا فرمان ہے۔ متعدد روایات بھی اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ انہیں بھی اسی معنی کے شاخ و برگ شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً خدا کا آدم کو اس خطرے کی خبر دینا کہ شیطان تمہارا سخت دشمن ہے، تم اس کی پیروی نہ کرنا۔

باقی رہا "نسیان" تو مسلم طور پر وہ مطلق فراموشی اور بھول جانے کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ مطلق فراموشی میں عتاب اور ملامت نہیں ہو سکتی بلکہ یا تو ترک کرنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد کی وفا نہ کی ہو، کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنے عہد کو بھول گیا ہے۔ یعنی تجھے یاد ہونا بھی فراموش کرنے والے کی طرح ہے یا یہ اُن فراموش کاریوں کے معنی میں ہے کہ جو توجہ کی کمی اور اصطلاح کے مطابق "ترکِ تحفظ" کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہاں "عزم" سے مراد مصمم اور محکم ارادہ ہے کہ جو انسان کی شیطان کے قولی وسوسوں کے مقابلے میں حفاظت کرتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ آدمؑ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ان سے صرف "ترکِ اولیٰ" سرزد ہوا یا دوسرے لفظوں میں آدمؑ کی جنت میں سکونت کا دور تکلیف (یا ذمہ داری یا مسئولیت) کا دور نہیں تھا۔ بلکہ یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہونے اور ذمہ داریوں کی جواب دہی کو قبول کرنے کا ایک تجرباتی دور تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس مقام پر خدا کی ممانعت اخلاقی پہلو کی حامل تھی کیونکہ اس سے فرمایا تھا کہ اگر ممنوعہ درخت سے کھاؤ گے تو حتماً بہت سی زحمت و تکلیف میں گرفتار ہو جاؤ گے (ان سب باتوں کی تفصیلات اور اسی طرح یہ بات کہ شجرۂ ممنوعہ سے کیا مراد تھی اور اس قسم کے دیگر مباحث چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کی آیہ ۱۹ تا ۲۲ کے ذیل میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں)

اس کے بعد اسی قصہ کے ایک دوسرے حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، ان سب نے تو سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، اُس نے انکار کر دیا (واذ قلنا للملائکة اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس ابیٰ)۔

اس سے آدم کا باعظمت مقام اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہ آدم کہ جو مسجودِ ملائکہ تھا اور پروردگار کی اس عظیم مخلوق کے لیے لائق احترام تھا ضمنی طور پر اُن سے ابلیس کی دشمنی پہلے ہی قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اُس نے عظمتِ آدم کے سامنے ہرگز سرِ تعظیم نہ جھکایا۔

اس میں شک نہیں کہ سجدہ، پرستش و عبادت کے معنی میں خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور خدا کے سوا کوئی شخص اور کوئی چیز بھی معبود نہیں ہو سکتی ہے۔ اس بناء پر فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے تھا، زیادہ سے زیادہ اس باعظمت وجود کی آفرینش کی خاطر سے کہ:



Marfat.com

شائستہ ستائش آں آفریدگاری است ٭ کارد چنیں دل آویز نقشی زماء و طینی !

وہ خالق ہی لائق تعریف ہے کہ جس نے پانی اور مٹی سے ایسا دل آویز نقش بنایا۔

یا یہاں سجدہ خضوع اور انکساری کے معنی میں ہے۔

٭ ٭ ٭

بہر حال ہم نے اس موقع پر آدم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور" ہم نے کہا اے آدم ! اس طرز عمل سے یہ تصدیق ہوگئی کہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ اس کا خیال رکھنا کہیں وہ تمہیں جنت سے باہر نہ نکال دے۔ جس سے تو رنج و تکلیف میں مبتلا ہو جائیگا:
( فقلنا یاادم ان هذا عدولك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقی )۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں جنت" دار آخرت کی بہشت جاوداں کے معنی میں نہیں ہے کہ جو ایک نقطۂ تکامل و ارتقا ہے اور اس سے باہر نکلنا اور وہاں سے بازگشت ممکن نہیں ہے۔ یہ جنت جس کا یہاں ذکر ہے ایک باغ تھا کہ جس میں اس دنیا کے باغوں کی سب چیزیں موجود تھیں اور پروردگار کے لطف و کرم سے اس میں کوئی تکلیف اور زحمت نہیں تھی۔ لہٰذا خدا آدم کو اس خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ اگر اس امن و امان کی جگہ سے تم باہر نکل گئے تو رنج و مشکل میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ " تشقی " شقاوت کے مادہ سے ہے اور شقاوت کے معانی میں سے ایک درد و رنج بھی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا روئے سخن پہلے دونوں یعنی آدم و حوا کی طرف کیوں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ :

فلا یخرجنكما من الجنة

شیطان تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے۔

لیکن باہر آنے کا نتیجہ مفرد کی صورت میں آدم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فتشقی

اے آدم ! تو درد و رنج میں جا پڑے گا۔

تعبیر کا یہ اختلاف ممکن ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے درجے میں درد و رنج آدم ہی کے حصہ میں آئے تھے۔ یہاں تک کہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ اپنی بیوی کی مشکلات بھی اپنے کندھے پر اٹھائیں اور مردوں کی ذمہ داری شروع دن سے اسی طرح سے چلی آرہی ہے۔

یا یہ بات ہے، کہ چونکہ شروع میں آدم سے ہی عہد و پیمان لیا گیا تھا، لہٰذا آخر میں بھی اُنہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد خدا، بہشت کے راحت و آرام اور اس سے باہر کے ماحول کے درد و رنج کی آدم کے لیے اس طرح تشریح کرتا ہے :

تو یہاں پر نہ تو بھوکا رہے گا، اور نہ ہی برہنہ ہوگا: ( ان لك الا تجوع فیها ولا تعری )۔

" نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی سورج کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی " ( وانك لا تظمؤا فیها ولا تضحی )۔

یہاں مفسرین کے لیے ایک سوال سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ پیاس کا حرارت آفتاب کے ساتھ اور بھوک کا برہنگی کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ عام طور پر پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ کرتے ہیں۔



Marfat.com

اِس سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ پیاس اور سورج کی دھوپ میں تعلق ناقابلِ انکار ہے۔ "تضحی" "ضحی" کے مادہ سے سورج کا بادل وغیرہ کے سائے کے بغیر چمکنا ہے۔

باقی رہا بھوک کا برہنگی کے ساتھ جمع ہونا، تو ممکن ہے، یہ اس وجہ سے ہو کہ بھوک بھی، غذا سے اندرونی برہنگی کی ایک قسم ہے، بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں ــ برہنگی اور گرسنگی ــ (عریانی اور بھوک) فقر و فاقہ کی دو خاص نشانیاں ہیں کہ جو عام طور پر ایک ہی ساتھ بیان کی جاتی ہیں: (بھوکے، ننگے) بہرحال اِن دونوں آیات میں انسان کی چار اصلی اور ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، پانی، لباس اور مکان (سورج سے بچاؤ کے لیے سائے) کی ضرورت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان ضروریات کا جنّت میں حاصل ہونا، نعمت کی فراوانی کی وجہ سے تھا درحقیقت ان امور کا ذکر ان باتوں کی ایک وضاحت ہے کہ جن کا بیان" فتشقیٰ " (تو زحمت اور مشقت میں پڑ جائے گا) کے جملے میں ہوا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود شیطان نے آدم کے خلاف عداوت اور دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اسی وجہ سے وہ آرام سے نہ بیٹھا۔ اُس نے آدم کو وسوسہ ڈالنا شروع کر دیا اور کہا: اے آدم! کیا میں تجھے عمر جاودانی کے درخت کا پتہ نہ دوں کہ جو شخص اس کا پھل کھائے گا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، کیا تو ہمیشہ کی حکومت وسلطنت تک پہنچنے کی راہ جاننا چاہتا ہے: (فوسوس الیہ الشیطان قال یاٰادم ھل ادلک علیٰ شجرۃ الخلد وملک لا یبلیٰ)۔

"وسوسہ" دراصل بہت ہی آہستہ اور دھیمی آواز کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ذہن میں بُرے مطالب اور بے بنیاد افکار پیدا ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ خواہ وہ (بُرے مطالب) انسان کے اندر سے خود بخود پیدا ہوں یا باہر سے کوئی ان کا عامل اور سبب بنے۔

حقیقت میں شیطان نے یہ اندازہ لگا لیا کہ آدم کا میلان کس چیز کی طرف ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ زندگی جاوداں اور بے زوال قدرت واقتدار تک پہنچنے کا خواہشمند ہے لہٰذا اُس نے انہیں پروردگار کی مخالفت کی طرف کھینچنے کے لیے اُنہی دونوں عوامل سے استفادہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح سے خدا نے آدم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم شیطان کو اپنے سے دُور رکھو گے تو ہمیشہ کے لیے اپنے رب کی نعمتوں سے بہرہ مند رہو گے، شیطان نے بھی اپنے وسوسوں میں اسی نکتے کو ملحوظ رکھا۔

ہاں شیاطین اپنے منصوبوں کی ابتداء انہی راستوں سے کرتے ہیں کہ جن سے راہِ حق کے رہبر کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ دقت نہیں گزرتا کہ اُسے انحراف کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں اور راہِ حق کی کوشش کو گمراہیوں تک پہنچنے کے لیے ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

آخر کار جو نہیں ہونا چاہیئے تھا، وہ ہو گیا۔ آدم وحوا دونوں نے ممنوعہ درخت سے کھا لیا اور اس کے ساتھ ہی بہشتی لباس ان کے بدنوں سے گر پڑے اور ان کے اعضاء آشکار ہو گئے: (فاکلا منھا فبدت لھما سواٰتھما)۔[۱]

جب آدم وحوا نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً جنّت کے درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے" (وطفقا یخصفان

---

[۱] "سواٰت" جمع ہے "سوئۃ" (بروزن "عورۃ") کی۔ یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو ناپسند ہو۔ لہٰذا کبھی مردہ جسم پر اور کبھی شرم گاہ کے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہاں یہی آخری معنی مراد ہے



Marfat.com

علیهما من ورق الجنة۔[1]

ہاں! آخر کار "آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی اور اس کی جزا اور انعام سے محروم ہوگیا" (وعصٰی اٰدم ربه فغوٰی)۔

"غوٰی" "غی" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو ایسے جاہلانہ کام کے معنی میں ہے کہ جس کا سرچشمہ عقیدہ ہو اور چونکہ حضرت آدمؑ نے یہاں شیطانی وسوسے سے پیدا ہونے والے وسوسے کی بنا پر عدم آگاہی سے اُس شجرۂ ممنوعہ سے کھالیا تھا۔ لہٰذا اُس کو "غوی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے "غوی" کو اس جہل و نادانی کے معنی میں لیا ہے کہ جو غفلت سے پیدا ہو، بعض نے محرومیت کے معنی میں اور بعض نے زندگی میں فساد پیدا ہونے کے معنی میں لیا ہے۔

بہرحال "غی" "رشد" کا نقطۂ مقابل ہے۔ رشد یہ ہے کہ انسان کسی ایسے راستے سے جائے کہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے لیکن "غی" یہ ہے کہ اپنے مقصود تک پہنچنے سے رہ جائے اور محروم رہ جائے۔

لیکن چونکہ آدم ذاتاً پاک اور مومن تھے اور رضائے خدا کی راہ میں قدم اُٹھاتے تھے اور یہ غلطی جو شیطانی وسوسہ کی وجہ ہوگئی۔ ایک استثنائی پہلو رکھتی تھی۔ لہٰذا خدا نے انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی رحمت سے دُور نہیں کیا بلکہ "اس واقعہ کے بعد اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ بنالیا اور اس کی توبہ قبول کرلی اور اسے ہدایت کی" (ثم اجتباه ربه فتاب علیه وهدٰی)۔

⁂

## کیا آدم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے؟

اگرچہ لفظ "عصیان" آج کے عرف میں گناہ کے معنی میں ہی بولا جاتا ہے لیکن لغت میں اطاعت و فرمان سے باہر ہو جانے کے معنی میں ہے (چاہے فرمان وجوبی ہو یا استحبابی) لہٰذا لفظ عصیان سے لازمی طور پر ترکِ واجب یا ارتکاب حرام کا معنی مراد نہیں ہے۔ بلکہ ایک مستحب کا ترک یا مکروہ کا ارتکاب بھی ہو سکتا ہے۔

اِس سے قطع نظر کرتے ہوئے "امر و نہی" کبھی ارشادی پہلو بھی رکھتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر کے اوامر و نواہی، جو بیمار کو حکم دیتا ہے کہ فلاں دوا کھاؤ اور فلاں غیر مناسب غذا سے پرہیز کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بیمار طبیب کے حکم کی مخالفت کرے گا تو صرف خود کو ہی نقصان پہنچائے گا۔ کیونکہ اُس نے طبیب کے ارشاد اور ہدایات کی پرواہ نہیں کی۔

خدا نے بھی آدم سے فرمایا تھا کہ ممنوعہ درخت کا پھل نہ کھانا کیونکہ اگر تم اُسے کھاؤ گے تو جنت سے باہر نکلنا پڑے گا اور زمین میں بے حد رنج و تکلیف میں جاکر گرفتار ہو جاؤ گے۔ اُنہوں نے اس امر ارشادی کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

یہ بات اِس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ آدم کے جنت میں ٹھہرنے کا زمانہ تجرباتی تھا، تکلیف اور ذمہ داری کا زمانہ نہیں تھا۔

اِس سے قطع نظر عصیان و گناہ کبھی مطلق پہلو رکھتے ہیں، یعنی سب کے لیے بغیر کسی استثنا کے گناہ ہوتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنا، ظلم کرنا،

---

[1] "یخصفان" "خصف" کے مادہ سے یہاں لباس سینے کے معنی میں ہے۔



Marfat.com

حرام مال کھانا اور کبھی وہ نسبتی پہلو رکھتے ہیں یعنی یہ ایسا کام ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس کی نسبت سے وہ ایک مطلوب اور شائستہ عمل ہوتا ہے لیکن اگر وہی کام کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو اس کے مرتبہ و مقام کا لحاظ کرتے ہوئے وہ غیر مناسب ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ہسپتال بنانے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے۔ ایک کاریگر آدمی اپنی ایک دن کی مزدوری کہ جو کبھی چند روپے سے زیادہ نہیں ہوتی دے دیتا ہے۔ یہ عمل اس کی نسبت سے ایثار اور اچھا عمل ہے، کامل طور پر مطلوب و پسندیدہ ہے لیکن اگر ایک دولت مند آدمی بھی اتنی ہی مقدار میں مدد کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل اُس کی طرف سے ناپسندیدہ ہے بلکہ ملامت و مذمت کے لائق ہے حالانکہ اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا ہے بلکہ ظاہراً ایک کارِ خیر میں مدد بھی کی ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ جسے ہم یوں کہتے ہیں:

حسنات الابرار سیئات المقربین

نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے گناہ ہیں۔

نیز یہ وہی چیز ہے کہ جو ترکِ اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہوئی ہے اور ہم اسے گناہِ نسبتی سے یاد کرتے ہیں کہ جو نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی مقامِ عصمت کے خلاف ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی کبھی کبھی مستحبات کی مخالفت پر معصیت کا اطلاق ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے روزانہ کی نافلہ نمازوں کے بارے میں فرمایا:

> "یہ سب مستحب ہیں واجب نہیں ہیں ..... اور جو شخص ان کو ترک کرے اُس نے معصیت کی کیونکہ مستحب ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس کام کو جاری رکھنا چاہیئے۔"

اس موضوع اور حضرت آدم سے مربوط دوسرے مسائل اور ان کے جنت سے باہر نکلنے کے بارے میں چھٹی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۹ سے لبعد اور جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۳۰ تا ۳۸ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں، یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۳۔ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ○

۱۲۴۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ○

۱۲۵۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ○



Marfat.com

۱۲۶۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○
۱۲۷۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ○

## ترجمہ

۱۲۳۔ (خدا نے) فرمایا: تم دونوں (اور اسی طرح شیطان) اس (باغ) سے نیچے اُترو۔ اس حالت میں کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو لیکن جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

۱۲۴۔ اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا۔ وہ تنگ زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے۔

۱۲۵۔ وہ کہے گا: پروردگارا: تُونے مجھے نابینا کیوں محشور کیا؛ میں تو بینا تھا۔

۱۲۶۔ (خدا) فرمائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ میری آیات تیرے پاس پہنچیں اور تُونے انہیں بُھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۱۲۷۔ اور جو شخص اسراف کرے گا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائے گا، ہم اُسے اسی قسم کی جزا دیں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔

## تفسیر

### تنگ زندگی:

آدمؑ کی توبہ اگرچہ قبول ہوگئی تھی مگر اُنہوں نے ایسا کام کیا تھا کہ اب پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا خدا نے "اُنہیں اور حوا کو حکم دیا کہ تم دونوں، اور اسی طرح شیطان بھی تمہارے ساتھ، جنّت سے زمین پر اُتر جاؤ (قال اھبطا منھا جمیعًا)۔

"درآنحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے" (بعضکم لبعض عدو)۔

لیکن میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ راہ سعادت اور نجات تمہارے سامنے کُھلی ہوئی ہے۔ "پس جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو تم میں سے جو کوئی اِس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بدبخت" (فاما یاتینکم منی ھدی



Marfat.com

فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقیٰ)۔

اور اس غرض سے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے فرمان کو بھلا دیتے ہیں، ان کی پریشانی کا نتیجہ بھی واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے: اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا وہ تنگ اور سخت زندگی بسر کرے گا: (ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا)۔

"اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے" (ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ)۔

وہاں وہ یہ "عرض کرے گا کہ پروردگارا! تو نے مجھے نابینا کیوں محشور کیا ہے جب کہ پہلے تو میں بینا تھا" (قال رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا)۔

خدا کی طرف سے اُسے فوراً یہ جواب دیا جائے گا: یہ اس بناء پر ہے کہ ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو تُو نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں ملحوظ نظر نہ رکھا۔ لہٰذا آج کے دن تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ (قال کذالک اتتک ایٰتنا فنسیتھا وکذالک الیوم تنسیٰ)۔

اور تیری آنکھیں پروردگار کی نعمتوں اور اُس کے مقامِ قرب کو نہ دیکھ پائیں گی۔

٭ ٭ ٭

اور آخر میں مجموعی نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیرِ بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اسراف کریں گے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم انہیں اسی قسم کی جزا دیں گے: (وکذالک نجزی من اسرف ولم یؤمن بایات ربہ)۔

"اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔"
(ولعذاب الاٰخرۃ اشد وابقیٰ)۔

٭ ٭ ٭

## چند اہم نکات:

**۱۔ یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج:** کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے زندگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اُسے بند دروازوں کا سامنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے بالکل برعکس وہ جدھر بھی جاتا ہے ہر طرف اپنے لیے دروازوں کو کھلا ہوا پاتا ہے، ہر کام کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں اور کوئی بندش اور کسی قسم کی گرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ یا اس حالت کو وسعتِ زندگی کہتے ہیں جب کہ پہلی حالت کو "ضیق" اور زندگی کی تنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "معیشت ضنک" کی تعبیر کہ جو اوپر والی آیت میں آئی ہے، اُس سے بھی یہی مراد ہے[1]

کبھی معیشت کی تنگی اس بناء پر نہیں ہوتی کہ اس کی آمدنی کم ہے، بسا اوقات اس کی آمدنی میں ریل پیل ہوتی ہے لیکن بُخل

[1] "ضنک" سختی اور تنگی کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مؤنث نہیں ہے۔



Marfat.com

حرص اور لالچ زندگی کو اس پر تنگ کر دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسا شخص اس بات پر مائل نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہے اور دوسرے اس کی زندگی سے فائدہ اُٹھائیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے بھی اسے کھلا نہیں رکھنا چاہتا۔

علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق:

"وہ اپنی زندگی تو فقیروں کی طرح سے بسر کرتا ہے لیکن اُس کا حساب سرمایہ داروں کا سا ہوگا۔"

واقعاً انسان ان تنگیوں اور سختیوں میں کیوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا اصلی عامل یادِ خدا سے رُوگردانی ہے۔ یادِ خدا رُوح کے لیے آرام و سکون اور تقویٰ و شہامت کا باعث ہے اور اس کو بُھلا دینا اضطراب، خوف اور پریشانی کا سبب ہے۔

جس وقت انسان خدا کو بُھلا دینے کی وجہ سے اپنی ذمّہ داریوں کو بُھلا دے تو وہ شہوات، خواہشات، حرص اور طمع میں غرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حصّہ میں تنگ زندگی ہی ہوگی۔ نہ اس میں کچھ قناعت ہوگی کہ جو اس کی رُوح کی تسکین کا موجب ہو نہ اُس کی معنویت کی طرف توجہ ہوگی کہ جو اُسے رُوحانی غنا اور تونگری عطا کر دے اور نہ ہی اس کا وہ اخلاق ہوگا کہ جو اُسے طغیان شہوات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے۔

اصولاً زندگی کی یہ تنگی زیادہ تر معنویات کی کمی اور رُوحانی استغنا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہ ہونا، موجودہ امکانات و وسائل کے نابود ہو جانے کا خوف اور مادی دُنیا کے ساتھ انتہائی وابستگی بھی اس کا سبب بنتی ہے اور وہ شخص کہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اُس نے اس کی پاک ذات کے ساتھ دل لگایا ہے، وہ ان تمام پریشانیوں سے امان میں ہوتا ہے۔

البتہ یہاں تک تو بات ایک فرد سے متعلق تھی لیکن جب ہم ایسے معاشرے میں جائیں کہ جو یادِ خدا سے منہ پھیرے ہوئے ہو تو پھر مسئلہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہو جائے گا۔ وہ معاشرے کہ جو تعجب خیز اور حیرت انگیز صنعتی ترقی کے باوجود اور زندگی کے تمام وسائل فراہم ہونے کے باوجود شدید اضطراب اور پریشانی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عجیب و غریب تنگی اور سختی میں گرفتار ہیں اور وہ اپنے آپ کو محبوس اور قیدی سمجھتے ہیں۔

سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ تمام روابط اور تعلقات ذاتی مفادات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ جنگ کے خوف سے اسلحہ سازی کا بھاری بوجھ ان کے زیادہ تر اقتصادی وسائل کو نگل گیا ہے اور ان کی کمریں اس بھاری بوجھ کے نیچے خم ہو گئی ہیں۔ قید خانے مجرموں سے بھرے پڑے ہیں ان کے اپنے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہر گھڑی اور ہر منٹ میں کئی قتل اور کئی ہولناک جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے نشہ آور چیزوں اور فحاشی نے انہیں اپنا غلام اور قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کے ماحول میں نہ نُورِ محبت ہے اور نہ ہی نشاط بخش پیار کا رشتہ۔

ہاں! یہ ہے ان کی سخت زندگی اور "معیشت ضنک"

امریکہ (شیطانِ اعظم) کے ایک سابق صدر نکسن نے اپنی پہلی صدارتی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ہم اپنے گرداگرد ایسی زندگیاں دیکھ رہے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہیں۔ ہم خود کو خوش



Marfat.com

رکھنے کی آرزو رکھتے ہیں، لیکن ہم ہرگز خوش نہیں ہوتے۔

انہی کے ایک اور مشہور آدمی نے کہ جس کا منصوبہ تھا معاشرے میں___سب کے لیے خوشی پیدا کی جائے۔ یہ کہا ہے کہ:

میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ انسانیت ایک تاریک کوچے میں دوڑ رہی ہے کہ جس کے آخر میں سوائے مطلق پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے[1]۔

یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ آیہ "من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

اس سے مراد ولایت امیرالمومنین علیہ السلام سے اعراض کرنا ہے[2]۔

ہاں علی علیہ السلام وہ عظیم انسان تھے کہ جن کی نظر میں تمام دنیا درخت کے ایک پتّے سے بھی کم قیمت ہے جو شخص اُن کی زندگی کو اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دے اور اس طرح سے خدا کے ساتھ دل لگالے کہ سارا جہان اس کی نظر میں حقیر ہو جائے وہ کوئی بھی ہو اس کی زندگی کشادہ اور وسیع ہوگی۔ لیکن جو لوگ اِن نمونوں کو بُھلا دیں وہ بہرحال تنگیٔ حیات میں گرفتار ہوں گے۔

بہت سی روایات میں زیرِ بحث آیت میں حق تعالیٰ کی یاد سے اعراض___ان لوگوں کے لیے کہ جو حج کرنے پر قادر ہیں۔ "ترکِ حج" سے تفسیر ہوا ہے۔ اور یہ اس بنا پر ہے کہ حج کے ہلا کر رکھ دینے والے مراسم۔ انسان کے خدا کے ساتھ نئے روابط اور تعلق پیدا کر دیتے ہیں اور یہی ارتباط اور تعلق اس کی زندگی کی راہوں کو کھولنے والا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مادیات سے زیادہ سے زیادہ دلبستگی تنگیٔ حیات کا سرچشمہ ہے۔

**۲۔ اندرونی اور بیرونی نابینائی:** اُن لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی یاد سے رُوگردانی کرتے ہیں، زیرِ بحث آیات میں دو سزائیں معین کی گئی ہیں۔ ایک اس جہان کی تنگیٔ حیات کہ جس کی طرف گزشتہ نکتے میں اشارہ ہوا ہے اور دوسری دوسرے جہان میں نابینائی اور اندھاپن۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ عالمِ آخرت عالمِ دنیا کی ایک پھیلی ہوئی اور وسیع مجسم صورت ہے اور اس دنیا کے تمام حقائق وہاں پر ایک متناسب شکل وصورت میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی رُوحانی آنکھیں (چشمِ بصیرت) اس عالم میں حقائق کو دیکھنے سے نابینا ہیں، اس جہان میں ان کے جسم کی آنکھیں بھی نابینا ہو جائیں گی۔ لہٰذا جس وقت وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو پہلے بینا تھے۔ اب نابینا کیوں محشور ہوئے ہیں تو انہیں یہ جواب ملے گا کہ یہ اس بنا پر ہے کہ تم نے خدا کی آیات کو بُھلا دیا تھا (اور یہ حالت اس حالت کا عکس العمل ہے)

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ قیامت میں تمام لوگ "بینا" ہوں گے اور اُن سے یہ کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ عمل پڑھو:

اقرأ کتابك ... (اسراء ۱۴)

---

[1] معمائے ہستی، صفحہ ۵ و صفحہ ۵۱

[2] نورالثقلین، جلد ۳ صفحہ ۴۰۵



Marfat.com

یا یہ کہ گنہگار جہنم کی آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے :

ورأى المجرمون النار ۔۔۔۔ (کہف ـ ۵۳)

یہ تعبیرات کچھ لوگوں کے نابینا ہونے کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض بزرگ مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس جہان کی وضع و کیفیت اُس جہان سے مختلف ہے کتنے ہی ایسے افراد ہیں کہ جو بعض امور کو تو دیکھ سکتے ہیں اور بعض دوسرے امور کے لیے نابینا ہیں۔ مرحوم طبرسی نے بعض مفسرین سے نقل کیا ہے :

" انهم اعمى عن جهات الخير لا يهتدى لشيئ منها "

وہ اُن چیزوں کے لیے کہ جو خیر و سعادت اور نعمت ہیں نابینا ہوں گے اور اُن چیزوں کے لیے کہ جو عذاب و شر اور حسرت و بدبختی کا سبب ہیں بینا ہوں گے۔

کیونکہ اُس جہان کا نظام اِس جہان کے نظام سے مختلف ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بعض منازل و مواقف میں تو نابینا ہوں گے اور بعض میں بینا ہو جائیں گے۔

ضمنی طور پر مجرمین کا دوسرے جہان میں فراموش کیا جانا یہ نہیں ہے کہ خدا انہیں بھول جائے گا بلکہ یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ان کے ساتھ فراموشی والا معاملہ کرنا ہے۔ جیساکہ ہماری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے بے اعتنائی کرے تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں کیوں بھلا دیا ہے ؟

۳۔ گناہ میں اسراف : یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیات میں یہ دردناک سزائیں اور عذاب ایسے افراد کے لیے ذکر ہوئے ہیں کہ جو اسراف کرتے ہیں اور خدا کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔

یہاں " اسراف " کے ساتھ تعبیر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں مثلاً آنکھ، کان، اور عقل کو غلط راستوں پر ڈال دیا ہے اور اسراف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان نعمت کو فضول اور بیہودہ طور پر برباد کرے۔

اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گنہگاروں کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ کے تو کچھ محدود گناہ ہیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف بھی ہے یعنی انہوں نے اپنے پروردگار سے اپنا رابطہ بالکل منقطع نہیں کر لیا۔

اگر فرض کریں ایک شخص کوئی ظلم و ستم کرتا ہے مگر کسی یتیم و بے سہارا پر نہیں اور خود کو قصوروار بھی سمجھتا ہے اور بارگاہِ خدا میں اپنے آپ کو رُو سیاہ جانتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی بھی گنہگار ہے اور سزا کا مستحق ہے لیکن یہ ایسے شخص سے بہت مختلف ہے کہ جو بے حساب گناہ کرتا ہے، جو گناہ کے لیے کسی حد اور شرط کا قائل نہیں ہے اور بعض اوقات گناہ انجام دینے پر فخر کرتا ہے یا گناہ کو چھوٹا سمجھتا ہے کیونکہ پہلا گروہ ممکن ہے کہ آخرکار توبہ اور تلافی کے لیے تیار ہو جائے لیکن جو لوگ گناہ کرنے میں اسراف کرتے ہیں وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے۔

۴۔ " ھبوط " کیا ہے ؟ " ھبوط " لغت میں قہراً نیچے کی طرف آنے کے معنی میں ہے، مثلاً پتھر کا بلندی سے



Marfat.com

گرنا - جس وقت یہ لفظ انسان کے بارے میں استعمال ہو تو سزا کے طور پر تنزل کی طرف راندہ درگاہ ہونے کے معنی دیتا ہے۔
اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آدم زمین پر ہی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور وہ جنت بھی اسی جہاں کا سرسبز و پر نعمت کوئی علاقہ تھا لہذا آدم کا ھبوط و نزول یہاں نزول مقامی کے معنی میں ہے نہ کہ نزول مکانی کے معنی میں۔
یعنی خدا نے ان کے مرتبہ و مقام کو ترکِ اولیٰ کی وجہ سے تنزل کیا اور اُن سب جنتی نعمتوں سے محروم کر دیا اور اس جہاں کے رنج و بلا میں گرفتار کر دیا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں مخاطب کرنے کے لیے تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ "اھبطا" یعنی تم دونوں نیچے اُتر جاؤ۔ ممکن ہے اس سے مراد آدم وحوا ہوں اور اگر بعض دوسری آیات میں "اھبطوا" جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان بھی اس خطاب میں شریک تھا کیونکہ وہ بھی بہشت سے راندہ گیا تھا۔
یہ احتمال بھی ہے کہ مخاطب آدم اور شیطان ہوں کیونکہ اس کے بعد کے جملے میں قرآن کہتا ہے: "بعضکم لبعض عدو" (تم میں سے بعض دوسرے بعض کے دشمن ہوگے)
بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "بعضکم لبعض عدو" سے مراد جو کہ جمع کی صورت میں خطاب ہے، یہ ہے کہ ایک طرف سے آدم و حوا اور دوسری طرف سے شیطان کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی یا ایک طرف سے آدم اور ان کی اولاد اور دوسری طرف سے شیطان اور اس کی ذریت کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی ہے۔
لیکن بہرحال "اما یأتینکم منی ھدی" (جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے) کے جملہ میں حتماً آدم و حوا کی اولاد ہی مخاطب ہے کیونکہ خدا کی ہدایت انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ باقی رہا شیطان اور اس کی ذریت تو چونکہ انہوں نے اپنا حساب کتاب خدائی ہدایت سے جدا کر لیا ہے۔ لہذا وہ اس خطاب میں شامل نہیں ہیں۔

٭ ٭ ٭

۱۲۸۔ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ۟

۱۲۹۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ۟

۱۳۰۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۟



Marfat.com

# ترجمہ

۱۲۸۔ کیا ان کی ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سے گزشتہ لوگوں کو (کہ جنہوں نے سرکشی اور فساد کیا تھا) ہلاک کردیا اور یہ ان کے (ویران شدہ) مکانوں میں آتے جاتے ہیں۔ ان میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح دلائل ہیں۔

۱۲۹۔ اور اگر تیرے پروردگار کی سنّت و تقدیر اور مقررہ زمانے کا لحاظ نہ ہوتا تو عذابِ الٰہی بہت جلد انہیں دامن گیر ہو جاتا۔

۱۳۰۔ اس بنا پر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور طلوعِ آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح اثنائے شب میں اور دن کے اطراف میں پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاؤ تاکہ تم خوش رہو۔

# تفسیر

## گزشتگان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو:

چونکہ گزشتہ آیات میں مجرمین کے بارے میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا پہلی زیرِ بحث آیت میں بیداری کے ایک بہترین اور موثر ترین طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

کیا ان کی ہدایت کے لیے یہی بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے بہت سی گزشتہ اقوام کو کہ جو گزشتہ زمانوں میں زندگی بسر کرتی تھیں ہلاک کر دیا۔ (افلم یھد لھم کم اھلکنا قبلھم من القرون)[1]

وہی لوگ کہ جو خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے اور "یہ ان کے ویران شدہ گھروں میں آتے جاتے ہیں":

(یمشون فی مساکنھم)۔

یہ اپنی آمد و رفت کے راستے میں (یمن کے سفر میں) قوم عاد کے گھروں سے (شام کے سفر میں) قوم ثمود کے مساکن سے اور (فلسطین کے سفر میں) قوم لوط کے زیر و زبر مکانوں سے گزرتے ہیں اور اُن کے آثار دیکھتے ہیں لیکن درسِ عبرت نہیں لیتے وہ ویرانیاں کہ جو اپنی زبان بے زبانی سے گزشتہ لوگوں کے دردناک قصے بیان کر رہی ہیں اور آج کے لوگوں اور آنے والے لوگوں کو ان ہلاکت میں پڑنے والی نافرمان قوموں کی پیروی سے روکتی ہیں اور ان کو خبردار کر رہی ہیں —— پکار پکار کر کہہ رہی ہیں اور ظلم و کفر و فساد کے انجام کو بیان کر رہی ہیں۔

ہاں، ہاں! "ان میں صاحبانِ عقل کے لیے واضح دلائل اور بے شمار نشانیاں موجود ہیں"۔ (ان فی ذٰلک لاٰیات لاولی النھٰی)[2]۔

---

[1] جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "قرون" جمع ہے "قرن" کی جو ایسے لوگوں کے معنی میں ہے کہ جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کریں اور کبھی خود زمانہ کو بھی قرن کہا جاتا ہے (مقارنۃ کے مادہ سے)۔

[2] "نھیٰ" مادہ "نھی" سے یہاں عقل کے معنی میں ہے کیونکہ عقل انسان کو برائیوں اور بدیوں سے منع کرتی ہے۔



Marfat.com

گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کا موضوع ان مسائل میں سے ایک ہے جو قرآن اور اسلامی احادیث میں بار بار آیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ ایک بیدار کرنے والا معلم ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو کسی بھی وعظ و نصیحت کی بات سے پند و نصیحت حاصل نہیں کرتے لیکن گزشتہ لوگوں کے آثار عبرت کے مناظر کا دکھنا انہیں ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے راستوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے:

" اغفل الناس من لم یتعظ بتغیر الدنیا من حال الی حال:

لوگوں میں سے سب سے زیادہ غافل وہ شخص ہے کہ جو دنیا کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے اور متغیر ہونے سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور رات اور دن کے بدلنے میں غور و فکر نہیں کرتا[1]

بعد والی آیت درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے کہ جو یہاں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پروگرام کو جو خدا نے گزشتہ زمانہ کے مجرمین کے لیے ترتیب دیا تھا، اس گروہ کے لیے کیوں ترتیب نہیں دیتا۔ قرآن کہتا ہے: اگر تیرے پروردگار کی سُنّت اور تقدیر اور مقرر زمانہ نہ ہوتا، تو عذاب الٰہی جلد ہی انہیں دامن گیر ہوجاتا: (ولولا کلمة سبقت من ربك لكان لزامًا واجل مسمًّى)۔

سُنّت الٰہی کہ جسے قرآن میں متعدد مواقع پر "کلمہ" کہا گیا ہے، یہ انسانوں کی آزادی کے بارے میں حکم فطرت اور فرمان آفرینش کی طرف ایک اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر ہر مجرم کو فوراً ہی اور بغیر کسی قسم کی مہلت دیئے سزا دے دی جائے، تو ایمان اور عمل صالح تقریباً اضطراری اور اجباری پہلو اختیار کرلیں گے اور زیادہ تر خوف اور سزا کی وحشت سے فوری طور پر انجام پا جائیں گے۔ اس بنا پر وہ حصول کمال اور ارتقاء کا ذریعہ ـــ کہ جو ان کا اصل مقصد ہے ـــ نہ ہوں گے۔

علاوہ ازیں اگر تمام مجرموں کو فوراً سزا دیئے جانے کا حکم ہو جائے تو پھر تو کوئی بھی روئے زمین پر زندہ نہ بچے گا:

ولو یؤاخذ الله الناس بظلمهم ما ترك عليها من دابّة (النحل-۶۱)

اس بنا پر ضروری ہے کہ کچھ مہلت ہو تا کہ گنہگار سوچ بچار کرلیں اور اصلاح کی راہ اختیار کریں اور راہِ حق کے تمام راہیوں کو خود سازی کے لیے کچھ مہلت بھی دے دی جائے۔

" اجل مسمی" کی تعبیر جیسا کہ قرآن کی کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے، انسان کی زندگی کے ختم ہونے کے حتمی اور یقینی وقت کی طرف اشارہ ہے۔[2]

بہرحال بے ایمان ستمگروں اور جسارت کرنے والے مجرموں کو عذاب الٰہی کی تاخیر سے مغرور نہیں ہونا چاہیئے اور اس حقیقت

---

[1] سفینۃ البحار (مادہ عبر) جلد ۲، ص ۱۴۶۔

[2] مزید وضاحت کے لیے پانچویں جلد سورہ انعام کی آیہ ۲ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔ ترکیب نحوی کے لحاظ سے "اجل مسمی" "کلمة" پر عطف ہے۔



Marfat.com

کو بے پرواہی کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہ لطف خدا ، یہ سنت الٰہی اور قانون تکامل و ارتقا ہے کہ جس نے میدان کو ان کے لیے کھلا رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اب جب کہ یہ بنا نہیں ہے کہ ان بدکاروں کو فوری طور پر سزا دی جائے۔ تو تم ان کی باتوں پر جو وہ تمہیں کہتے ہیں صبر سے کام لو: (فاصبر علی ما یقولون)

پیغمبر اکرمؐ کو روحانی طور پر تقویت پہنچانے اور ان کے دل کو تسلی دینے کے لیے انہیں خدا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے اور نماز و تسبیح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور اسی طرح رات کے درمیان اور دن کے اطراف میں اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاؤ تاکہ تم راضی اور خوشنود رہو اور تمہارا دل ان کی دکھ پہنچانے والی باتوں سے پریشان نہ ہو:

(وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن آناء الليل فسبح واطراف النهار لعلك ترضى)۔

اس میں شک نہیں کہ مشرکین کی بدگوئیوں اور ناروا باتوں پر صبر کرتے ہوئے یہ حمد و تسبیح شرک و بت پرستی کے خلاف ایک مظاہرہ ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ اس سے مراد مطلق حمد و تسبیح ہے یا یہ روزانہ کی مخصوص پنجگانہ نماز کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ظاہر عبادت کو اس کے اسی وسیع معنی میں رہنے دیا جائے اور اس سے مطلق تسبیح و حمد کا استفادہ کرنا چاہیئے جبکہ دوسرا گروہ اسے نماز پنجگانہ کی طرف اشارہ سمجھتا ہے، اس ترتیب سے کہ:

"قبل طلوع الشمس" نماز صبح کی طرف اشارہ ہے۔

اور "قبل غروبها" نماز عصر کی طرف اشارہ ہے (یا نماز ظہر و عصر کی طرف کہ جن کا وقت غروب تک باقی رہتا ہے)

"من آناء الليل" نماز مغرب و عشا کی طرف اشارہ ہے (اور اسی طرح نماز شب کی طرف بھی)

لیکن "اطراف النهار" کی تعبیر نماز ظہر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ "اطراف" "طرف" کی جمع ہے کہ جو جانب کے معنی میں ہے۔ اگر دن کو دو نصف حصوں میں تقسیم کریں تو نماز ظہر دوسرے نصف کی ایک جانب یا طرف قرار پاتی ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اطراف النهار" مستحبی نمازوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان دن کے مختلف اوقات میں انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ "اطراف النهار" یہاں پر "آناء الليل" کے مقابلہ میں ہے اور دن کے تمام اوقات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے (خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اطراف جمع کی شکل میں آیا ہے جب کہ دن میں دو سے زیادہ طرفیں نہیں ہوتیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ "اطراف" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں دن کی مختلف ساعتیں شامل ہیں)۔



Marfat.com

تیسرا احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ کچھ خاص اذکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسلامی روایات میں ان مخصوص اوقات کے لیے وارد ہوئے ہیں مثلاً : اُوپر والی آیت کی تفسیر میں، امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا :

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے دس دس مرتبہ یہ ذکر پڑھے :

لا اله الا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد يحيي ويميت وهو حي لا يموت بيده الخير وهو على كل شئ قدير .

لیکن بہرحال یہ تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ یہاں تسبیحات کی طرف بھی اشارہ ہو اور شب و روز کی واجب و مستحب نمازوں کی طرف بھی اشارہ ہو اور اس طرح سے وہ تضاد جو اس سلسلے میں روایات میں پایا جاتا ہے وہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ بعض روایات میں مخصوص اذکار کے ساتھ اور بعض میں نماز کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ " لعلك ترضٰى " کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی حمد و تسبیح نیز ان کی باتوں پر صبر و شکیبائی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ حمد و تسبیح اور شب و روز کی نمازیں انسان کے خدا کے ساتھ رشتہ اور تعلق کو اس طرح محکم کر دیتے ہیں کہ وہ اس کے علاوہ کسی چیز کی فکر اور خیال نہیں کرتا، سخت حادثات سے ہراساں نہیں ہوتا اور ایسی مضبوط پناہ گاہ کے ہوتے ہوئے دشمنوں سے خوف نہیں کھاتا اور اس طرح سے آرام و سکون اور اطمینان اس کی رُوح پر چھا جاتے ہیں ۔

اور " لعل " " شاید " کی تعبیر ممکن ہے کہ اُسی مطلب کی طرف اشارہ ہو کہ جو ہم پہلے بھی اس لفظ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ " لعل " عام طور پر ایسے حالات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جو نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں مثلاً : نماز اور ذکرِ خدا ایسی شرائط اور حالات میں اس قسم کے سکون و آرام کا سبب بنتا ہے کہ جو حضورِ قلب اور کامل آداب کے ساتھ انجام پائے ۔

ضمناً اگرچہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ حکم عمومی پہلو رکھتا ہے ۔

٭ ٭ ٭

۱۳۱۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝

۱۳۲۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ۝

۱۳۳۔ وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي



Marfat.com

الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ○

۱۳۴۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ
اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ○

۱۳۵۔ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ
السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ○ۧ

## ترجمہ

۱۳۱۔ وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ یہ دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں اور یہ اس لیے ہیں تاکہ ہم ان کے ذریعہ ان کی آزمائش کریں اور تیرے پروردگار کی روزی ہی بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

۱۳۲۔ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور تم بھی اس کی انجام دہی پر پابند رہو۔ ہم تم سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تمہیں روزی عطا کرتے ہیں اور اچھا انجام تو تقویٰ کے لیے ہے۔

۱۳۳۔ (اور انہوں نے یہ) کہا کہ پیغمبر ہمارے لیے اپنے پروردگار کا کوئی معجزہ یا نشانی لے کر کیوں نہیں آتا (تم اُن سے یہ کہہ دو کہ) کیا گزشتہ قوموں کی واضح خبریں کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں تھیں، اُن کے لیے نہیں آئیں۔

۱۳۴۔ اگر ہم انہیں اس (قرآن کے نزول) سے پہلے عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیتے (تو وہ قیامت میں) کہتے پروردگارا! تو نے ہمارے لیے کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی تیری آیات کی پیروی کرتے۔

۱۳۵۔ تم کہہ دو (ہم اور تم) سب ہی انتظار میں ہیں (ہم تو تم پر کامیابی اور فتح کے وعدہ کی انتظار میں ہیں اور تم ہم سے شکست کے انتظار میں ہو)۔ جب یہ بات ہے تو انتظار کرو لیکن تم جلدی ہی جان لوگے کہ صراطِ مستقیم پر کون ہے اور کون ہدایت یافتہ ہے۔

## تفسیر

ان آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو کئی احکام دیئے گئے ہیں کہ جن سے حقیقت میں عام مسلمان مراد ہیں اور یہ اُس بحث کی تکمیل ہے کہ جو صبر و شکیبائی کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں شروع ہوئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ مادی نعمتیں جو ہم نے کفار و مخالفین کے مختلف گروہوں کو دے رکھی ہیں، تم ہرگز ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر



Marfat.com

نہ دیکھنا۔ (ولا تمدن عینیك الیٰ ما متعنا به ازواجًا منهم)۔

ہاں "یہ ناپائیدار نعمتیں دنیاوی زندگی کے شگوفے ہیں" (زھرة الحیٰوة الدنیا)۔

ایسے شگوفے (اور پھول) کہ جو جلدی کھل جاتے ہیں اور (پھر) مرجھا جاتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین پر گر جاتے ہیں اور چند دنوں سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔

اس کے باوجود "یہ سب اس لیے ہیں تاکہ ہم انہیں ان کے ذریعہ آزمائیں" (لنفتنهم فیه)۔

اور بہرحال "جو کچھ تیرے پروردگار نے تجھے روزی دے رکھی ہے وہ زیادہ بہتر اور پائیدار ہے": (ورزق ربك خیر وابقیٰ)

خدا نے تجھے انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ایمان و اسلام۔ قرآن و آیاتِ الٰہی۔ حلال و پاکیزہ روزی، اور آخر میں آخرت کی جاوداں اور دائمی نعمتیں۔ یہ پائیدار اور جاودانی رزق ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی رُوح کو خوش کرنے اور ان کے دل کو تقویت پہنچانے کے لیے فرمایا گیا ہے: اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے انجام دینے کے لیے پابندی کرو (وأمر اهلك بالصلوٰة واصطبر علیها)۔

کیونکہ یہ نماز تیرے لیے اور تیرے خاندان کے لیے دل کی پاکیزگی اور صفائی اور رُوح کی تقویت اور یادِ خدا کے دوام کا سبب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "اھل" کا ظاہر یہاں پیغمبرِ اکرمؐ کا بطورِ کلی خاندان ہے لیکن چونکہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اُس وقت اھل کا مصداق خدیجہ اور علی علیہ السلام ہی تھے اور ممکن ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے کچھ اور نزدیکیوں کے بارے میں بھی ہو۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ خاندانِ پیغمبرؐ کا دامن بھی وسیع ہوگیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اگر نماز کا حکم تجھے اور تیرے خاندان کو دیا گیا ہے تو اس کے فائدے اور برکات بھی صرف تمہارے ہی لیے ہوں گے "ہم تجھ سے روزی نہیں چاہتے بلکہ ہم ہی تجھے روزی دیتے ہیں" (لا نسئلك رزقًا نحن نرزقك)۔

یہ نماز پروردگار کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ تم انسانوں کے لیے سرمایۂ تکامل و ارتقا اور تربیت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

یا دوسرے لفظوں میں خدا بادشاہوں اور امراء کی طرح نہیں ہے کہ جو اپنی قوم اور رعایا سے باج و خراج لیا کرتے تھے اور اپنی اور اپنے مصاحبین کی زندگی کا نظام چلاتے تھے۔ خدا سب سے بے نیاز ہے اور سب اُسی کے نیازمند اور محتاج ہیں۔

درحقیقت یہ تعبیر اُسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ ذاریات کی آیہ ۵۶ تا ۵۸ میں بیان ہوئی ہے:

وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون وما ارید منهم من رزق وما ارید ان یطعمون ان الله هو الرزاق ذو القوة المتین۔

میں نے جنّ و انس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے روزی کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ خدا ہی سب کو روزی دینے والا ہے اور مستحکم قدرت کا مالک ہے۔

اور اس طرح سے عبادات کا نتیجہ اور فائدہ براہ راست عبادت کرنے والوں کو ہی پہنچ جاتا ہے اور آیت کے آخر میں مزید



Marfat.com

فرمایا گیا ہے: عاقبت اور نیک انجام تو تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے ہی ہے ( والعاقبة للتقوىٰ)۔

جو چیز باقی رہنے والی ہے اور جس کا انجام مفید، تعمیری اور حیات بخش ہے، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہی ہے۔ پرہیزگار ہی آخر کار کامیاب ہوں گے اور غیر متقی لوگ شکست کھائیں گے۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مقصد عبادات میں رُوح تقویٰ اور اخلاص کے لیے تاکید کرنا ہو۔ کیونکہ عبادات کی بنیاد یہی ہے۔ سُورہ حج کی آیہ ۳۷ میں بیان ہوا ہے:

لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولٰكن يناله التقوىٰ منكم

قربانی کے جانوروں کے گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقویٰ اس تک پہنچتا ہے۔

تمہارے اعمال میں سے جو کچھ اُس کے مقام قرب میں جا پہنچتا ہے وہ ان کا چمڑا اور ظاہری وجود بھی نہیں ہے بلکہ وہ اخلاص و رُوح اور سوچ کہ جو اُس میں کار فرما ہے، وہی اس کے مقام قرب تک پہنچتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کفار کی ایک بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا: پیغمبر! اپنے پروردگار کے پاس سے ہماری من پسند کا کوئی معجزہ کیوں نہیں لاتا: ( وقالوا لولا يأتينا باٰية من ربّه)۔

فوراً ہی انہیں جواب دیا گیا ہے: کیا گزشتہ اقوام کی واضح خبریں کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں آئی تھیں، ان کے لیے نہیں آئیں ( کہ جو پے در پے معجزات پیش کرنے کے لیے تقاضے اور عذر تراشیاں کرتے تھے اور معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنے کفر و انکار پر باقی رہتے تھے اور خدا کا شدید عذاب انہیں آپکڑتا تھا۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر یہ بھی اُسی راہ پر چلیں گے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا) ( اولم تأتهم بينة ما فى الصحف الاولىٰ)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "بينة" سے مراد خود قرآن ہے کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اعلیٰ ترین معیار کے مطابق بیان کرنے والا ہے۔ زیر بحث آیت کہتی ہے: یہ معجزہ کیوں طلب کرتے ہیں اور بہانہ سازی کیوں کر رہے ہیں، کیا یہی قرآن، ان عظیم امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ کہ جو گزشتہ آسمانی کتابوں کے حقائق کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، ان کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے باوجود اس کے کہ کسی سے درس نہیں پڑھا تھا ایسی واضح، روشن اور آشکار کتاب لے کر آئے کہ آسمانی کتابوں کے متون میں جو کچھ تھا اُس کے ہم آہنگ ہے اور یہ بات خود اس کے اعجاز کی ایک نشانی ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی صفات اور ان کی کتاب، ان نشانیوں کے ساتھ کہ جو پہلی آسمانی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، کامل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور یہ اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔[1]

⁂ ⁂ ⁂

بہرحال یہ بہانہ سازی کرنے والے، حق طلب لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمیشہ نئی سے نئی بہانہ تراشی میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ

[1] پہلی تفسیر "مجمع البیان" میں اور دُوسری تفسیر "فی ظلال" میں اور تیسری تفسیر فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں بیان کی ہے۔ یہ تفاسیر اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، خصوصاً دوسری اور تیسری تفسیر میں۔



Marfat.com

"اگر ہم اس قرآن کے نزول اور پیغمبر اسلام کے آنے سے پہلے، انہیں سزا دے کر ہلاک کر دیتے، تو وہ یہ کہتے کہ پروردگارا! تُو نے ہمارے لیے کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل و رسوا ہو جائیں"؛ : (ولو انا اهلكناهم بعذاب من قبله لقالوا ربنا لولا ارسلت الينا رسولاً فنتبع اٰياتك من قبل ان نذل ونخزٰى)۔

لیکن اب جبکہ یہ عظیم پیغمبر ایسی باعظمت کتاب لے کر ان کے پاس آیا ہے تو ہر روز نئی سے نئی بات کرتے ہیں اور حق سے فرار کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے ہیں۔

انہیں خبردار کردو اور یہ "کہہ دو کہ ہم اور تم سب کے سب انتظار کر رہے ہیں": (قل كل متربص)، ہم تو تمہارے بارے میں خدائی وعدوں کے انتظار میں ہیں اور تم بھی اس انتظار میں ہو کہ مشکلات و مصائب ہمیں دامن گیر ہوں۔

"اب جب کہ یہ بات ہے تو انتظار کرو" (فتربصوا)۔

"لیکن تم بہت جلد جان لوگے کہ راہ مستقیم اور دین حق پر کون لوگ ہیں اور حق کی منزل اور خدا کی جاوداں نعمت کی طرف ہدایت پانے والے کون ہیں": (فستعلمون من اصحاب الصراط السوی ومن اهتدٰی)۔

اور اس قاطع اور پر معنیٰ جملے کے ساتھ قرآن ہٹ دھرم اور بہانہ ساز منکرین سے اپنی گفتگو کو ختم کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس زمانے میں پیغمبر اکرمؐ اور مسلمان دشمنوں کی طرف سے سخت دباؤ میں تھے، خدا اس سورہ کے آخر میں ان کی دلجوئی کرتا ہے؛ کبھی کہتا ہے کہ ان کا مال و دولت اِس جلدی گزر جانے والی دنیا کا سرمایہ اور ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے، یہ تمہاری آنکھوں کو اپنی طرف ــــ متوجہ نہ کرے۔

اور کبھی نماز اور صبر و استقامت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ان کی معنوی قوت کو دشمنوں کی کثرت کے مقابلے میں تقویت دے۔

اور آخر میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے کہ اگر یہ گروہ ایمان نہ لائیں گے تو ان کا انجام بہت تاریک ہوگا کہ جس کے انتظار میں انہیں رہنا چاہیئے۔

پروردگارا! ہمیں ہدایت یافتہ اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں میں سے قرار دے۔

خداوندا! ہمیں وہ قدرت اور رُعب عطا فرما کہ (جس سے) نہ تو ہم دشمنوں کی کثرت سے ڈریں اور نہ ہی سخت حوادث اور مشکلات سے ہراساں ہوں۔ ہٹ دھرمی اور بہانہ بازی کو ہم سے دُور رکھ اور ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

---

سورہ طٰہٰ کا اختتام
جمعرات ۲۰ جمادی الثانی (روزِ ولادت
باسعادت بانوئے اسلام فاطمہ زہرا
سلام اللہ علیہا)۔
سال ۱۴۰۲ھ قمری



Marfat.com

آغاز
پارہ ۱۷

# سورۃ انبیاء

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۱۱۲ آیات ہیں



Marfat.com

# سورہ انبیاء کی فضیلت

پیغمبر اسلامؐ سے اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں منقول ہے:

من قرء سورة الانبياء حاسبه الله حسابا يسيرا، وصافحه وسلم عليه كل نبي ذكر اسمه في القرآن.

جو شخص سورہ انبیاء کو پڑھے گا، خدا اس کے حساب کو آسان کر دے گا۔ (روز قیامت اس کے اعمال کا حساب لینے میں سخت گیری نہیں کرے گا) اور ہر وہ پیغمبر جس کا نام قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ اُس سے مصافحہ کرے گا اور ــــ اسے سلام کرے گا۔[1]

اور امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے:

من قرء سورة الانبياء حبا لها كان كمن رافق النبيين اجمعين في جنات النعيم، وكان مهيبا في اعين الناس حياة الدنيا.

جو شخص سورہ انبیاء کو عشق و محبت کے ساتھ پڑھے گا وہ جنت کے پُرنعمت باغوں میں تمام انبیاء کا رفیق اور ہم نشیں ہوگا اور دنیا کی زندگی میں بھی لوگوں کی نگاہ میں باوقار ہوگا۔[2]

لفظ "حبا لها" (اس سورہ سے عشق و محبت رکھتے ہوئے) درحقیقت ان روایات کے معنی کے سمجھنے کے لیے ایک کلید ہے کہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلتوں کے سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں یعنی صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی و مطالب سے محبت کرنا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ معنی و مفہوم سے محبت عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں فلاں سورہ کا عاشق ہوں اور اس کا عمل اس کے مفاہیم کے خلاف ہو تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کتاب عقیدہ و عمل ہے اور اس کا پڑھنا مقدمہ اور تمہید ہے سمجھنے کے لیے اور سمجھنا مقدمہ ہے ایمان و عمل کے لیے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۱۲۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۱۲۔



Marfat.com

# اس سورہ کے مضامین

۱۔ یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انبیاءؑ کی سورت ہے کیونکہ اس میں سولہ انبیاءؑ کے نام آئے ہیں بعض کے خاص خاص حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا صرف ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہیں: موسٰی، ہارون، ابراہیم، لوط، اسحٰق یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، اسمٰعیل، ادریس، ذاالکفل، ذاالنون (یونس) زکریا اور یحیٰی علیہم السلام۔

اس بنا پر اس سورہ کے اہم مباحث انبیاءؑ کے پروگراموں کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے انبیاءؑ بھی ہیں کہ جن کے نام اس سورہ میں صراحت کے ساتھ نہیں لیے گئے لیکن ان کے بارے میں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً پیغمبر اسلامؐ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام۔

۲۔ اس کے علاوہ مکی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ عقائد دینی خصوصاً مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں — اس سورہ میں بھی یہ بات پوری طرح موجود ہے۔

۳۔ اس سورہ میں خالق کی وحدت اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود اور پیدا کرنے والا نہیں ہے نیز عالم کی پیدائش، مقصد اور پروگرام کے مطابق ہونے اور اس جہان پر حاکم قوانین کی وحدت اور اسی طرح حیات و ہستی کے سرچشمہ کی وحدت نیز موجودات کی فنا اور موت کے پروگرام میں وحدت کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

۴۔ اس سورہ کے ایک حصہ میں حق کی باطل پر، توحید کی شرک پر، عدل و انصاف کے لشکر کی جنودِ ابلیس پر کامیابی و کامرانی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۵۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورہ غافل اور بے خبر لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے حساب و کتاب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام میں بھی اسی سلسلہ کی دوسری تنبیہیں ہیں۔

وہ انبیاءؑ کہ جن کے نام اس سورہ میں آئے ہیں ان میں سے بعض کی زندگی کا بیان اور ان کے تفصیلی پروگرام دوسری سورتوں میں ذکر ہوئے ہیں لیکن اس سورہ میں زیادہ تر انبیاءؑ کے حالات کے اس حصہ کا ذکر ہے کہ وہ جس وقت سخت قسم کی تنگی میں گرفتار ہوتے تھے تو وہ حق تعالیٰ کے دامنِ لطف کی طرف کس طرح سے دستِ توسل پھیلاتے تھے اور کس طرح سے خدا ان کے لیے بند دروازے کھول دیتا تھا اور طوفان و گرداب سے انہیں نجات بخشتا تھا۔

ابراہیمؑ جب نمرود کی آگ میں گرفتار ہوئے۔

یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

زکریاؑ نے جب اپنی عمر کے آفتاب کو غروب ہونے کے قریب دیکھا لیکن ان کا کوئی جانشین نہیں تھا کہ جو ان کے پروگراموں کی تکمیل کرے۔

اور اسی طرح باقی انبیاءؑ جب وہ سخت مشکلات میں گھرے۔



Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ

۲۔ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡہُ وَ ہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۙ

۳۔ لَاہِیَۃً قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ

۴۔ قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

۵۔ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ہُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ

## ترجمہ

مہربان بخشنے والے خدا کے نام سے

۱۔ لوگوں کا حساب کتاب ان کے نزدیک آچکا ہے لیکن وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

۲۔ جو کوئی بھی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آتی ہے وہ اسے کھیل سمجھتے ہیں اور مذاق اُڑانے کے انداز میں اُسے سنتے ہیں۔

۲۔ (حالت یہ ہے کہ) ان کے دل کھیل اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم چُپکے چُپکے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اس کے سوا کچھ اور بات ہے کہ یہ تم ہی جیسا ایک بشر ہے؟ کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟

۴۔ (لیکن پیغمبر نے) کہا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات جانتا ہے اور وہ (بڑا) سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۵۔ انہوں نے کہا (جو کچھ محمدؐ لایا ہے یہ وحی نہیں ہے بلکہ) یہ پریشان خواب و خیال ہیں بلکہ اُس نے دل سے جھوٹ گھڑ کے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا ہے) تو ہمارے لیے ایسا ہی ایک معجزہ لائے



Marfat.com

جیسے معجزے پہلے انبیاءؑ کو دے کر بھیجا گیا تھا۔

# تفسیر

## طرح طرح کے بہانے:

یہ سورہ ــ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ــ تمام لوگوں کے لیے ایک سخت تنبیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے' ایک ہلا دینے والی اور بیدار کن تنبیہ ــ فرمایا گیا ہے: لوگوں کا حساب ان کے قریب آپہنچا ہے، حالانکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور منہ موڑے ہوئے ہیں (اقترب للناس حسابهم وهم فی غفلة معرضون)۔

ان کا عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اِس غفلت اور بے خبری نے ان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے' ورنہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان حساب کے نزدیک ہونے پر ایمان رکھتا ہو ــ وہ بھی انتہائی دقیق حساب ــ اور پھر وہ تمام مسائل کو معمولی سمجھے اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہو۔

لفظ "اقترب" میں "قرب" کی نسبت کہیں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حساب بہت ہی نزدیک آگیا ہے۔

"ناس" کی تعبیر اگرچہ ظاہری طور پر عام لوگوں کے لیے آئی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سب کے سب غفلت میں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ جب بھی عمومی بات ہوگی تو اس میں استثنا بھی ہوگا۔ اور یہاں ایسے بیدار دل لوگوں کو کہ جو ہمیشہ حساب کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں' اس حکم سے مستثنٰی سمجھنا چاہیئے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حساب لوگوں کے نزدیک ہو رہا ہے، نہ کہ لوگ حساب کے۔ گویا حساب تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔

ضمنی طور پر "غفلت" اور "اعراض" کے درمیان فرق، ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حساب کے نزدیک ہونے سے غافل ہیں اور یہ غفلت اِس بات کا سبب بنتی ہے، کہ وہ حق کی آیات سے رُوگردانی کریں۔ درحقیقت "حساب سے غفلت" علت ہے اور "آیاتِ حق سے اعراض" اس کا معلول ہے یا اِس عظیم عدالت میں جواب دینے کے لیے آمادگی سے اور خود حساب سے اعراض ہے یعنی چونکہ غافل ہیں لہٰذا اپنے آپ کو حساب کے لیے آمادہ نہیں کرتے اور رُوگردانی کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب کا نزدیک ہونا اور قیامت کس معنی میں ہے؟

بعض نے کہا ہے کہ اِس سے مراد ہے کہ باقی ماندہ دنیا گزشتہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو اس بنا پر قیامت نزدیک ہو گی یعنی گزشتہ کی نسبت نزدیک خاص طور پر جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

بعثت انا والساعة کهاتين

میری بعثت اور قیامت اِن دونوں (انگلیوں) کی طرح ہے (شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو ایک



Marfat.com

دوسرے سے ملی ہوئی ہیں)۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تعبیر قیامت کے (حتمی طور پر واقع) ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کی مشہور ضرب المثل میں کہا جاتا ہے کہ:

## کل ما ھو اٰت قریب

جو چیز قطعی و یقینی طور پر آکر رہے گی، وہ قریب ہے۔

اس کے باوجود یہ دونوں تفسیریں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے دونوں نکات کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "حساب" "قیامتِ صغریٰ" یعنی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ موت کے وقت بھی کچھ نہ کچھ محاسبہ ہوتا ہے اور انسان کو اس کے اعمال کا کچھ بدلہ دیا جاتا ہے۔[2]

لیکن زیر بحث آیت ظاہراً قیامتِ کبریٰ کی طرف راجع نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت ان کے اعراض اور رُوگردانیوں کی ایک نشانی کو اس صورت میں بیان کرتی ہے: اُن کے رب کی جو بھی کوئی نئی نصیحت اور یاد دہانی ان کے پاس آتی ہے، وہ اُسے کھیل اور مذاق کے مُوڈ میں سنتے ہیں: ( ما یأتیھم من ذکر من ربھم محدث الا استمعوہ وھم یلعبون )۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سورہ یا آیت — اور پروردگار کی طرف سے کسی بھی بیدار کرنے والی بات پر سنجیدگی سے سوچیں اور کچھ دیر اس پر غور و فکر کریں اور کم از کم یہ احتمال ہی کرلیں کہ یہ بات ان کی زندگی اور مستقبل پر اثر کرنے والی ہوگی۔ وہ نہ تو خدا کی طرف سے حساب لیے جانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی تنبیہوں کی۔

اصولی طور پر جاہل، متکبر اور خود غرض لوگوں کی ایک بدبختی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خیر خواہی کرنے والوں کی پند و نصائح کا مذاق اُڑاتے ہیں اور یہی بات اس کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ہرگز خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوں جبکہ ایک مرتبہ بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں تو ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا راستہ اسی لمحے تبدیل ہو جائے۔

زیر غور آیت میں لفظ "ذکر" ہر بیدار کرنے والی بات کی طرف اشارہ ہے اور "محدث" (نیا اور جدید) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانی کتابیں یکے بعد دیگرے نازل ہوتی ہیں اور قرآنی سورتیں اور اس کی آیتیں، ہر ایک تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مفاہیم و مضامین لیے ہوئے ہوتی ہیں کہ جو مختلف اثرانگیز طریقوں سے غافلوں کو بیدار کرتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے کیا فائدہ کہ جو ان سب کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

گویا وہ نئی چیزوں سے وحشت رکھتے ہیں۔ وہ انہی قدیم خرافات پر کہ جو انہیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہیں، خوش ہیں، گویا انہوں نے ہمیشہ کے لیے یہ عہد کرلیا ہے کہ وہ ہر نئی حقیقت کی مخالفت کریں گے۔ جبکہ قانون ارتقا کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان کو ہر روز تازہ بہ تازہ اور نئے سے نئے مسائل کا سامنا ہو۔

---

[1] مجمع البیان آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۶، صفحہ ۴۳۱۳۔



Marfat.com

پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : وہ ایسی حالت میں ہیں کہ ان کے دل لہو ولعب اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں :
( لاہیۃ قلوبہم )۔
کیونکہ وہ تمام محکم اور سنجیدہ مسائل کو ظاہری لحاظ سے شوخی اور لہو ولعب سمجھتے ہیں ۔
( جیسا کہ لفظ " یلعبون " فعل مضارع اور مطلق صورت میں ، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے ) اور باطنی لحاظ سے غفلت میں ڈالنے والے فضول مسائل کے ساتھ لہو و لعب اور فکری مشغولیت میں پھنسے ہوئے ہیں ۔
اور یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ایسے افراد ہرگز راہ سعادت نہیں پاسکتے ۔
اس کے بعد ان کے شیطانی منصوبوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :
یہ ظالم سازش پر مبنی اپنی سرگوشیاں چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تم ہی جیسا ایک عام بشر ہے : ( واسروا النجوی الذین ظلموا ھل ھذا الا بشر مثلکم )۔[1]
جبکہ وہ ایک عام بشر سے زیادہ نہیں ہے ، تو لازماً اس کے یہ خارق عادت کام اور اس کی بات کی اثر پذیری جادو کے سوا کچھ نہیں " تو کیا تم جادو کے پیچھے جاتے ہو ، حالانکہ تم ( یہ سب کچھ ) دیکھ رہے ہو " ( افتأتون السحر وانتم تبصرون )۔
ہم بیان کرچکے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت دشمنان اسلام بہت طاقتور تھے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی باتوں کو چھپائیں ، یہاں تک کہ اپنی سرگوشیوں کو بھی ( اس بات پر توجہ رہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی سرگوشیوں کو مخفی رکھتے تھے )۔
ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ ان مسائل میں کہ جو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا پہلو رکھتے تھے ، مشورہ کرتے ہوں تاکہ عام لوگوں کے سامنے ایک ہی منصوبہ کے ماتحت پیغمبر اکرمؐ کا مقابلہ کریں ۔
علاوہ ازیں وہ قدرت و طاقت کے لحاظ سے تو مسلماً آگے تھے لیکن منطق اور نفوذ کلام کی قدرت کے لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو برتری حاصل تھی ۔ اور یہی برتری اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابلہ کے لیے جعلی باتیں گھڑتے مل بیٹھ کر خفیہ مشورے کرتے تھے ۔
بہ حال وہ اپنی اس گفتگو میں دو چیزوں کا سہارا لیتے تھے ۔ ایک رسول اللہؐ کا بشر ہونا اور دوسرے ان کی طرف جادو کی نسبت دینا ۔ اور بعد کی آیات میں جو اور چیزیں انہوں نے غلط منسوب کیں ان کا ذکر بھی آئے گا ۔ قرآن ان کا بھی جواب دیتا ہے ۔

٭ ٭ ٭

لیکن پہلے قرآن کلی صورت میں رسول اکرمؐ کی زبان سے اس طرح جواب دیتا ہے :
میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے چاہے وہ آسمان میں ہو یا زمین میں ( قال ربی یعلم القول فی السماء والارض )۔

---

[1] عربی ادب میں معمول ہے کہ اگر فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل مفرد لایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے ۔ بعض اوقات خاص علل و اسباب کی بنا پر فعل کو جمع کی شکل میں اور فاعل کو اسم ظاہر لاتے ہیں ۔ " واسروا النجوی الذین ظلموا " کا جملہ بھی اسی نوعیت کا ہے ۔



Marfat.com

یہ تصور نہ کرنا کہ تمہاری مخفی باتیں اور پوشیدہ سازشیں اُس پر مخفی ہیں، کیونکہ " وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے" (وھو السمیع العلیم)۔

وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام کاموں سے باخبر ہے۔ نہ صرف وہ باتوں کو سنتا ہے بلکہ وہ ان خیالات و تصورات کو بھی جو ان کے ذہنوں میں گزرتے ہیں اور ان ارادوں کو بھی کہ جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، جانتا ہے۔

٭ ٭ ٭

مخالفین کی بہانہ بازیوں کی دو قسموں کا بیان کرنے کے بعد ان بہانہ بازیوں کی دوسری چار قسموں کا ذکر شروع کرتے ہوئے قرآن اس طرح کہتا ہے: انہوں نے کہا کہ پیغمبر جو کچھ وحی کے عنوان سے لایا ہے، یہ پریشان خوابوں اور پراگندہ خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جنہیں وہ حقیقت اور واقعیت سمجھ بیٹھا ہے: (بل قالوا اضغاث احلام)[1]۔

اور کبھی اپنی اس بات کو بدل کر کہتے ہیں کہ: " وہ جھوٹا آدمی ہے اور اس نے خدا سے یہ باتیں جھوٹ منسوب کی ہیں (بل افتراہ)۔

اور کبھی کہتے ہیں کہ: " نہیں وہ تو ایک شاعر ہے" اور یہ باتیں اس کے شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہیں (بل ھو شاعر)۔

اور آخری مرحلہ میں کہتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں پھر بھی اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہے تو ہمارے لیے کوئی معجزہ لے کر آئے جیسا کہ گزشتہ انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے" (فلیأتنا بایۃ کما ارسل الاولون)۔

رسول اللہؐ کی طرف ان چیزوں کی نسبت، جو ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں، کا مطالعہ اور تحقیق خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد بہانہ جوئی اور حریف کو ہر قیمت اور ہر صورت میں میدان سے باہر نکالنا تھا۔

کبھی جادوگر کہتے، کبھی شاعر، کبھی مفتری اور کبھی (معاذاللہ) خیالی دنیا میں بسنے والا ایک شخص کہ جو اپنے خواب پریشاں کو وحی کہنے لگا ہے۔

اگر ہمارے پاس ان کی باتوں کو باطل کرنے کے لیے، ان کی اِدھر اُدھر کی ان منتشر باتوں کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تو ان کے باطل ہونے کے لیے یہی کافی تھیں لیکن بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں قاطع جواب دیتا ہے۔

## ایک نکتہ:

**کیا قرآن حادث ہے؟** بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لفظ " محدث " کی مناسبت سے کہ جو دوسری زیر بحث آیت میں ہے " کلام اللہ " کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے کہ

[1] " اضغاث ": جمع " ضغث " (بروزن " حرص ") خشک لکڑیوں یا گھاس وغیرہ کے گٹھے کے معنی میں ہے۔
" احلام " جمع ہے " حلم " کی (بروزن " نہم ") خواب اور رؤیا کے معنی میں اور چونکہ لکڑی وغیرہ کے گٹھوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بکھری ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے اُوپر رکھتے ہیں اس لیے اس تعبیر کا خوابِ پریشاں پر بھی اطلاق ہوا ہے۔



Marfat.com

جو خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں سالہا سال تک بحث و تنقید کا موضوع بنا رہا اور جس نے ایک طویل مدت تک بہت سے علما کو الجھائے رکھا۔

لیکن ہم موجودہ زمانہ میں اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بحث زیادہ تر سیاسی پہلو رکھتی تھی۔ حکمران چاہتے تھے کہ علمائے اسلام کو آپس میں الجھائے رکھیں اور اصولی اور بنیادی مسائل کہ جو وضع حکومت اور لوگوں کے طرز زندگی اور اسلام کے اصلی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں سے توجہ ہٹائے رکھیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے لیے یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ اگر "کلام اللہ" سے مراد اس کا معنی و مفہوم ہے، تو وہ قطعی طور پر قدیم ہے یعنی ہمیشہ وہ علم خدا تھا اور خدا کا علم ہمیشہ سے اس پر محیط ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ الفاظ اور یہ کلمات اور یہ وحی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی۔ تو وہ بلاشک وشبہ "حادث" ہے۔ کون عاقل یہ کہتا ہے کہ الفاظ و کلمات ازلی ہیں یا پیغمبر پر وحی کا نزول دور بعثت کے آغاز سے نہیں ہوا؟ لہذا آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہم بحث کو جس طرف سے بھی لیں مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن الفاظ بھی رکھتا ہے اور معانی بھی۔ اس کے الفاظ قطعاً و یقیناً "حادث" ہیں اور اس کے معانی قطعاً و یقیناً "قدیم" ہیں۔ لہذا کھینچا تانی اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر یہ بحث اسلامی معاشرے کی کونسی علمی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مشکل کو حل کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض گزشتہ علما نے مکار اور سازشی حکام اور بادشاہوں کی فریب کاریوں سے دھوکا کیوں کھایا۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آئمہ اہل بیتؑ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح اور عملی طور پر انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں سے پرہیز کریں۔[1]

۶۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ○

۷۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

۸۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ○

۹۔ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَ

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۱۲، بحوالہ احتجاج طبرسی



Marfat.com

اَهۡلَكۡنَا الۡمُسۡرِفِيۡنَ ○

۱۰۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ كِتٰبًا فِيۡهِ ذِكۡرُكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○

## ترجمہ

۶۔ تمام آبادیاں کہ جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا (انہوں نے بھی طرح طرح کے معجزات کا تقاضا کیا تھا اور ان کے مطالبات کے مطابق معجزات دکھا دیئے گئے تھے لیکن) وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟

۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) مرد ہی بھیجے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور نوعِ بشر میں سے تھے) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔

۸۔ ہم نے انہیں ایسے جسم نہ دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ عمرِ جاوداں رکھتے تھے۔

۹۔ اس کے بعد جو وعدہ ہم نے اُن سے کیا تھا اس کی ہم نے وفا کی۔ انہیں اور جس جس کو ہم چاہتے تھے (ان کے دشمنوں کے چنگل سے) نجات دی اور زیادتی کرنے والے کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

۱۰۔ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہارے لیے نصیحت (اور بیداری) کا وسیلہ موجود ہے۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

## تفسیر

### تمام پیغمبر نوعِ بشر میں سے تھے:

گزشتہ آیات میں دشمنانِ اسلام کی طرف سے ایسے چھ اعتراضات کا ذکر تھا کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ زیربحث آیات انہیں کا جواب دے رہی ہیں۔ ان میں کبھی کلی صورت میں اور کبھی کسی خاص مسئلے کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے۔

پہلی زیربحث آیت ان کے من پسند معجزات[1] طلب کرنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے: تمام شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، انہوں نے بھی اسی قسم کے معجزات کا تقاضا کیا تھا لیکن جب ان کے مطالبات پورے کر دیئے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے (ما اٰمنت قبلھم من قریۃ اھلکنا ھا افھم یؤمنون)۔

اس ضمن میں انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر اقتراحی معجزات کے سلسلے میں تمہارے تقاضے کو پورا کر دیا جائے اور پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ، تو تمہاری تباہی و نابودی حتمی و یقینی ہو جائے گی۔

---

[1] من پسند کے معجزات کو اصطلاح میں "اقتراحی معجزات" کہتے ہیں۔ ان معجزات کا تقاضا درحقیقت بہانہ سازی کے طور پر تھا۔



Marfat.com

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن اس آیت میں ان کے تمام ایسے اعتراضات کی طرف کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، اشارہ کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ : سچے پیغمبروں کی دعوت کے سلسلے میں اس طرح کی تکرار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہٹ دھرم اور ضدی افراد ہمیشہ ہی اسی قسم کے بہانوں کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آخر کار ان کا انجام بھی سوائے کفر کے اور اس کے بعد ان کی ہلاکت اور دردناک عذاب الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

۞　۞　۞

بعد والی آیت ان کے سب سے پہلے اعتراض کا خصوصیت سے جواب دے رہی ہے ، یہ اعتراض پیغمبر کے بشر ہونے کے سلسلے میں تھا۔ آیت کہتی ہے تو ہی نہیں کہ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے بلکہ تمام کے تمام پیغمبر جو تجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تو تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے ( وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیهم )۔

یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جسے سب لوگ جانتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں " اور اگر تم نہیں جانتے ، تو جو آگاہ ہیں اُن سے پوچھ لو " ( فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون )۔

۞　۞　۞

## اہل ذکر کون ہیں ؟

اس میں شک نہیں کہ " اہل ذکر " لغوی مفہوم کے لحاظ سے تمام آگاہ اور باخبر افراد کے لیے بولا جاتا ہے اور زیر نظر آیت " جاہل کے عالم کی طرف رجوع کرنے " کے ایک کلی عقلی قانون کو بیان کر رہی ہے۔ اگرچہ موقع کے لحاظ سے آیت کا مصداق علماء اہل کتاب ہی تھے ، لیکن یہ بات قانون کی کلیت میں مانع نہیں ہے۔

اسی بناء پر علماء اور فقہائے اسلام نے اس آیت سے " مجتہدین اسلام کی تقلید کرنے کے جواز کے " مسئلہ میں استدلال کیا ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن روایات میں ، کہ جو اہل بیتؑ کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں ، اہل ذکر کی علی علیہ السلام یا تمام آئمہ اہلبیتؑ سے تفسیر کی گئی ہے تو یہ منحصر ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس قانون کلی کے واضح ترین مصادیق کا بیان ہے۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے سورہ نحل کی آیہ ۴۳ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

۞　۞　۞

بعد والی آیت انبیاء کے بشر ہونے کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم نے پیغمبروں کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہرگز عمر جاوداں بھی نہیں رکھتے تھے۔ ( وما جعلناهم جسدًا لا یأكلون الطعام و ما كانوا خالدین )۔

" لا یأكلون الطعام " کا جملہ اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو قرآن میں دوسرے مقام پر اسی اعتراض کے سلسلے میں آئی ہے :

" وقالوا ما لهذا الرسول یأكل الطعام ویمشی فی الاسواق



Marfat.com

انہوں نے کہا یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے۔ (فرقان-۷)

"ماکانوا خالدین" کا جملہ بھی اسی معنی کی ایک تکمیل ہے۔ کیونکہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ بشر کی بجائے اگرچہ فرشتہ بھیجا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا فرشتہ جو عمر جاودانی رکھتا ہوتا اور اسے موت نہ آتی۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: گزشتہ انبیاء میں سے کوئی بھی عمر جاودانی نہیں رکھتا تھا کہ پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ بات کی جائے۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں کے رہبر کو انہیں کی نوع میں سے ہونا چاہیئے۔ ان ہی اغراض، احساسات، جذبات، احتیاجات اور علائق کے ساتھ تاکہ وہ ان کے درد اور تکالیف کو محسوس کرے۔ اور علاج کا بہترین طریقہ اپنی تعلیمات کے ذریعے پیش کرے تاکہ وہ تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور ایک اسوہ بنے اور سب پر حجت تمام کرے۔

٭　٭　٭

اس کے بعد سخت اور ہٹ دھرم منکرین کو تنبیہ اور خبردار کرنے کے عنوان سے قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم نے اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں دشمنوں کے چنگل سے رہائی بخشیں گے اور ان کے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ ہاں! "آخرکار ہم نے اپنے اس وعدہ کو پورا کیا اور ان کی صداقت کو آشکار کیا انہیں اور اُن تمام لوگوں کو کہ جنہیں ہم چاہتے تھے نجات دی اور زیادتی کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ (ثم صدقناهم الوعد فانجيناهم ومن نشاء واهلكنا المسرفين)۔

ہاں! جس طرح افرادِ بشر میں سے رہبرانِ بشر کو منتخب کرنا ہماری سنت تھی، یہ بھی ہماری سنت تھی ———— کہ ہم مخالفین کی سازشوں کے مقابلہ میں ان کی حمایت کریں اور اگر پے درپے پند و نصائح ان پر اثر انداز نہ ہوں تو صفحۂ زمین کو ان کے وجود کی گندگی سے پاک کر دیں۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "ومن نشاء" (اور جسے ہم چاہیں) سے مراد ایسا چاہنا ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے معیار پر پورا اُترے اور یہ بھی واضح ہے کہ "مسرفین" سے یہاں ایسے لوگ مراد ہیں کہ جنہوں نے اپنے بارے میں اور اس معاشرے کے بارے میں کہ جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، اسراف کیا ہے، آیاتِ خداوندی کا انکار کرکے اور پیغمبروں کو جھٹلا کر۔

اس لیے قرآن میں ایک دوسری جگہ پر بیان ہوا ہے کہ:

كذالك حقًا علينا ننجي المؤمنين

اسی طرح سے ہم پر حق اور ضروری تھا کہ ہم مومنین کو نجات دیں۔ (یونس- ۱۰۳)

آخری زیر بحث آیت میں ایک مختصر اور پُرمعنی جملے میں مشرکین کے اکثر اعتراضات کا نئے سرے سے جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہاری بیداری کا وسیلہ موجود ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے: (ولقد انزلنا اليكم كتابا فيه ذكركم افلا تعقلون)۔

جو شخص اس کتاب کی آیات کا مطالعہ کرے کہ جو معاشرے کے لیے تذکر اور دل کی بیداری اور فکر و نظر کے تحرک اور پاکیزگی کا موجب ہیں، تو وہ اچھی طرح سے جان لے گا کہ یہ ایک واضح اور جاودانی معجزہ ہے۔ اس آشکار معجزے کے ہوتے ہوئے کہ جس میں مختلف جہات سے اعجاز کے آثار نمایاں ہیں۔ (انتہائی زیادہ قوتِ جاذبہ کی جہت سے، مضامین کی جہت سے، احکام و قوانین



Marfat.com

کی جہت سے اور عقائد و معارف وغیرہ کی جہت سے) کیا پھر بھی کسی دوسرے معجزے کی انتظار میں ہو؟ اس سے بہتر اور کونسا معجزہ پیغمبر اسلام کی دعوت کی حقانیت کو ثابت کر سکتا ہے؟

---

اس سے قطع نظر، اس کتاب کی آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ جادو نہیں ہے، حقیقت و واقعیت ہے اور اس کی تعلیمات جاذب و پر معنی ہیں۔ کیا پھر بھی یہی کہتے ہو کہ یہ جادو ہے؟

کیا ان آیات کی طرف "اضغاث احلام" کی نسبت دی جا سکتی ہے؟ بے معنی اور پریشان خواب کہاں اور یہ موزوں اور ایک دوسرے سے مربوط باتیں کہاں؟

کیا اسے جھوٹ اور افترا شمار کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ سچائی کے آثار اس کے ہر مقام سے نمایاں ہیں۔

اور کیا اسے لانے والا شاعر ہو سکتا ہے جبکہ شعر تخیل کے محور کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس کتاب کی تمام آیات حقیقتوں پر مبنی ہیں مختصر یہ کہ اس کتاب میں غور و فکر کرنے اور اس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ نسبتیں کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں ایسے پیوند ہیں کہ جو ہم رنگ نہیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں کہ جو احمقانہ ہیں۔

یہ بات کہ زیر بحث آیت میں "ذکرکم" کس معنی میں ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے بیانات مختلف ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات تمہارے لیے نصیحت اور افکار و اذہان کی بیداری کا سبب ہیں جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

فذکر بالقرآن من یخاف وعید

اس قرآن کے ذریعے اُن لوگوں کو کہ جو خدائی عذاب اور سزا سے ڈرتے ہیں نصیحت کرو اور یاد دہانی کراؤ۔ (ق - ۴۵)

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے نام اور شہرت کو دنیا میں بلند کرے گا یعنی یہ تمہاری عزت و شرف کا باعث ہے، تم مومنین و مسلمین کی یا تم قوم عرب کی کیونکہ قرآن تمہاری زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور اگر یہ تم سے لے لیا جائے تو تمہارا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرآن میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں کہ جو تمہارے دین و دنیا کے لیے ضروری ہیں اور یا مکارم اخلاق کے سلسلہ میں جن کے تم محتاج ہو، ان سب کے لیے یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

اگرچہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب کی سب "ذکرکم" کی تفسیر میں جمع ہوں تاہم پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآن بیداری کا سبب کس طرح ہے جبکہ بہت سے مشرکین نے اُسے سنا لیکن وہ بیدار نہیں ہوئے، تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ قرآن کا بیدار کرنے والا ہونا، جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کی شرط یہ ہے کہ انسان خود



Marfat.com

چاہتا ہو اور وہ اپنے دل کے دریچے اس کے سامنے کھول دے۔

۱۱۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○
۱۲۔ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ○
۱۳۔ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ○
۱۴۔ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ○
۱۵۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ○

## ترجمہ

۱۱۔ ہم نے کتنی ہی ایسی بستیوں کو کہ جو ظالم تھیں درہم برہم کر دیا اور ان کے بعد ہم ایک دوسری قوم کو لے آئے۔
۱۲۔ انہوں نے جس وقت ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو انہوں نے اچانک راہِ فرار اختیار کی۔
۱۳۔ فرار نہ کرو اور اپنی ناز و نعمت سے پُر زندگی کی طرف لوٹ آؤ اور اپنے خوبصورت گھروں میں (آجاؤ) تاکہ سائل آئیں اور تم سے سوال کریں۔ (اور تم ان کو محروم کر کے پلٹا دو)
۱۴۔ انہوں نے کہا کہ ہائے افسوس ہم پر کہ ہم ظالم و ستمگر تھے۔
۱۵۔ وہ اسی طرح سے اپنی ان باتوں کو دُہرا رہے تھے، یہاں تک کہ ہم نے انہیں جڑ سے کاٹ کر خاموش کر دیا۔



Marfat.com

# تفسیر

## ظالم عذاب کے چنگل میں کیسے گرفتار ہوئے ؟

زیر بحث آیات میں ان باتوں کے بعد کہ جو ہٹ دھرم مشرکین اور کفار کے بارے میں گزریں، قرآن گزشتہ قوموں کے انجام کے ساتھ ان کے انجام کا موازنہ کرکے واضح کرتا ہے :

پہلے کہتا ہے : کتنی ظالم اور ستمگر آبادیاں ایسی تھیں کہ جنہیں ہم نے تہ و بالا کردیا ( وکم قصمنا من قریۃ کانت ظالمۃ )۔

" اور ان کے بعد ایک دوسری قوم کو میدانِ آزمائش میں لے آئے " ( وانشأنا بعدھا قوماً اٰخرین )۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " قصم " شدت کے ساتھ توڑنے کے معنی میں ہے ، یہاں تک کہ بعض اوقات کوٹنے کے معنی میں آتا ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان قوموں کے ظالم ہونے کا ذکر ہے ، اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ خدا ظالم و ستمگر قوموں کے بارے میں شدید ترین انتقام اور سزا و عذاب کا قائل ہے ۔

ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تم گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تم جان لوگے کہ پیغمبرِ اسلام کی تہدیدیں بے بنیاد اور مذاق نہیں ہیں بلکہ وہ ایک تلخ حقیقت ہیں کہ جس کے بارے میں تمہیں خوب غور و فکر کرنا چاہیئے ۔

٭ ٭ ٭

اب ان کے حالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جب کہ عذاب ان کی آبادیوں کو آلیتا تھا ۔ خدائی عذاب کے مقابلہ میں ان کی بیچارگی واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ خدا کا عذاب انہیں دامن گیر ہو کے رہے گا تو انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی : ( فلما احسوا بأسنا اذا ھم منھا یرکضون )[1]

ٹھیک ایک شکست خوردہ لشکر کی مانند کہ جو دشمن کی برہنہ شمشیروں کو اپنی پشت پر دیکھ کر ادھر اُدھر بھاگ کھڑا ہو ۔

٭ ٭ ٭

لیکن سرزنش کے عنوان سے انہیں کہا جائے گا : بھاگو نہیں ! اور اپنی ناز و نعمت سے پُر زندگی اور زر و جواہر سے بھرے ہوئے مکانوں ، محلوں ، بنگلوں کی طرف پلٹ آؤ ، شاید سائل آئیں اور تم سے سوال کریں : ( لا ترکضوا وارجعوا الی ما اترفتم فیہ ومساکنکم لعلکم تسئلون )۔

یہ عبارت ، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمیشہ ان کی پُر ناز و نعمت زندگی میں سائل اور خیرات مانگنے والے ان کے

---

[1] " رکض " کا معنی تیزی سے دوڑنا بھی ہے اور سواری کو دوڑانا بھی ہے اور کبھی زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں بھی آتا ہے :

ارکض برجلك ھذا مغتسل بارد و شراب

اے ایوب ! تم اپنا پاؤں زمین پر مارو ( تو ایک چشمہ پھوٹ نکلے گا ) کہ جو نہانے کے لیے بھی ہے اور پینے کیلئے بھی ( ص - ۴۲)



Marfat.com

گھروں کے دروازوں پر اُمید لے کر آتے تھے اور محروم ہو کر پلٹ جاتے تھے ۔ انہیں کہا گیا ہے کہ " پلٹ جاؤ اور انہیں نفرت انگیز مناظر کو پھر دہراؤ "۔

یہ حقیقت میں ایک قسم کا استہزاء اور سرزنش ہے ۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ " لعلکم تسئلون " ان کے جاہ و جلال کے دربار کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خود ایک گوشہ میں بیٹھے رہتے اور مسلسل فرمان جاری کرتے، اور خدمت گار پے در پے ان کے پاس آتے، اور پوچھتے کہ حضور کا کیا حکم ہے ؟

باقی رہا یہ کہ اِس بات کا کہنے والا کون ہے ؟ تو یہ بات آیت میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی ۔

ممکن ہے کہ یہ ندا خدا کے فرشتوں یا انبیاء یا ان کے قاصدوں کی ہو یا خود اُنہی کے ضمیر اور وجدان کی آواز ہو ۔

حقیقت میں یہ خدا کی ندا ہی تھی کہ جو انہیں سنائی دے رہی تھی کہ : بھاگو نہیں ! پلٹ آؤ ! کہ جو ان تینوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے ان تک پہنچ رہی تھی ۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ تمام مادّی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیت کے ساتھ " مسکن " کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ شاید یہ اس بناء پر ہو کہ انسان کے آرام و سکون کا پہلا وسیلہ ایک مناسب جائے سکونت کا ہونا ہے ۔ اور یا یہ بات ہے کہ انسان عام طور پر اپنی زندگی کی بیشتر آمدنی اپنے مکان پر صرف کرتا ہے اور اس کا زیادہ تر لگاؤ بھی اُسی سے ہوتا ہے ۔

❊ ❊ ❊

بہر حال وہ اُس وقت بیدار ہوں گے اور جس چیز کو وہ پہلے مذاق سمجھتے تھے اُسے سنجیدہ ترین صورت میں اپنے سامنے دیکھیں گے اور وہ چیخ اُٹھیں گے " اور کہیں گے وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم و ستمگر تھے " ( قالوا یا ویلنا انا کنا ظالمین ) ۔

لیکن یہ اضطراری بیداری کہ جو عذاب کے حقیقی مناظر کے سامنے ہر شخص میں پیدا ہو جاتی ہے بے قدر و قیمت ہے اور اس سے ان کا انجام بدل نہیں سکتا لہذا قرآن آخری زیر بحث آیت میں اضافہ کرتا ہے :

اور وہ اس طرح اِس بات کا کہ " وائے ہو ہم پر کہ ہم ظالم تھے " تکرار کر رہے تھے کہ ہم نے ان کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں خاموش کر دیا ( فما زالت تلك دعوٰهم حتّٰى جعلناهم حصيدًا خامدين ) ۔

کٹی ہوئی کھیتوں ( حصید ) کی طرح زمین پر گریں گے اور ان کا آباد اور جوش و خروش سے پُر شہر، ویران قبرستان اور خاموشی میں بدل جائے گا " ( خامدین )[1]

[1] " خامد " اصل میں " خمود " کے مادہ سے ( " جنود " کے وزن پر ) آگ بجھ جانے کے معنی میں ہے ۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر اُس چیز پر بولا جانے لگا کہ جس کا جوش و خروش ختم ہو جائے ۔



Marfat.com

۱۶۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○

۱۷۔ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○

۱۸۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○

# ترجمہ

۱۶۔ ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

۱۷۔ بفرضِ محال اگر ہم چاہتے بھی کہ کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو اپنے شایانِ شان کسی چیز کا انتخاب کرتے۔

۱۸۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تاکہ اُسے ہلاک کردیں اور اس طرح باطل نابود ہوجاتا ہے لیکن تم پر وائے ہو اس توصیف پر کہ جو تم کرتے ہو۔

# تفسیر

## آسمان و زمین کی خلقت کھیل نہیں ہے:

چونکہ گزشتہ آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی تھی کہ ظالم بے ایمان اپنی خلقت کے بارے میں سوائے عیش و عشرت کے کسی مقصد کے قائل نہیں تھے اور حقیقتاً اس جہان کو بے مقصد خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید زیرِ بحث آیات میں، اس طرزِ فکر کو باطل قرار دینے اور پوری کائنات خصوصاً انسانوں کی خلقت کے لیے گراں قدر مقصد ہونے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اُسے فضول اور بے ہودہ پیدا نہیں کیا ہے: (وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما لٰعبین)۔

یہ پھیلی ہوئی زمین، یہ وسیع آسمان اور ان میں موجود یہ قسم قسم کی موجودات، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کوئی اہم مقصد پیش نظر تھا۔

ہاں! مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اُس عظیم پیدا کرنے والے کے وجود کا ثبوت بنیں اور دوسری طرف سے "معاد" کے لیے دلیل بنیں ورنہ یہ سب شور و غل چند دن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان کسی بیابان کے وسط میں تمام وسائل سے آراستہ و پیراستہ ایک محل بنائے، صرف اس غرض سے



Marfat.com

کہ تمام عمر میں جو ایک گھنٹہ کے لیے وہاں سے گزرے گا، تو اس میں آرام کرے گا۔

مختصر یہ ہے کہ اگر ہم اس باعظمت جہان کو بے ایمان لوگوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ فضول اور بے مقصد ہے۔ صرف مبداء و معاد پر ایمان ہی ہے کہ جو اسے بامقصد بناتا ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد کی آیت کہتی ہے کہ اب جبکہ یہ بات مسلم ہوگئی کہ عالم بے مقصد نہیں ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ اس خلقت کا مقصد خدا کا خلقت کے کام میں سرگرم اور مشغول رہنا نہیں ہے کیونکہ ایسی سرگرمی اور مشغولیت غیر معقول ہے" بفرض محال اگر ہم چاہتے کہ اپنے لیے کوئی سرگرمی ڈھونڈیں، تو ایسی چیز کا انتخاب کرتے کہ جو ہمارے لیے مناسب ہوتی" (لو اردنا ان نتخذ لهوًا لاتخذ ناه من لدنا ان كنا فاعلين)۔

حقیقت میں لفظ "لعب" بے مقصد کام کے معنی میں ہے اور "لھو" نامعقول مقاصد اور سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔

زیر بحث آیت دو حقائق کو بیان کرتی ہے۔ اوّل تو لفظ "لو" کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو لغت عرب میں امتناع کے لیے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امر محال ہے کہ پروردگار کا مقصد اپنے آپ کو مشغول رکھنا ہو۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: فرض کریں کہ اگر مقصد مشغول رہنا ہو، تو یہ سرگرمی اس کی ذات کے شایان شان ہونا چاہیے عالم مجردات اور اسی قسم کی چیزوں میں سے، نہ کہ اس عالم سے کہ جو مادہ میں محدود ہے۔[1]

اس کے بعد قطعی اور دو ٹوک الفاظ میں اُن احمقوں کے اوہام کو باطل کرنے کے لیے کہ جو دُنیا کو بے مقصد یا صرف مشغول اور سرگرم رہنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، قرآن اِس طرح کہتا ہے: یہ جہان ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جو حقیقت و واقعیت ہے، یہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنیاد باطل پر ہو بلکہ ہم حق کو باطل کے سر پر دے پٹکیں گے تاکہ اسے نابود اور ہلاک کردے اور باطل محو و نابود ہوجائے: (بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق)۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن تم پر وائے ہو، اس توصیف پر، کہ جو تم عالم کے بے مقصد ہونے کے بارے میں کرتے ہو (ولكم الويل مما تصفون)۔

یعنی ہم ہمیشہ بے ہودگی کی طرف مائل لوگوں کے خیالات و اوھام کے مقابلے میں عقلی دلائل، واضح استدلالات اور اپنے آشکار معجزات پیش کرتے ہیں تاکہ غور و فکر کرنے والوں اور صاحبان عقل کی نظروں میں، یہ خیالات و اوہام درہم برہم ہوجائیں۔ خدا کی معرفت کے دلائل روشن ہیں۔ معاد کے برپا ہونے کے دلائل آشکار ہیں۔ انبیاء کی حقانیت کے براہین واضح ہیں۔

---

[1] کچھ مفسرین نے زیر نظر آیات کو عیسائیوں کے عقائد کی نفی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، یعنی لھو کو بیوی اور بیٹے کے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت ان کے جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ بیٹا اور بیوی کا انتخاب کرتے، تو نوع انسانی میں سے انتخاب نہ کرتے۔

لیکن یہ تفسیر کئی جہت سے مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیر بحث آیات کا ربط گزشتہ آیات سے منقطع ہوجائے گا اور دوسرا یہ کہ "لھو" خصوصاً جب "لعب" کے بعد قرار پائے تو سرگرمی اور مشغولیت کے معنی میں ہوتا ہے، نہ کہ بیوی بیٹے کے معنی میں۔



Marfat.com

اور درحقیقت ان لوگوں کے لیے کہ جو ہٹ دھرم اور بہانہ باز نہیں ہیں۔ حق باطل سے کامل طور پر الگ اور نمایاں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ " نقذف " " قذف " کے مادہ سے پھینکنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً دُور سے پھینکنا اور چونکہ دُور سے پھینکنا، تیزی، سرعت اور زیادہ قوت رکھتا ہے، یہ تعبیر حق کی باطل پر کامیابی کی قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لفظ " علیٰ " بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے کیونکہ عام طور پر یہ لفظ " علو " اور بلندی کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔

" یدمغہ " کا جملہ، راغب کے قول کے مطابق کھوپڑی کو توڑنے کے معنی میں ہے، جو کہ انسانی بدن کا حساس ترین مقام شمار ہوتا ہے۔ یہ لشکرِ حق کے غالب ہونے کی ایک عمدہ تعبیر ہے۔ آنکھوں سے دکھائی دینے والا قطعی اور ظاہر بظاہر غلبہ۔

" اذا " کی تعبیر یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ایسی جگہ بھی کہ جہاں یہ توقع ہی نہ ہو کہ حق کامیاب ہوگا، وہاں ہم ایسا انجام دیتے ہیں۔

" زاھق " کی تعبیر اُس چیز کے معنی میں ہے کہ جو کُلی طور پر مضمحل ہو جائے نیز اس مقصد کے لیے یہ بھی ایک تاکید ہے۔

اور یہ بات کہ " نقذف " اور " یدمغ " کے الفاظ فعل مضارع کی شکل میں کیوں آئے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ اس عمل کے استمرار، تسلسل اور ہمیشگی کی دلیل ہے۔

❁ ❁ ❁

## ایک نکتہ :

**مقصدِ خلقت :** مادیئین خلقت کے بارے میں کسی ہدف و مقصد کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ بے عقل و شعور اور بے ہدف و مقصد، طبیعت کو مبدأ خلقت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ پوری ہستی کے بے فائدہ اور فضول ہونے کے داعی ہیں۔ ان کے برعکس فلاسفہ الٰہی اور ادیانِ آسمانی کے پیروکار سب کے سب آفرینش و خلقت کے لیے ایک اعلیٰ مقصد کا عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ عالم اور قادر حکیم مبدأ سے یہ امر محال ہے کہ وہ کوئی کام بغیر ہدف و مقصد کے انجام دے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ ہدف و مقصد کیا ہے ؟

بعض اوقات ہم خدا کا اپنے اُوپر قیاس کرتے ہوئے اس توہم میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ شاید خدا میں کوئی کمی تھی کہ عالم ہستی کی خلقت سے، کہ جس میں سے ایک انسان بھی ہے، اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔

کیا وہ ہماری عبادت و پرستش کا محتاج ہے ؟ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ پہچانا جائے، اس لیے اس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے، تاکہ وہ پہچانا جائے اور اس کی شناخت ہو ؟!

لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک عظیم اشتباہ ہے کہ جو " خدا " کے " خلق " پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ صفاتِ خدا کی شناخت اور معرفت کی بحث میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی غلط قسم کا قیاس ہے۔ لہٰذا اس بحث میں پہلی بنیاد یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ وہ کسی چیز میں ہم سے مشابہت نہیں رکھتا۔

ہم ہر نظر سے ایک محدود وجود ہیں اور اسی وجہ سے ہماری تمام کوششیں اپنی خامیوں اور نقائص کو دُور کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں تاکہ پڑھے لکھے ہو جائیں اور ہماری علم کی کمی دُور ہو جائے۔ کاروبار کے لیے جاتے ہیں تاکہ فقر و فاقہ اور ناداری کا



Marfat.com

مقابلہ کرسکیں۔ فوج اور قوت مہیا کرتے ہیں تاکہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قدرت و طاقت کی کمی کی تلافی کریں۔ یہاں تک معنوی مسائل اور تہذیب نفس اور مقاماتِ رُوحانی کی سیر بھی، خامیوں اور نقائص کو دُور کرنے کی ہی کوششیں ہیں۔

لیکن کیا وہ ہستی جو ہر لحاظ سے غیر محدود ہے، جس کا علم و قدرت اور قوتیں بے انتہا ہیں، اور کسی لحاظ سے بھی جس میں کوئی کمی نہیں ہے کیا یہ بات اس کے لیے کہنا معقول ہے کہ وہ کوئی کام اپنی کمی کو دُور کرنے کے لیے کرے؟

اس تجزیے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف تو آفرینش و خلقت بے ھدف و مقصد نہیں ہے اور دوسری طرف سے یہ ھدف و مقصد آفریدگار و خالق سے متعلق نہیں ہے۔

تو اب آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حتماً اور بلا شک و شبہ یہ ھدف و مقصد ایسی چیز ہے کہ جو خود ہمارے ہی ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

اس تمہید پر توجہ کرتے ہوئے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ غرض خلقت ہمارے ہی تکامل و ارتقاء اور بلندی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے دوسرے لفظوں میں عالم ہستی ایک ایسی یونیورسٹی ہے کہ جو ہمارے علم کی تکمیل کے لیے بنائی گئی ہے۔

تربیت کے لحاظ سے ایک ایسی یونیورسٹی ہے کہ جو ہمارے نفوس کی تہذیب کے لیے ہے۔

معنوی درآمدات کو کسب کرنے کے لیے یہ ایک تجارت خانہ ہے۔

انسان کی طرح طرح کی ضروریات کی پیدائش کے لیے ایک زرخیز زمین ہے۔

ہاں!

الدنیا مزرعة الأخرة ..... الدنیا دار صدق لمن صدقها و دار غنی لمن تزود منها و دار موعظة لمن اتعظ منها۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا سچائی کا گھر ہے جو اس سے سچ بولے، تونگری کا گھر ہے جو اس سے زادِ راہ اور توشۂ آخرت حاصل کرے اور وعظ و نصیحت کا گھر ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے[1]

یہ قافلہ عالم عدم سے چلا ہے اور مسلسل لامتناہی منزل کی طرف بڑھا چلا جارہا ہے۔

قرآن مجید مختصر اور بہت معنی خیز اشارات کے ذریعہ مختلف آیات میں، ایک طرف تو خلقت و آفرینش میں ھدف و مقصد کے اصل وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس ھدف و مقصد کو مشخص بھی کر رہا ہے۔

پہلے حصے میں کہتا ہے:

ایحسب الانسان ان یترك سدًی

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل پیدا کیا گیا ہے، اور فضول چھوڑ دیا جائے گا۔ (قیامت۔۳۶)

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثًا و انکم الینا لا ترجعون

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۳۱



Marfat.com

کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور فضول پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آوٴ گے۔ (مومنون - ۱۱۵)

و ما خلقنا السمآء والارض وما بینهما باطلًا ذالك ظن الذین كفروا

ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ باطل اور فضول پیدا نہیں کیا ہے، یہ تو کافروں کا گمان ہے۔ (ص - ۲۷)

اور دوسرے حصہ میں کبھی تو آیاتِ قرآن میں آفرینش کا ہدف و مقصد خدا کی عبودیت اور بندگی کو قرار دیا ہے:

و ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (ذاریات - ۵۶)

یہ بات واضح ہے کہ عبادت انسان کی مختلف جہات سے تربیت کا ایک مکتب ہے۔ عبادت کا وسیع معنی ہے، فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اس لحاظ سے عبادت انسان کی رُوح کو گوناں گوں مراحل میں تکامل و ارتقاء بخشتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم عبادات سے مربوط مختلف آیات کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اور کبھی کہتا ہے: خلقت کا ہدف و مقصد آگاہی و بیداری اور تمہارے ایمان و اعتقاد کی تقویت ہے:

الله الذی خلق سبع سماوات ومن الارض مثلهن یتنزل الامر بینهن لتعلموا ان الله علی كل شیءٍ قدیر

خدا وہی تو ہے کہ جس نے سات آسمان اور انہی کے مانند زمینیں پیدا کی ہیں، اس کا حکم ان میں جاری و ساری ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (طلاق - ۱۲)

اور کبھی کہتا ہے کہ خلقت کا مقصد تمہارے حسن عمل کی آزمائش ہے:

الذی خلق الموت والحیٰوة لیبلوكم ایكم احسن عملًا

خدا وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں حُسنِ عمل کے میدان میں آزمائے اور تمہاری تربیت کرے۔ (ملک - ۲)

مندرجہ بالا تینوں آیات میں سے ہر ایک انسانی وجود کی کسی ایک جہت (آگاہی و ایمان، اخلاق اور عمل) کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ہر ایک خلقت کے تکاملی و ارتقائی مقصد کو بیان کرتی ہے کہ جس کی بازگشت خود انسان کی طرف ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ لفظ "تکامل" آیات قرآن میں ان مباحث میں بیان نہیں ہوا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایک وارداتی فکر ہو۔ لیکن اس اعتراض کا جواب واضح ہے کیونکہ ہم خاص الفاظ کی قید میں پابند نہیں ہیں اور مندرجہ بالا آیات میں تکامل کے مصادیق اچھی طرح روشن ہیں۔ کیا علم و آگاہی اس کا واضح مصداق نہیں ہے اور اسی طرح عبودیت اور حسن عمل میں پیش رفت۔

سورۂ محمدؐ کی آیہ ۱۷ میں بیان ہوا ہے:



Marfat.com

والذین اھتدوا زادھم ھدًی۔
وہ لوگ کہ جو راہِ ہدایت پر آگئے، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔
کیا اضافہ کی تعبیر تکامل و ارتقا کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟
یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہدف و مقصد تکامل و ارتقا ہی تھا تو پھر خدا نے انسان کو ابتداء میں ہی کیوں تمام جہات میں کامل پیدا نہ کر دیا تاکہ تکامل کے مراحل کو طے کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی؟
اس اعتراض کی بنیاد اس نکتے سے غفلت ہے کہ تکامل کی اصلی شاخ "تکامل اختیاری" ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکامل یہ ہے کہ انسان راستہ اپنے پاؤں اور اپنے ارادہ و اختیار سے طے کرے۔ اگر اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی آگے لے جایا جائے تو یہ نہ باعث فخر ہے اور نہ ہی تکامل و ارتقاء۔ مثلاً اگر انسان ایک روپیہ اپنی خواہش اور ارادہ و اختیار کے ساتھ خرچ کرے تو اُس نے اُسی نسبت سے اخلاقی کمال کی راہ طے کی ہے۔ جبکہ اگر اس کی دولت میں سے لاکھوں روپے جبراً چھین کر خرچ کر دیئے جائیں تو اس نے ایک قدم بھی اس راہِ تکامل میں آگے نہیں بڑھایا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام لوگ جبری طور پر ایمان لے آتے، لیکن اس ایمان کا ان کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوتا:
ولو شاء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعًا (یونس - ۹۹)

٭ ٭ ٭

۱۹۔ وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ
۲۰۔ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ○
۲۱۔ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ ○
۲۲۔ لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○
۲۳۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ ○
۲۴۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا



Marfat.com

يَعۡلَمُونَ الۡحَقَّ فَهُمۡ مُّعۡرِضُونَ ○

۲۵۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُولٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ○

## ترجمہ

۱۹۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اُسی کا ہے اور جو اُس کے پاس ہیں وہ کبھی اس کی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرتے اور نہ ہی تھکتے ہیں۔

۲۰۔ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور کمزوری اور کاہلی نہیں دکھاتے۔

۲۱۔ کیا انہوں نے ایسے زمینی خدا بنالیے ہیں کہ جو پیدا کر کے انہیں پھیلاتے ہوں۔

۲۲۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور کئی خدا ہوتے، تو ان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ (اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا)۔ یہ لوگ جو توصیفات بیان کر رہے ہیں، عرش کا پروردگار اللہ ان تمام باتوں سے منزّہ اور پاک ہے۔

۲۳۔ کوئی شخص اُس کے کام پر اعتراض نہیں کر سکتا جبکہ ان کے کاموں پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

۲۴۔ کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود اختیار کر لیے ہیں۔ تم کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ، یہ تو میری اور ان (پیغمبروں) کی بات ہے کہ جو مجھ سے پہلے تھے لیکن اُن میں سے اکثر حق کو نہیں سمجھتے اسی وجہ سے وہ اس سے رُوگرداں ہو جاتے ہیں۔

۲۵۔ ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے لہذا میری ہی عبادت کرو۔

## تفسیر

### شرک خیال آرائی سے شروع ہوتا ہے،

گزشتہ آیات میں اس حقیقت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ عالم ہستی بغیر ہدف و مقصد کے نہیں ہے، نہ مذاق اور کھیل تماشہ ہے اور نہ ہی لہو و لعب۔ بلکہ یہ انسانوں کے لیے ایک جچا تلا ہدف کمال رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ توہم پیدا ہو کہ خدا کو ہمارے ایمان اور عبادت کی کیا ضرورت ہے لہذا زیر بحث آیات پہلے اسی بات کا جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں: تمام (ذوی العقول) جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اسی کی ملکیت ہیں: (وله من فی السماوات والارض)۔



Marfat.com

" اور وہ فرشتے کہ جو مقربان بارگاہِ الٰہی ہیں، کبھی بھی اس کی عبادت پر تکبر نہیں کرتے اور نہ کبھی تھکتے ہیں"۔ ( ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادته ولا یستحسرون)[1]

وہ ہمیشہ رات دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور معمولی کمزوری اور کاہلی بھی وہ اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ (یسبحون اللیل والنھار لا یفترون)۔

ان حالات میں اُسے تمہاری اطاعت و عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب عظیم فرشتے شب و روز اس کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں بلکہ وہ تو ان کی عبادت کا بھی محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اُس نے تمہیں ایمان، عمل صالح، بندگی اور عبودیت کا حکم دیا ہے تو اس کا فائدہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یہ نکتہ بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ظاہری غلامی کے نظام میں غلام جتنا آقا سے نزدیک ہوگا، اتنا ہی اس کا خضوع کم ہوتا چلا جائے گا کیونکہ وہ اب آقا کا خاص ہوگیا ہے اور اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

لیکن " خلق " اور " خالق " کے نظامِ عبودیت میں معاملہ برعکس ہے۔ فرشتے اور اولیاء خدا جتنا خدا سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں ان کا مقامِ عبودیت بڑھتا جاتا ہے۔[2]

جب گزشتہ آیات میں عالمِ ہستی کے فضول اور بے مقصد ہونے کی نفی ہوچکی اور یہ ثابت ہوگیا کہ یہ عالم ایک مقدس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تو اس کے بعد زیرِ بحث آیات میں اس جہان کے مدبر و مدیر اور وحدتِ معبود کا مسئلہ شروع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا انہوں نے زمین پر کچھ خدا بنا لیے ہیں، ایسے خدا کہ جو موجودات کو تخلیق و حیات عطا کریں۔ اور جہانِ ہستی میں انہیں پھیلا سکیں ( ام اتخذوا الھة من الارض ھم ینشرون)[3]

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ معبود وہی ہونا چاہیئے کہ جو خالق ہو۔ خاص طور پر حیات کا خالق کیونکہ حیات خلقت کے روشن ترین چہروں میں سے ہے۔ یہ حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے کہ جو سورہ حج کی آیہ ۷۳ میں بیان ہوئی ہے:

ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له

---

[1] " یستحسرون" " حسر " کے مادہ سے اصل میں پوشیدہ چیز کو کھولنے اور جس میں وہ تھی اُسے الگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ بعد ازاں خستگی، تکان اور ضعف کے معنی میں بولا جانے لگا۔ گویا اس حالت میں انسان کی سب قوتیں آشکار اور خرچ ہو جاتی ہیں اور ان میں سے کوئی چیز اس کے بدن میں چھپی ہوئی نہیں رہتی۔

[2] المیزان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] " ینشرون" مادہ " نشر" سے پیچیدہ چیزوں کو پھیلانے کے معنی میں ہے اور زمین و آسمان کی وسعتوں میں مخلوقات کو پیدا کرنے اور پھیلانے کے لیے بھی کنایہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ یہ لفظ "معاد" اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ حالانکہ بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ گفتگو خدا کی پاک ذات کی توحید اور معبودِ حقیقی کے بارے میں ہے نہ کہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے متعلق۔



Marfat.com

وہ تمام معبود کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو اتنی بھی قدرت نہیں رکھتے کہ ایک مکھی ہی خلق کر سکیں، چاہے وہ سب کے سب اس کے لیے اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں، اس حال میں وہ کیسے لائق عبادت ہو سکتے ہیں۔

"الھۃ من الارض" (زمین میں سے کچھ خدا) کی تعبیر بتوں اور ان معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں لوگ پتھر اور لکڑی وغیرہ سے بناتے تھے اور انہیں آسمانوں پر حاکم خیال کرتے تھے۔

بعد والی آیت مشرکین کے بہت سے معبودوں اور خداؤں کی نفی کے لیے ایک نہایت روشن دلیل کو اس طرح سے بیان کرتی ہے:

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی کوئی معبود اور خدا ہوتا، تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ اور نظام جہان درہم برہم ہو جاتا (لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا)۔

"عرش کا پروردگار خدا اس توصیف سے کہ جو وہ کرتے ہیں منزہ اور پاک ہے" (فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون)۔

یہ ناروا نسبتیں اور یہ بناوٹی خدا اور خیالی معبود اوہام و خیالات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور اس کی پاک ذات کی کبریائی کا دامن ان ناروا نسبتوں سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔

٭ ٭ ٭

## دلیل تمانع:

وہ دلیل، جو مذکورہ بالا آیت میں توحید کے اثبات اور کئی معبودوں کی نفی کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ سادہ، آسان، روشن اور واضح ہونے کے باوجود اس سلسلے کی دقیق فلسفی دلیلوں میں سے ایک ہے کہ جسے علماء "برہان تمانع" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ اس دلیل کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

ہم بلا شک و شبہ اس جہان میں ایک نظام واحد کو حکم فرما دیکھ رہے ہیں، ایسا نظام کہ جو تمام جہات سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے قوانین ثابت اور آسمان و زمین میں جاری ہیں۔ اس کے پروگرام آپس میں منطبق اور اس کے اجزاء متناسب ہیں۔

قوانین کی یہ ہم آہنگی اور نظام آفرینش اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی مبداء ہے کیونکہ اگر متعدد مبداء ہوتے اور اس میں متعدد ارادے کار فرما ہوتے تو یہ ہم آہنگی ہرگز موجود نہ ہوتی اور وہی چیز کہ جسے قرآن "فساد" سے تعبیر کرتا ہے دنیا میں صاف طور پر نظر آتی۔

اگر ہم کچھ تحقیق اور مطالعہ کرنے والے ہوں تو کسی ایک کتاب کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسے ایک شخص نے لکھا ہے یا چند افراد نے۔

وہ کتاب جو ایک شخص کی تالیف ہو اس کی عبارات میں ایک خاص نظم اور ہم آہنگی، جملہ بندی، مختلف تعبیرات، کنایات و اشارات، عنوانات و نکات، مباحث کی طرز، خلاصہ یہ کہ اس کے تمام حصے بالکل ہم آہنگ ہوں گے۔ چونکہ وہ ایک فکر کی تخلیق



Marfat.com

اور ایک قلم کی تحریر ہے۔

لیکن اگر دو یا چند افراد — چاہے وہ سب عالم و دانشمند ہوں اور اکٹھے ایک ساتھ کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں — ہر ایک اُس کے ایک حصّہ کی تالیف اپنے ذمّہ لے تو اس کی عبارات والفاظ کی گہرائیوں میں اور بحثوں کی طرز میں فرق نمایاں ہوگا۔

اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ دو نفر چاہے کتنے ہی ہم فکر اور ہم سلیقہ ہوں، پھر بھی وہ دو نفر ہیں۔ اگر ان کی ہر چیز ایک ہوتی تو پھر تو وہ ایک نفر ہو جاتے۔ اس بنا پر قطعی اور یقینی طور پر اُن میں فرق ہونا چاہیئے تاکہ وہ دو نفر ہو سکیں اور یہ فرق آخر کار اپنا اثر ان کی تحریروں میں مرتب کرے گا۔

اب یہ کتاب چاہے کتنی ہی بڑی اور مفصل ہو اور نوع بنوع موضوعات کے بارے میں بحث کرتی ہو، یہ ناہم آہنگی بہت جلد محسوس ہو جائے گی۔

عالم آفرینش کی عظیم کتاب — کہ جس کی عظمت اس قدر ہے کہ ہم اپنے پورے وجود کے ساتھ اُس کی عبارات کے اندر گم ہو جاتے ہیں اس پر بھی یہی قانون جاری ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی ساری عمر میں بھی اس تمام کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے لیکن اتنی ہی مقدار کہ جس کے مطالعہ کی ہمیں اور دنیا کے تمام علماء کو توفیق ہوئی ہے، اس میں ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ جو اس کے مؤلف کی وحدت کی بخوبی حکایت کرتی ہے۔

ہم اس عجیب کتاب کی جتنی بھی ورق گردانی کرتے ہیں، ہر جگہ ایک عالمی نظام، نظم وضبط اور ناقابلِ توصیف ہم آہنگی اس کے کلمات، سطور اور صفحات میں نمایاں ہے۔

اگر اس جہان اور اس کے نظام کو چلانے میں کئی ارادے اور متعدد مبداء کا دخل ہوتا تو اس ہم آہنگی کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ واقعاً خلاء سے متعلق علم رکھنے والے خلائی جہازوں کو کامل باریک بینی کے ساتھ فضا میں کیونکر بھیج دیتے ہیں اور چاند گاڑیوں کو ٹھیک اسی جگہ اُتار لیتے ہیں کہ جس کا سائنسی اعتبار سے یقین کیا گیا ہو اور پھر انہیں مقرر شدہ مقام پر زمین کی طرف نیچے لے آتے ہیں۔

کیا یہ حساب کتاب کی باریکی اس بناء پر نہیں ہے کہ پورے عالم ہستی پر جو نظام حاکم ہے — وہ دقیق، منظم اور ہم آہنگ ہے اور اگر اس میں ذرّہ برابر بھی ناہم آہنگی (زمانے کے لحاظ سے ایک سیکنڈ کا سواں حصّہ بھی) ہوتی تو ان کے تمام اندازے درہم برہم ہو جاتے۔

مختصر یہ کہ اگر دو یا چند ارادے عالم پر حاکم ہوتے تو ہر ایک کا الگ تقاضا ہوتا اور ہر ایک دوسرے کے اثر کو ختم کر دیتا اور آخر کار سارے عالم کا نظام بگڑ کر رہ جاتا۔

## ایک سوال اور اس کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب گزشتہ توضیحات سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہان میں خداؤں کا تعدد اس صورت میں موجب فساد ہے جبکہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں کہ وہ (خدا) حکیم اور آگاہ ہیں تو حتمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عالم ہستی کا نظام چلائیں گے۔

اس سوال کا جواب زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ ان کا حکیم و دانا ہونا ان کے تعدد کو ختم نہیں کرتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ متعدد ہیں



Marfat.com

تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ تمام جہات سے ایک ہوں تو پھر وہ ایک خدا ہو جائیں گے۔ اس بنا پر جہاں تعدد ہے، وہاں حتمی طور پر تفاوت اور اختلافات موجود ہوں گے کہ جو چاہنے اور نہ چاہنے (دونوں صورتوں میں) ارادہ وعمل پر اثر انداز ہوں گے اور جہانِ ہستی کو ہرج مرج اور بگاڑ کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے (غور کیجئے گا)۔

اس برہان تمانع کو دوسری صورتوں میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو ہماری بحث کی حدود سے باہر ہے اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے وہی بہتر ہے۔

ان استدلالات میں سے بعض میں کہا گیا ہے کہ اگر دو ارادے عالمِ خلقت میں حکم فرما ہوتے، تو اصلاً کوئی جہان وجود میں ہی نہ آتا۔ جبکہ اوپر والی آیت جہان کے فساد اور نظام میں خلل پڑنے سے متعلق گفتگو کر رہی ہے نہ کہ جہان کے موجود نہ ہونے کے بارے میں۔ (غور کیجئے گا)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اُس حدیث میں کہ جو ہشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام نے نقل کی اس طرح بیان ہوا ہے کہ امامؑ نے ایک بے ایمان شخص کے جواب میں کہ جو خدا کے تعدد کے بارے میں بات کر رہا تھا فرمایا:

یہ دو خدا جو تو کہتا ہے یا تو دونوں قدیم و ازلی اور طاقتور ہیں، یا دونوں ضعیف و ناتواں ہیں یا اُن میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف و کمزور ہے۔ اگر دونوں قوی ہوں تو پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ہٹا کیوں نہیں دیتا اور عالم کی تدبیر اکیلا ہی اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتا اور اگر تیرا گمان یہ ہے کہ ان میں سے ایک قوی ہے اور دوسرا ضعیف ہے تو تُو نے خدا کی توحید کو قبول کر لیا ہے کیونکہ دوسرا تو ضعیف و کمزور ہے لہٰذا وہ خدا نہیں ہے اور اگر تو یہ کہے کہ وہ دو ہیں تو معاملہ دو حالت سے خالی نہیں ہے یا تو وہ تمام جہات سے متفق ہیں یا مختلف ہیں لیکن جبکہ ہم نظامِ خلقت کو منظم دیکھ رہے ہیں۔ آسمان کے ستارے اپنے مخصوص راستوں پر چل رہے ہیں، رات اور دن ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور سورج اور چاند ہر ایک اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے۔ تدبیرِ جہان کی یہ ہم آہنگی اور اس کے امور کا نظم و ضبط اس بات کی دلیل ہے کہ مدبّرِ عالم ایک ہے۔

اس سے قطع نظر، اگر تیرا پھر بھی یہی دعویٰ ہو کہ خدا دو ہیں تو لازمی طور پر ان کے درمیان کوئی فاصلہ (یا کسی قسم کا امتیاز) ہونا چاہیئے تاکہ ان کے درمیان دوئی مانی جا سکے۔ تو یہاں یہ فاصلہ (امتیاز) خود ایک تیسرا موجود ازلی ہو جائے گا اور اس طرح خدا تین ہو جائیں گے اور اگر تم یہ کہو گے کہ وہ تین ہیں تو پھر اُن کے درمیان دو فاصلے (امتیاز) ہونے چاہئیں۔ تو اس صورت میں تُو پانچ قدیم و ازلی وجودوں کا قائل ہو جائے گا اور اس طرح سے یہ تعداد بڑھتی ہی چلی جائے گی، جس کی کوئی حد اور انتہا نہ ہو گی۔[۱]

---

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۴۱۹، ۴۱۸ بحوالہ توحید صدوق۔



Marfat.com

اس حدیث کی ابتداء میں بُرہانِ تمانع کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد ایک اور دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ جسے "برھان فرجه" یا "مابه الاشتراك ومابه الامتیاز" کا فرق کہتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ہشام بن حکم نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

ما الدلیل علی ان الله واحد؟ قال: اتصال التدبیر وتمام الصنع، کما قال الله عزوجل: لوکان فیهما اٰلهة الا الله لفسدتا

خدا کے ایک ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو آپ نے فرمایا: تدبیر جہان میں نظم وضبط اور ہم آہنگی اور خلقت کا ہر طرح سے کامل ہونا۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے: لوکان فیهما اٰلهة الا الله لفسدتا (اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو نظامِ جہاں بگڑ جاتا)۔[1]

٭ ٭ ٭

جب اس استدلال سے کہ جو آیت میں بیان ہوا ہے، عالم کے مدبّر اور اسے چلانے والے کی توحید ثابت ہوگئی تو اس کے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اُس نے اس طرح سے حکیمانہ طور پر جہان کو نظام بخشا ہے کہ کسی قسم کے اعتراض و گفتگو کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ کوئی شخص اس کے کام پر تنقید نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی (اعتراض کے طور پر) اس سے سوال کرسکتا ہے جبکہ دوسرے اس طرح نہیں ہیں۔ ان کے افعال وکردار میں بہت سے اعتراضات اور سوالوں کی گنجائش ہے: (لا یسئل عما یفعل وهم یسئلون)۔

اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے لیکن جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم دو قسم کے سوال کرتے ہیں۔ سوال کی ایک قسم تو وہ ہے جسے توضیحی سوال کہتے ہیں کیونکہ انسان کچھ مسائل سے بے خبر ہوتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ان کی حقیقت معلوم کرے۔ یہاں تک کہ اس بات کا علم اور ایمان ہونے کے باوجود کہ جو کام انجام پایا ہے وہ ایک صحیح کام ہے۔ پھر بھی وہ اس کے اصلی ہدف کو جاننا چاہتا ہے۔ اس قسم کے سوالات خدا کے افعال کے بارے میں بھی جائز ہیں۔ بلکہ یہ وہی سوال ہے کہ جو علمی مسائل اور جہانِ خلقت میں تحقیق وجستجو کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے اور اس قسم کے سوالات چاہے عالم تکوین سے تعلق رکھتے ہوں یا تشریع سے، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کے اصحاب نے اکثر کیے ہیں۔

باقی رہی سوال کی دوسری قسم، وہ اعتراضی سوال ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انجام دیا گیا فعل نادرست اور غلط تھا۔ مثلاً ہم اُس شخص سے کہ جس نے اپنے عہد وپیمان کو بغیر کسی دلیل کے توڑ دیا ہو، یہ کہتے ہیں کہ تو عہد شکنی کیوں کرتا ہے؛ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہم اُس سے وضاحت طلب کر رہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس پر اعتراض کریں۔

مسلّمہ طور پر خداوند حکیم کے افعال پر اس قسم کے اعتراضات کوئی معنی نہیں رکھتے اور اگر کبھی کسی سے سرزد ہو جائیں تو حتمی طور پر وہ ناآگاہی اور جہالت کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے افعال میں اس قسم کے سوالات کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔

---

[1] نورالثقلین، ج ۳ ص ۴۱۷-۴۱۸، بحوالہ توحیدِ صدوق۔



Marfat.com

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت کے بارے میں جابر جعفی کے سوال کے جواب میں آپؑ نے فرمایا:

لانہ لا یفعل الا ماکان حکمۃ وصوابا

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ اس میں حکمت ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح اور درست ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر اس گفتگو سے یہ نتیجہ واضح طور پر نکالا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسری قسم کا سوال کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی اُس نے خدا کو اچھی طرح سے پہچانا نہیں ہے اور اس کے حکیم ہونے کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔

بعد والی آیت نفی شرک کے سلسلے میں دو دوسری دلیلوں پر مشتمل ہے۔ گزشتہ دلیل سے مل کر یہ مجموعاً تین دلیلیں ہوجائیں گی۔
پہلے فرمایا گیا ہے: کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے لیے کچھ اور معبود منتخب کر لیے ہیں؟ تم کہہ دو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو: (ام اتخذوا من دونہ آلھۃ قل ھاتوا برھانکم)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر گزشتہ دلیل سے کہ جس کی بنیاد یہ تھی کہ عالم ہستی کا نظام توحید کی دلیل ہے، صرف نظر کرلو تو کم از کم شرک اور ان خداؤں کی الوہیت ثابت کرنے کے لیے تو کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ تو پھر عاقل انسان ایسی بات بغیر دلیل کے کیسے قبول کرتا ہے؟

اس کے بعد آخری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ صرف میں اور میرے ہمراہی ہی نہیں کہ جو توحید کی بات کرتے ہیں بلکہ تمام گزشتہ انبیاء اور سب ایمان لانے والے موحد ہی تھے (ھذا ذکر من معی وذکر من قبلی)۔
یہ وہی دلیل ہے کہ جسے علماء عقائد نے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ پر انبیاءؑ کے اجماع واتفاق کے عنوان کے ماتحت بیان کیا ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی بُت پرستوں کی کثرت ۔ بعض لوگوں کے لیے توحید قبول کرنے میں مانع ہو خصوصاً ان حالات میں جیسے قبل ہجرت مکہ میں مسلمانوں کو در پیش تھے اور جن کی طرف سورہ انبیاء اشارہ کر رہی ہے۔ لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے: لیکن اُن میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے اس لیے انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا ہے: (بل اکثرھم لا یعلمون الحق فھم معرضون)۔

بہت سے معاشروں میں نادان اکثریت کی مخالفت کرنا ہمیشہ بے خبر لوگوں کے لیے رُوگردانی کے مترادف قرار دی جاتی رہی ہے اور قرآن نے بہت سی مکی اور مدنی آیات میں اس اکثریت کے طرزِ عمل کو بنیاد بنانے کی شدت کے ساتھ مذمت کی ہے اور اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ دلیل ومنطق کو ہی معیار سمجھتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض بے خبر یہ کہنے لگیں کہ ہمارے سامنے عیسیٰؑ جیسے انبیاء بھی ہیں کہ جنہوں نے متعدد خداؤں کی طرف دعوت دی ہے۔ تو قرآن آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے پاس یہ وحی نہ آئی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا میری ہی عبادت کرو: (وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون)۔



Marfat.com

اس طرح سے یہ ثابت ہوگیا کہ نہ عیسٰی نے اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی اور پیغمبر نے کبھی شرک کی دعوت دی تھی اور اس قسم کی نسبتیں تہمت ہیں۔

٭ ٭ ٭

۲۶۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝
۲۷۔ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝
۲۸۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا
لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝
۲۹۔ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ
كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

## ترجمہ

۲۶۔ انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ اس کی ذات (اس عیب ونقص سے) منزہ ہے یہ (فرشتے) اس کے مکرم بندے ہیں۔

۲۷۔ جو ہرگز بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

۲۸۔ وہ ان کے آج کے اور آیندہ کے تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے گزشتہ اعمال سے بھی آگاہ ہے اور وہ سوائے اس شخص کے کہ جس سے خدا راضی ہے (اور اس کی شفاعت کی اجازت اُس نے دی ہے) کسی کی شفاعت نہیں کرتے اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔

۲۹۔ اور جو کوئی اُن میں سے یہ کہے کہ مَیں خدا کے سوا معبود ہوں۔ تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح سے سزا دیتے ہیں۔



Marfat.com

# تفسیر

## فرشتے مکرم اور فرمانبردار بندے ہیں :

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں پیغمبروں اور ہر قسم کے شرک کی نفی (اور ضمناً عیسٰے خدا کا بیٹا ہونے کی نفی) کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات سب کی سب فرشتوں کے خدا کی اولاد ہونے کی نفی کے بارے میں ہیں۔

**اس کی وضاحت** یہ ہے کہ بہت سے مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی اولاد ہیں اور اسی بنا پر کبھی ان کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن مندرجہ بالا آیات میں صراحت کے ساتھ اس بے ہودہ اور بے بنیاد عقیدے کی مذمت کرتا ہے اور مختلف دلائل کے ساتھ اس کا بطلان ظاہر کرتا ہے۔

**پہلے** کہتا ہے : انہوں نے کہا کہ خدا نے رحمٰن کی اولاد ہے۔ (وقالوا اتخذ الرحمٰن ولداً)۔

اگر ان کی مراد حقیقی بیٹا ہو تو اس کے لیے جسم لازم ہے اور اگر یہ متبنٰی (منہ بولا بیٹا) ہو کر جو عربوں میں معمول تھا، تو وہ بھی ضعف و احتیاج کی دلیل ہے اور ان سب باتوں سے قطع نظر اصولی طور پر بیٹے کی احتیاج اور ضرورت اسے ہوتی ہے جو فنا ہونے والا ہو، تو اس کی نسل، جائیداد اور آثار کی بقا کے لیے اس کا بیٹا مدت دراز تک اس کی زندگی کو دوام بخشے، یا (اسے بیٹے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے تاکہ اُسے) تنہائی کا احساس نہ ہو اور وہ اس کا مونس تنہائی بنے یا اپنی طاقت میں اضافے کے لیے لیکن ایک ازلی ابدی وجود جو جسم نہ رکھتا ہو اور ہر لحاظ سے بے نیاز ہو اس کے بارے میں بیٹا یا اولاد کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔

لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : وہ اس عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے (سبحانہٗ)۔

اس کے بعد فرشتوں کی صفات چھ شقوں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مجموعی طور پر اس بات پر ایک روشن دلیل ہیں کہ وہ خدا کی اولاد نہیں ہیں :

۱۔ وہ بندگانِ خدا ہیں (بل عباد)۔

۲۔ وہ مکرم و محترم بندے ہیں (مکرمون)۔

وہ بھاگ جانے والے غلاموں کی طرح نہیں ہیں کہ جو اپنے آقا کی سختی اور دباؤ تلے رہ کر خدمت کرتے ہیں بلکہ وہ ایسے بندے ہیں کہ جو ہر لحاظ سے مکرم ہیں اور جو راہِ عبودیت کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ خدا نے بھی عبودیت میں ان کے خلوص کی وجہ سے انہیں مکرم و محترم قرار دیا ہے۔ اور انہیں اپنی بہت سی نعمات عطا کی ہیں۔

۳۔ وہ اس قدر مؤدب اور خدا کے فرمانبردار ہیں کہ "کبھی بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے" (لا یسبقونہٗ بالقول)۔

۴۔ اور عمل کے لحاظ سے بھی "وہ صرف اسی کے فرمان پر عمل کرتے ہیں" (وھو بامرہ یعملون)۔



Marfat.com

کیا یہ صفات ، اولاد کی ہوسکتی ہیں یا بندوں کی ؟

٭ ٭ ٭

اس کے بعد ان کے بارے میں خدا کے احاطۂ علمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :
خدا ان کے آج اور آیندہ کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور گزشتہ کو بھی ۔ ان کی دنیا سے بھی آگاہ ہے اور ان کی آخرت سے بھی ۔ ان کے وجود سے پہلے بھی اور ان کے وجود کے بعد بھی : ( یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم )[1]
مسلمہ طور پر فرشتے اس امر سے آگاہ ہیں کہ خدا ان کے بارے میں یہ سب کچھ جانتا ہے اور یہی عرفان اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ نہ تو اُس سے پہلے کوئی بات کہتے ہیں اور نہ ہی اس کے فرمان سے سرتابی کرتے ہیں ۔ اور اس طرح سے یہ جملہ ہوسکتا ہے کہ سابق آیت کے لیے تعلیل کا حکم رکھتا ہو ۔

۵ ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جو کہ خدا کے مکرم و محترم بندے ہیں ، حاجت مندوں کے لیے شفاعت کریں گے لیکن اس بات پر توجہ رہے کہ " وہ ہرگز کسی ایسے کی شفاعت نہیں کریں گے جس کے بارے میں یہ نہ جان لیں کہ خدا اُس سے راضی ہے اور اُس نے اس کی شفاعت کی اجازت دے دی ہے " : ( ولا یشفعون الا لمن ارتضٰی ) ۔
یقیناً خدا کا راضی ہونا اور اس کا شفاعت کی اجازت دے دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا ۔ حتماً یہ اس سچے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہے جس کے باعث انسان کا خدا کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے ۔ بالفاظ دیگر ممکن ہے انسان گناہ سے آلودہ ہو جائے لیکن اگر وہ اپنا رابطہ خدا اور اولیاء خدا سے بالکل منقطع نہ کرے تو اس کے بارے میں شفاعت کی اُمید ہے ۔
لیکن اگر فکر اور عقیدے کے لحاظ سے اس کا تعلق بالکل ٹوٹ جائے یا عملی طور پر اس قدر آلودہ ہو کہ شفاعت کی اہلیت کھو بیٹھا ہو ۔ تو اس موقع پر کوئی پیغمبر مرسل یا مقرب فرشتہ اس کی شفاعت نہیں کرے گا ۔
یہ وہی مطلب ہے کہ جسے ہم فلسفۂ شفاعت کی بحث کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں کہ شفاعت ایک انسان ساز مکتب ہے اور گناہوں میں آلودہ لوگوں کو واپس صحیح راستے پر لانے کا ایک وسیلہ ہے نیز شفاعت کا عقیدہ یاس و نا اُمیدی سے بچاتا ہے کیونکہ نا اُمیدی انحراف اور گناہ میں غرق ہونے کا ایک عامل ہے ۔ اس قسم کی شفاعت پر ایمان رکھنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ گنہگار لوگ اپنا رابطہ خدا ، انبیاءؑ اور آئمہؑ سے منقطع نہ کریں ، اپنے لوٹنے کے تمام راستوں کو ویران نہ کریں[2]
ضمنی طور پر یہ جملہ اُن لوگوں کا جواب ہے کہ جو یہ کہتے تھے کہ ہم فرشتوں کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہ خداوندی میں ہماری شفاعت کریں ۔ قرآن کہتا ہے : وہ اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کرسکتے لہٰذا جو کچھ چاہتے ہو وہ براہِ راست خدا سے چاہو ، یہاں تک کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کی اجازت بھی ۔

---

[1] بزرگ مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں تین باتیں کی ہیں ، ہم نے مذکورہ بالا عبارت میں ان تینوں کو جمع کردیا ہے ۔ چونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں

[2] ہم شفاعت کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۴۸ اور ۲۵۴ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کرچکے ہیں ۔ وہاں رجوع فرمائیں ۔



Marfat.com

۶۔ اسی معرفت اور آگاہی کے سبب سے " وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی کے خوف کو اپنے دل میں راہ دیتے ہیں "
(وهـو خشيته مشفقون)۔

وہ اس لیے نہیں ڈرتے کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے بلکہ وہ عبادت میں کوتاہی یا ترک اولیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "خشیت" اصل لغت کے لحاظ سے ہر قسم کے خوف کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسا خوف ہوتا ہے کہ جو تعظیم و احترام کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

"مشفق" مادہ " اشفاق" سے۔ اُس توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف کی آمیزش رکھتی ہو (چونکہ اصل میں یہ "شفق" کے مادے سے لیا گیا ہے کہ جو ایسی روشنی ہے کہ جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہو)

اس بنا پر ان کا خدا سے خوف ایسا نہیں ہے جیسا کہ کسی انسان کو ایک وحشتناک حادثہ کا خوف ہوتا ہے اور اسی طرح ان کا "اشفاق" ایسے بھی نہیں جیسے کہ انسان کسی خطرناک چیز سے ڈرتا ہے بلکہ ان کا خوف و اشفاق احترام۔ عنایت، توجہ، معرفت اور احساس مسئولیت کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے [۱]

⁂

یہ بات واضح ہے کہ فرشتے ان عمدہ اور امتیازی صفات اور خالص مقام عبودیت کے باوجود ہرگز خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔ لیکن اگر یہ فرض کرلیں کہ" اُن میں سے کوئی یہ کہنے لگے کہ خدا نہیں، میں معبود ہوں۔ تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے، ہاں! ظالموں کو ہم اسی طرح سے سزا دیا کرتے ہیں"۔ (ومن يقل منهم اني اله من دونه فذلك نجزيه جهنم، كذلك نجزى الظالمين)۔

درحقیقت الوہیت کا دعویٰ کرنا، اپنے اُوپر بھی اور معاشرے کے اُوپر بھی ظلم کرنے کا ایک واضح مصداق ہے اور قانون کلی میں "كذلك نجزى الظالمين" درج ہے۔

⁂

۳۰۔ اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ ○

۳۱۔ وَجَعَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِهِمۡ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ○

۳۲۔ وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۖۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا

[۱] مفردات راغب: مادہ " خشیت " " شفق " اور تفسیر المعانی آیات زیر بحث کے ذیل میں۔



Marfat.com

مُعۡرِضُوۡنَ ۝

۳۳۔ وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ۝

## ترجمہ

۳۰۔ کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں ایک دوسرے سے جُدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

۳۱۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ آرام و سکون میں رہیں اور زمین ان کے ساتھ کسی طرف کو ڈھلک نہ جائے اور ان میں درے اور راستے قرار دیے تاکہ اپنی منزلِ مقصود کو جا پہنچیں۔

۳۲۔ اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا لیکن وہ اس کی آیات سے رُوگرداں ہیں۔

۳۳۔ وہ وہی ہے جس نے رات دن بنائے نیز سُورج اور چاند کو پیدا کیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک اپنے ہی مدار میں گردش کر رہا ہے۔

## تفسیر

### جہانِ ہستی میں خدا کی مزید نشانیاں:

گزشتہ آیات میں مشرکین کے بیہودہ عقائد کا ذکر تھا اور ان میں توحید سے متعلق دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد زیرِ بحث آیات میں عالمِ ہستی کے نظام میں خدا کی نشانیوں کا ایک سلسلہ اور اس کی منظم تدبیر کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ گزشتہ مباحث پر مزید تاکید ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے اور ہم نے اُنہیں کھول دیا: (اولم یر الذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقناهما)۔

اور ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے: (وجعلنا من المآء کل شیءٍ حیّ)۔

کیا ان آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لاتے: (افلا یؤمنون)۔

اس بارے میں کہ "رتق" و "فتق" (پیوستگی اور جدائی) کہ جو یہاں آسمانوں اور زمین کے بارے میں کہی گئی ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں کہ جن میں تین تفسیریں آیت کے مفہوم کے زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے ممکن ہے تینوں تفسیریں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں[1]۔

---

[1] فخر رازی تفسیر کبیر میں اور بعض دوسرے مفسرین۔



Marfat.com

۱۔ آسمان و زمین کی ایک دوسرے سے پیوستگی، ابتدار خلقت کی طرف اشارہ ہے۔

محققین کے نظریے کے مطابق یہ جہان مجموعی طور پر حرارت سے پیدا شدہ بھاپ کے ایک عظیم ملے ہوئے ٹکڑے کی صورت میں تھا کہ جس میں اندرونی تغیرات اور حرکت کی وجہ سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اجزا بکھرتے رہے اور نظام شمسی کے تمام سیارے اور ستارے اور کرۂ زمین وجود میں آئے اور ابھی بھی یہ جہان اسی طرح پھیلتا چلا جارہا ہے۔

۲۔ پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ جہان کا مادہ ایک ہی طرح کا تھا۔ اس طرح سے کہ سب کے سب آپس میں ملے ہوئے تھے اور ایک مادۂ واحد کی صورت میں معلوم ہوتے تھے لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مادّے ایک دوسرے سے جُدا ہونے لگے اور ان میں نئی نئی ترکیبیں پیدا ہونے لگیں اور آسمان و زمین میں طرح طرح کی نباتات، حیوانات اور دوسری موجودات ظاہر ہوئیں۔ ایسی موجودات کہ اُن میں سے ہر ایک موجود ایک مخصوص نظام، آثار اور امتیازی خواص رکھتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک پروردگار کی عظمت، علم اور لامتناہی قدرت کی نشانی ہے[1]

۳۔ آسمان کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ ابتداء میں بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین کی باہم پیوستگی سے مراد یہ ہے کہ اُس زمانے میں کوئی نباتات نہ اُگتی تھیں لیکن خدا نے ان دونوں کو کھول دیا۔ آسمان سے بارش نازل کی اور زمین سے انواع و اقسام کی نباتات اُگائیں۔

متعدد روایات — جو اہل بیتؑ سے بیان ہوئی ہیں — آخری معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اُن میں سے بعض پہلی تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں[2]

اس میں شک نہیں کہ آخری تفسیر ایک ایسی چیز ہے کہ جو آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے کہ آسمان سے کس طرح بارش نازل ہوتی ہے اور زمینیں شگفتہ ہوتی ہیں اور نباتات اُگتی ہیں اور یہ " اولم یر الذین کفروا " (کیا وہ لوگ کہ جو کافر ہوگئے ہیں، انہوں نے نہیں دیکھا ۔ ۔ ۔) کے جملے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور یہ " وجعلنا من الماء کل شیءٍ حیّ " (اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا ہے) کے جملے کے ساتھ بھی پوری پوری ہم آہنگی رکھتی ہے۔

لیکن پہلی اور دوسری تفسیر بھی ان جملوں کے وسیع معنی کے مخالف نہیں ہے کیونکہ " رویت "، بعض اوقات علم کے معنی میں بھی آتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ علم و آگاہی سب کے لیے نہیں ہے۔ یہ صرف کچھ ہی صاحبِ علم ہوتے ہیں کہ جو آسمان و زمین کے گزشتہ کے بارے میں اور ان کی پیوستگی اور پھر اُن کی جُدائی کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن ایک زمانہ یا ایک صدی کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کے لیے ہر دور میں رہبر و راہنما ہے۔

اسی بنا پر قرآن میں اس قسم کے عمیق اور گہرے مطالب ہیں یہ ہر گروہ اور ہر زمانے کے لیے قابل استفادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیر بحث آیت تینوں تفاسیر کی حامل ہو کہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر صحیح اور کامل ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ کسی لفظ کا ایک سے زیادہ معنی میں استعمال، نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہیں بلکہ کبھی کمال فصاحت کی دلیل ہوتا ہے

---

[1] المیزان، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر صافی اور تفسیر نور الثقلین میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔



Marfat.com

اور یہ جو روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ "قرآن کے کئی مختلف بُطون ہیں"، ہو سکتا ہے یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

باقی رہا تمام زندہ موجودات کے پانی سے پیدا ہونے کے بارے میں کہ جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے، تو اس کے لیے دو تفسیریں مشہور ہیں :

۱۔ تمام زندہ موجودات کی حیات — خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات — پانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی پانی کہ بالآخر جس کا مبدا، وہی بارش ہے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ یہاں "ماء" نطفہ کے پانی کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے عام طور پر زندہ موجودات وجود میں آتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے محققین اور سائنس دان یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زندگی کا سب سے پہلا جاندار سمندروں کی گہرائیوں میں پیدا ہوا، اسی بنا پر وہ زندگی اور حیات کا آغاز پانی سے سمجھتے ہیں۔

نیز اگر قرآن انسان کی خلقت کو مٹی سے شمار کرتا ہے، تو اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ مٹی سے مراد وہی "طین" (گارا) ہے کہ جو پانی اور مٹی سے مل کر بنتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ، دانشمند محققین کی تحقیق کے مطابق انسان کے بدن اور بہت سے حیوانات کے بدن کا زیادہ حصّہ پانی ہی سے بنا ہوا ہے۔ (تقریباً ستر فیصد حصّہ)۔

اور یہ جو بعض نے اعتراض کیا ہے کہ فرشتوں اور جنّات کی پیدائش، باوجود اس کے کہ وہ بھی زندہ موجودات ہیں مسلمہ طور پر پانی سے نہیں ہے، اس کا جواب واضح ہے کیونکہ یہاں مقصد وہ زندہ موجودات ہیں کہ جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ پانی کا کیا ذائقہ ہے تو امامؑ نے پہلے فرمایا :

سل تفقھًا ولا تسئل تعنتًا

سمجھنے کے لیے سوال کر بہانہ سازی کے لیے نہ پوچھ۔

اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا :

طعم الماء طعم الحياة ! قال الله سبحانه وجعلنا من الماء كل شیٔ حیّ

• پانی کا ذائقہ وہی ہے جو حیات کا ذائقہ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے ہر زندہ موجود کو پانی سے پیدا کیا ہے ۔

خصوصاً جب انسان گرمیوں میں بہت عرصہ پیاسا رہے، ہوا بھی جھلسانے والی ہو، اس کے بعد اسے خوشگوار پانی میسر آجائے تو جونہی پانی کا پہلا گھونٹ پیتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے بدن میں جان ڈالی جا رہی ہے۔ حقیقت میں امامؑ یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور پانی کے ارتباط اور پیوستگی کو اس خوبصورت انداز میں ظاہر کریں۔

بعد والی آیت توحید کی نشانیوں اور اس کی عظیم نعمتوں کے ایک اور حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم نے زمین میں مضبوط پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ انسانوں کو نہ لرزائے (وجعلنا فی الارض رواسی ان تميد بهم)۔[1]

---

[1] "رواسی" جمع ہے "راسیہ" کی اس کا معنی ہے سخت اور گڑے ہوئے پہاڑ اور چونکہ اس قسم کے پہاڑ نیچے بنیادوں میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا ممکن ہے اس پیوستگی کی طرف اشارہ ہو اور سائنسی لحاظ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پہاڑوں کی جڑوں کی یہ باہم پیوستگی، زمین کے لرزنے اور جھٹکے کھانے سے روکنے میں گہرا اثر رکھتی ہے۔ "تمید" "مید" کے مادہ سے بڑی بڑی چیزوں کے ناموزوں جھٹکوں اور لرزنے کے معنی میں ہے۔



Marfat.com

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ پہاڑوں نے کرۂ زمین کو ایک زرہ کی طرح اپنے اندر لیا ہوا ہے اور یہ زمین کے اندر گیسوں کے دباؤ کی وجہ سے جو شدید جھٹکے اور زلزلے پیدا ہوتے ہیں، انہیں بہت حد تک روکنے کا سبب بنتے ہیں۔

علاوہ ازیں پہاڑوں کی یہی وضع و کیفیت، چاند کی کشش سے ہونے والے مد و جزر کے مقابلہ میں زمین کے اوپر کے حصہ کی حرکات کو کم سے کم رکھتی ہے۔

دوسری طرف اگر پہاڑ نہ ہوتے تو سطح زمین ہمیشہ تیز ہواؤں کی زد میں ہوتی اور اس میں کوئی آرام و سکون دکھائی نہ دیتا، جیسا کہ شور زدہ زمینوں اور خشک جلانے والے بیابانوں میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کی طرف کہ وہ بھی اس کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان عظیم پہاڑوں کے اندر درے اور راستے بنا دیئے ہیں تاکہ ان کی راہنمائی ہو اور وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں:
(وجعلنا فیہا فجاجاً سبلاً لعلھم یھتدون)۔

سچ مچ اگر یہ درے اور شگاف نہ ہوتے تو زمین میں ان عظیم پہاڑوں کا موجود سلسلہ مختلف علاقوں کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کر دیتا کہ ان کا تعلق ایک دوسرے سے بالکل ختم ہو جاتا اور یہ بات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ سب ظہور پذیر ہونے والے امور ایک حساب اور پروگرام کے مطابق ہیں۔

٭ ٭ ٭

اور چونکہ انسان کی زندگی کے سکون کے لیے زمین کا سکون تنہا کافی نہیں ہے بلکہ اوپر کی طرف سے بھی اس کے لیے امن و امان ہونا چاہیئے لہٰذا بعد والی آیت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے: ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا ہے لیکن وہ اس وسیع آسمان میں موجود توحید کی آیات اور نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں: (وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً وھو عن آیاتھا معرضون)۔

یہاں پر آسمان سے مراد ـ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ـ وہ فضا ہے کہ جس نے زمین کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور محققین کی تحقیقات کے مطابق اس کی ضخامت کئی سو کلومیٹر ہے۔ یہ ظاہری طور پر لطیف قشر کہ جو ہوا اور گیسوں سے مل کر بنا ہے اس قدر محکم اور مضبوط ہے کہ باہر کی طرف سے جو بھی ٹکرانے والی موجود چیز زمین کی طرف آئے گی وہ نابود ہو جائے گی اور یہ زمین کے کرّہ کو رات دن "شہاب ثاقب" کے پتھروں کی بمباری سے، کہ جو ہر قسم کے گولوں سے زیادہ خطرناک ہیں، محفوظ رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں سورج کی وہ شعاعیں کہ جو موت کا پیغام بن سکتی ہیں، اس کے ذریعہ سے صاف ہو جاتی ہیں اور ان مہلک شعاعوں کو کہ جو فضا سے زمین کی طرف آرہی ہوتی ہیں روک دیتا ہے۔

ہاں! یہ آسمان بہت ہی مضبوط اور پائیدار چھت ہے کہ جسے خدا نے منہدم ہونے سے بچا رکھا ہے۔[1]

---

[1] بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کو ان آیات سے ہم آہنگ سمجھا ہے کہ جو قرآن مجید میں شہاب کے ذریعے شیاطین کے آسمانوں پر چڑھنے سے محفوظ رہنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ (مثلاً: وحفظاً من کل شیطان مارد۔ صافات) لیکن یہ بات واضح اور روشن ہے کہ یہ تفسیر لفظ "سقف" (چھت) کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ چھت ان لوگوں کے لیے کہ جو اس کے نیچے ہوتے ہیں، ایک ڈھانپنے کی چیز ہوتی ہے، کہ جو اس کے اوپر ہو۔ (غور کیجئے گا)



Marfat.com

آخری زیر بحث آیت میں رات دن اور سورج و چاند کی خلقت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہا گیا ہے: وہی ہے کہ جس نے رات دن اور سورج و چاند کو پیدا کیا ہے: (وھوالذی خلق اللیل والنھار والشمس والقمر)۔

اور اُن میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے: (کل فی فلک یسبحون)۔

## چند اہم نکات:

۱۔ "کل فی فلک یسبحون" کا مفہوم: اس کی تفسیر کے بارے میں مفسرین نے مختلف بیانات دیئے ہیں لیکن وہ بات کہ جو علم افلاک کے ماہرین کی مسلمہ تحقیقات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سورج کی حرکت سے مراد یا تو حرکت دوری ہے کہ جو وہ خود اپنے گرد کرتا ہے یا وہ حرکت ہے کہ جو وہ نظام شمسی کے ہمراہ رکھتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "کل" ممکن ہے چاند اور سورج کی طرف اشارہ ہو اور اسی طرح ستاروں کی طرف بھی اشارہ ہو کیونکہ کلمہ "لیل" (شب) سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "شب" اور "روز" اور چاند اور سورج (چاروں) کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رات تو زمین کا مخروطی سایہ ہی ہے۔ نیز اس کا اپنا مدار بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر دور سے اس کی طرف دیکھے تو وہ اس تاریک مخروطی سائے کو زمین کے گرد دائماً اور ہمیشہ حرکت میں دیکھے گا اور اسی طرح سورج کی وہ روشنی کہ جو زمین پر پڑتی ہے اور جس سے دن کا ظہور ہوتا ہے، اس ستون کی مانند ہے کہ جو اس کرہ کے گرد ہمیشہ نقل مکانی کرتا رہتا ہے، لہٰذا رات اور دن بھی اپنے لیے ایک گردش اور ایک مکان رکھتے ہیں۔[1]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ سورج کی حرکت سے مراد ہمارے احساس میں اس کی حرکت ہے کیونکہ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے کے لیے سورج اور چاند دونوں گردش میں ہیں۔

۲۔ آسمان محکم چھت ہے: ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ "سماء" (آسمان) قرآن میں مختلف معانی کے لیے آیا ہے۔ کبھی تو وہ زمین کی فضا یعنی ہوا کے اس ضخیم قشر کے معنی میں آیا ہے کہ جس نے کرۂ ارض کو چار طرف سے گھیرا ہوا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں ہے۔ اس مقام پر فزکس کے ماہرین کی زبان سے اس عظیم چھت کی مضبوطی اور استحکام کے بارے میں مزید وضاحت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"فرانک آلن" جو فزکس کا اُستاد ہے، اس طرح لکھتا ہے:

> وہ فضائی قشر (جو) کہ جو سطح زمین پر زندگی کی نگہبانی کرنے والی گیسوں سے مل کر بنا ہوا ہے، اس قدر ضخیم ہے کہ جو ایک زرہ کی طرح، زمین کو، ایسے بیس ملین آسمانی پتھروں کے شر سے کہ جو موت کا پیغام ہوتے ہیں اور جو ۵۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اُس کے

---

[1] یہ اقتباس المیزان سے لیا گیا ہے۔



Marfat.com

ساتھ آکر ٹکراتے ہیں' امان میں رکھ سکتا ہے۔

زمین کا فضائی قشر (جو) اُن دوسرے کاموں کے علاوہ سطح زمین پر درجہ حرارت کو بھی زندگی کے لیے درکار حدود تک محفوظ رکھتا ہے اس کے علاوہ پانی اور پانی کے بخارات کے بہت ہی ضروری ذخیرے کو سمندروں سے خشکی کی طرف منتقل کرتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام براعظم شوردار، خشک، ناقابلِ زیست زمین میں تبدیل ہو جاتے۔ اس طرح یوں کہنا چاہیئے کہ سمندر اور جو زمین' زمین کے لیے کنویں سے پانی کھینچنے والی چرخی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِن شہابوں میں سے بعض کا وزن کہ جو زمین کی طرف آتے ہیں ایک گرام کے ہزارویں حصّے کی مقدار کے برابر ہوتا ہے لیکن حد سے زیادہ سرعت اور تیزی کی وجہ سے اس کی قوت و طاقت، ایٹمی ذرات کی طاقت کے برابر ہوتی ہے کہ جن سے تباہ کن بم تیار ہوتے ہیں اور اُن شہابوں کا حجم بعض اوقات ریت کے ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

اِن شہابوں میں سے کئی ملین شہاب ہر روز زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی جل جاتے ہیں یا بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات بعض شہابوں کا حجم اور وزن اِس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ گیسوں کے قشر سے گزر کر سطح زمین کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔

منجملہ اُن شہابوں کے جو مذکورہ گیسوں سے نکل کر زمین تک پہنچے ایک بہت بڑا مشہور شہاب" سیبری" ہے کہ جو ۱۹۵۹ء میں زمین سے آٹکرایا تھا۔ اس کا قطر اتنا بڑا تھا کہ اس نے تقریباً ۴۰ کیلومیٹر زمین کو گھیر لیا تھا اور اس کے گرنے سے بہت سے نقصانات ہوئے تھے۔

ایک اور شہاب وہ ہے کہ جو امریکہ میں" اریزونا" کے مقام پر گرا تھا کہ جس کا قطر ایک کیلومیٹر اور اس کی موٹائی بیس میٹر تھی۔ اس کے گرنے سے زمین میں گہرا شگاف پڑ گیا تھا اور اُس کے پھٹنے سے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے شہاب پیدا ہو گئے تھے کہ جو دُور دُور جا رہے تھے۔

" کرسی موریسن لکھتا ہے: اگر وہ ہوا کہ جو زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اس کی نسبت کہ جتنی اب ہے کچھ بھی کم اور پتلی ہوتی تو اجرام سماوی اور شہاب ثاقب کہ جو روزانہ کئی ملین کی تعداد میں اس سے آٹکراتے ہیں اور اسی فضا کے اندر باہر ہی باہر منتشر اور نابود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین پر پہنچ جاتے اور اس کے گوشہ و کنار سے آآکر ٹکراتے رہتے یہ اجرام فلکی چھ سے چالیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتے ہیں اور جس چیز سے بھی جا ٹکراتے ہیں اُسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اس میں آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

اگر ان اجرام سماوی کی حرکت اور تیزی' اس سے کمتر ہوتی، جتنی کہ اب ہے' مثلاً وہ ایک گولی کی سرعت اور تیزی کے برابر ہوتی، تو وہ سب کے سب سطح زمین پر آگرتے اور ان کی تباہی کا نتیجہ واضح ہے، منجملہ ان کے اگر خود انسان ان اجرام سماوی کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی زد میں آجاتا، تو اس کی حرارت کی شدت کے باعث۔ کہ جو گولی کی سرعت حرکت کی نسبت نوّے گنا زیادہ ہے، ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو جاتا۔



Marfat.com

زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوا کی موٹائی اس قدر ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کو صرف اتنی ہی مقدار میں کہ جتنی نباتات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے، زمین کی طرف آنے دیتی ہے اور تمام ضرر رساں جراثیم کو اسی فضا کے اندر نیست و نابود کر دیتی ہے اور مفید وٹامن پیدا کرتی ہے [1]

* * *

۳۴۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ○

۳۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○

## ترجمہ

۳۴۔ ہم نے تجھ سے پہلے کسی بھی انسان کو دائمی زندگی نہیں دی۔ (تو اس وقت وہ لوگ کہ جو تیری موت کا انتظار کر رہے ہیں) اگر تو مر جائے تو کیا وہ ہمیشہ جیتے ہی رہیں گے ؟

۳۵۔ ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا، اور ہم تمہاری مصیبت و راحت کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے اور آخر کار تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔

## تفسیر

### موت سب کے لیے ہے :

گزشتہ آیات کے ایک حصّہ میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی تردید کے لیے ان کے انسان ہونے کو بہانہ بناتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ پیغمبر کو حتمی طور پر فرشتہ ہونا اور ہر قسم کے بشری عوارض سے خالی ہونا چاہیئے۔

زیر بحث آیات ان کے کچھ اور اعتراضات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کبھی تو وہ یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے جو شاعرانہ سر و صدا بلند کر رکھی ہے، ہمیشہ نہیں رہے گی اور اس کے مرنے سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ سورہ طور کی آیہ ۳۰ میں بیان ہوا ہے :

---

[1] کتاب "رازِ آفرینش انسان" ص ۳۴ تا ۳۵۔



Marfat.com

ام یقولون شاعر نتربص به ریب المنون

اور کبھی یہ خیال کرتے تھے کہ چونکہ اس شخص کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خاتم انبیاءؑ ہے۔ لہٰذا اُسے ہرگز نہیں مرنا چاہیئے تاکہ اپنے دین کا محافظ ہو۔ لہٰذا اس کی موت اس کے دعویٰ کے باطل ہونے کی دلیل ہوگی۔

قرآن مندرجہ بالا پہلی آیت میں مختصر سے جملے میں انہیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو جاوداں زندگی نہیں دی: (وما جعلنا لبشر من قبلك الخلد)۔

یہ فطرت کا ناقابلِ تغیر قانون ہے کہ کوئی بھی شخص حیاتِ جاودانی نہیں رکھتا۔ لہٰذا جو لوگ ابھی سے تیری موت کی خوشی منا رہے ہیں کیا اگر تجھے موت آتی ہے تو وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے: (افان مت فهم الخالدون)۔

شاید اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ شریعت و دین و آئین کی بقاء اس کے لانے والے کی بقاء کی محتاج نہیں ہے۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اگرچہ حیاتِ جاوید نہ رکھتے تھے لیکن ان عظیم پیغمبروں کی وفات کے (اور حضرت عیسیٰؑ کے آسمان کی طرف صعود کرنے کے) بعد بھی قرنوں تک ان کا آئین و دین باقی رہا۔

لہٰذا دین و مذہب کی بقا اس بات کی محتاج نہیں کہ پیغمبر اس کی حفاظت کے لیے ہمیشہ موجود رہے کیونکہ اس کے جانشین اس کی تعلیمات اور ہدایات کو جاری اور برقرار رکھ سکتے ہیں۔

اور یہ بات کہ جو وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر کے چلے جانے کے بعد تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، درحقیقت ان کے بالکل اندھے پن کا ثبوت ہیں کیونکہ یہ بات ان مسائل کے بارے میں تو صحیح ہے کہ جو کسی شخص کے ساتھ قائم ہوں اسلام نہ تو شخصی اعتبار سے پیغمبر کے ساتھ قائم تھا اور نہ ہی آپ کے انصار و اصحاب کے ساتھ۔ یہ ایک ایسا زندہ اور رواں دواں دین و آئین ہے کہ جو اپنی اندرونی حرکت کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔ اور زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی حرکت اور سفر جاری رکھتا ہے۔

❋ ❋ ❋

اس کے بعد تمام نفوس کے بارے میں موت کے بلا استثناء عمومی قانون کو اس طرح بیان کرتا ہے: ہر انسان موت کا ذائقہ چکھے گا: (كل نفس ذائقة الموت)۔

یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ لفظ "نفس" قرآن مجید میں مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے "نفس" کا پہلا معنی "ذات" یا اپنا آپ ہے۔ یہ ایک وسیع معنی ہے، یہاں تک کہ خدا کی ذات پاک پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے:

كتب على نفسه الرحمة

خدا نے رحمت کو اپنے اُوپر لازم قرار دے لیا ہے۔ (انعام - ۱۲)

بعد میں یہ لفظ انسان کے لیے یعنی جسم و رُوح کے مجموعے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً:

من قتل نفسا بغير نفس او فساد فى الارض فكانما قتل الناس جميعا

جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد کیا ہو قتل کردے تو یہ ایسے ہے جیسے اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا ہو۔ (مائدہ - ۳۲)



Marfat.com

کبھی خصوصیت کے ساتھ یہ لفظ انسان کی رُوح کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً :

اخرجوا انفسکو

رُوحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کہیں گے کہ اپنی رُوح کو باہر نکالو۔ (انعام ۹۳)

یہ بات ظاہر ہے کہ زیر بحث آیت میں " نفس " سے دوسرا معنی مراد ہے۔ مقصد انسانوں کے بارے میں عمومی قانون بیان کرنا ہے اور اس طرح سے آیت میں کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ " نفس " کی تعبیر تو خدا یا فرشتوں کے لیے بھی آئی ہے۔ تو آیہ کو کس طرح جانداروں کے لیے مختص قرار دیا جائے اور خدا اور فرشتوں کو اس میں سے کیسے خارج کیا جائے۔[1]

موت کے عمومی قانون کو بیان کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ناپائیدار زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟

قرآن اسی آیت کے آخر میں کہتا ہے : ہم تمہارا شر اور خیر کے ذریعے امتحان لیں گے اور آخر کار تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے: (ونبلوکو بالشر والخیر فتنة والینا ترجعون)۔

تمہاری اصلی جگہ یہ جہان نہیں ہے بلکہ دوسرا جہان ہے۔ تم یہاں صرف امتحان دینے کے لیے آئے ہو اور امتحان ختم ہونے اور ضروری کمال کے بعد اپنی اصلی جگہ کی طرف، جو کہ دارِ آخرت ہے، چلے جاؤ گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امتحان کے امور میں " شر " کو " خیر " پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ خدائی آزمائش اگرچہ کبھی نعمت کے ذریعے ہوتی ہے اور کبھی بلا و مصیبت کے ذریعے لیکن مسلمہ طور پر بلا و مصیبت کے ذریعے ہونے والی آزمائش زیادہ سخت اور زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ یہاں " شر " مطلق شر کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ یہاں ایسا " شر " مراد ہے کہ جو آزمائش اور تکامل کا ذریعہ ہے۔ اس بنا پر یہاں مراد نسبی شر ہے اور اصلی طور پر صحیح توحیدی نقطہ نظر سے تمام عالمِ ہستی میں مطلق شر وجود ہی نہیں رکھتا (غور کیجئے گا)۔

لہٰذا ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک دفعہ امامؑ بیمار ہوگئے تو کچھ بھائی اور دوست آپؑ کی عیادت کے لیے آئے اور عرض کیا :

کیف نجدك یا امیرالمؤمنین ؟ قال بالشر

اے امیرالمومنینؑ آپ کا حال کیسا ہے ؟ آپؑ نے فرمایا : شر ہے۔

قالوا ماھذا کلام مثلك

انہوں نے کہا یہ بات آپ جیسی ہستی کے لائق نہیں ہے۔ امامؑ نے فرمایا :

" ان اللہ تعالیٰ یقول و نبلوکو بالشر والخیر فتنة فالخیر الصحة والغنا والشر المرض والفقر"

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تمہاری " شر " اور " خیر " کے ذریعہ سے آزمائش کرتے ہیں

---

[1] المیزان، جلد ۱۴، ص ۳۱۲۔



Marfat.com

"خیر" تو تندرستی اور تونگری ہے اور "شر" بیماری اور فقر و فاقہ ہے (یعنی یہ وہ تعبیر ہے کہ جسے میں نے قرآن مجید سے انتخاب کیا ہے)۔

یہاں ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا بندوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے اور اصولی طور پر خدا کے بارے میں آزمائش کیا مفہوم رکھتی ہے؟

اس سوال کا جواب ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۵۵ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں کہ خدا کے بارے میں آزمائش، تربیت کرنے کے معنی میں ہے۔ (اس موضوع کی مکمل تفصیل کا وہاں پر مطالعہ کریں)۔

❖ ❖ ❖

۳۶۔ وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا ۖ
أَهَٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ
هُمْ كَافِرُونَ ○
۳۷۔ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ○
۳۸۔ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○
۳۹۔ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ
النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ○
۴۰۔ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ
يُنْظَرُونَ ○

## ترجمہ

۳۶۔ جب کفار تجھے دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق اُڑانے کے سوا انہیں اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ (اور وہ یہ کہتے ہیں کہ) کیا یہ وہی شخص ہے کہ جو تمہارے خداؤں کے بارے میں باتیں بناتا ہے؟ حالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔

۳۷۔ ہاں! انسان جلد باز مخلوق ہے (اگر تم جلدی نہ کرو)، میں عنقریب تمہیں اپنی آیات دکھاؤں گا۔



Marfat.com

۳۸۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو (تو بتاؤ) یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا؟

۳۹۔ لیکن اگر کافر یہ جان لیتے کہ وہ آگ کے شعلوں کو اپنے چہروں اور اپنی پشتوں سے دور نہیں کر سکیں گے اور کوئی شخص ان کی مدد بھی نہیں کرے گا (تو پھر اس قدر قیامت کے بارے میں جلدی نہ کرتے)

۴۰۔ ہاں! یہ خدائی عذاب اچانک ان کے پاس آئے گا اور انہیں مبہوت کر دے گا۔ اس طرح سے کہ اسے دور کرنے کی ان میں طاقت نہ ہوگی اور انہیں مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔

# تفسیر

## اِنسان جلدباز مخلوق ہے:

ان آیات میں مشرکین کی پیغمبر اسلام کے متعلق —— کچھ اور نکتہ چینیوں اور اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اصولی مسائل میں ان کی انحرافی طرز فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت کفار تجھے دیکھتے ہیں تو تیرا تمسخر اڑانے کے سوا انہیں اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا: (واذا رآك الذين كفروا ان يتخذونك الا هزوا)۔

وہ بے پروائی کے ساتھ تیری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: کیا یہ وہی ہے کہ جو تمہارے خداؤں اور بتوں کی برائی کرتا ہے (اهذا الذي يذكر الهتكم)[1]

حالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں (وهم بذكر الرحمٰن هم كافرون)۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ اگر کوئی شخص ان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کی برائی کرے —— برائی ہی بیان نہ کرے بلکہ حقیقت کا اظہار کرے اور یہ کہے کہ یہ بے روح و بے شعور اور ایک بے قدر و قیمت موجودات ہیں، تو وہ اس بات پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ایسے مہربان اور بخشنے والے خدا کا منکر ہو جائے کہ جس کی رحمت کے آثار وسعت عالم پر محیط ہیں اور ہر چیز میں اس کی عظمت اور رحمت کی دلیل موجود ہے، تو یہ ان کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ہاں! جس وقت انسان کو کسی چیز کی عادت ہو جاتی ہے اور اس کی خُوبُو اس میں رچ بس جاتی ہے اور اس میں پختہ ہو جاتا ہے تو وہ چیز اس کی نظروں کو اچھا لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی بدترین کیوں نہ ہو اور جس وقت وہ کسی چیز سے عداوت و دشمنی اختیار کر لیتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ چیز اس کی نظروں کو بُری لگنے لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی زیبا اور محبوب کیوں نہ ہو۔

* * *

اس کے بعد ان بے مہار انسانوں کے ایک اور قبیح اور بے سر و پا کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: انسان جلد باز مخلوق ہے: (خلق الانسان من عجل)۔

---

[1] یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں یہ کہتے تھے، کہ یہ وہی شخص ہے کہ جو تمہارے خداؤں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ اس بات تک کے لیے راضی نہ تھے کہ برائی کا لفظ اپنی عبارت میں لے آئیں اور یہ کہیں کہ یہ تمہارے خداؤں کی بدگوئی کرتا ہے یا انہیں برا کہتا ہے۔



Marfat.com

اگرچہ مفسرین نے یہاں پر " انسان " اور " عجل " کے بارے میں مختلف باتیں کی ہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں پر انسان سے مراد نوع انسان ہی ہے ( البتہ ایسے انسان کہ جو تربیت یافتہ نہ ہوں ، بلکہ خدائی رہبروں کی رہبری سے باہر رہے ہوں ) اور " عجل " سے مراد تیزی اور جلد بازی ہے ۔ جیسا کہ بعد والی آیات اس بات پر شاہد ناطق ہیں اور قرآن میں ایک اور جگہ پر بیان ہوا ہے :

وکان الانسان عجولاً

انسان جلد باز ہے ۔ ( بنی اسرائیل - ۱۱ )

درحقیقت " خلق الانسان من عجل " کی تعبیر ایک قسم کی تاکید ہے ۔ یعنی انسان اس طرح کا جلد باز ہے کہ گویا جلد بازی اور " عجلہ " سے پیدا ہوا ہے اور اس کے وجود کے تار و پود اسی سے بنے ہیں اور سچ مچ بہت سے آدمی اسی بات کے عادی ہیں ۔ وہ خیر اور بھلائی میں بھی جلد باز ہیں اور شر اور برائی میں بھی ۔ یہاں تک کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے کفر اور گناہ اختیار کیا تو عذاب الٰہی تمہارے دامن گیر ہو جائے گا تو وہ کہتے ہیں کہ یہ عذاب پھر جلدی کیوں نہیں آتا ؟

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے : جلدی نہ کرو ، میں اپنی آیات تمہیں عنقریب دکھاؤں گا : ( ساوریکم ایاتی فلا تستعجلون ) ۔

ممکن ہے یہاں پر " آیاتی " کی تعبیر ، عذاب ، بلا ، مصائب اور سزاؤں کی آیات اور نشانیوں کی طرف اشارہ ہو کہ پیغمبر جس سے مخالفین کو ڈراتے تھے اور یہ کور مغز بار بار یہی کہتے تھے کہ وہ بلائیں اور مصیبتیں جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے کہاں گئیں ؟

قرآن کہتا ہے کہ جلدی نہ کرو ، زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ وہ تمہیں آلیں گی ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اُن معجزات کی طرف اشارہ ہو کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی دلیل ہیں یعنی اگر تم تھوڑا سا صبر کرو ، تو تمہیں کافی معجزات دکھائے جائیں گے ۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ، کیونکہ مشرکین دونوں چیزوں میں جلد بازی کرتے تھے اور خدا نے بھی دونوں ہی انہیں دکھائیں ـــــ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور بعد والی آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے ۔

ان کے ایک اور عاجلانہ تقاضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا : ( و یقولون متیٰ ھذا الوعد ان کنتم صادقین ) ۔

وہ انتہائی بے صبری کے ساتھ قیام قیامت کے منتظر تھے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ قیامت کے آتے ہی ان کی بیچارگی اور بدبختی کا آغاز ہو جائے گا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے ، جلد باز انسان اپنی بدبختی و نابودی کے لیے بھی جلد بازی کرتا ہے ۔

ان کنتم صادقین ( اگر تم سچے ہو ) کی تعبیر جمع کی صورت میں ہے ۔ حالانکہ مخاطب پیغمبر اسلامؐ تھے ۔ یہ اس بنا پر ہے کہ اس خطاب میں ان کے سچے پیروکاروں کو بھی شریک کیا گیا ہے اور وہ ضمنی طور پر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قیامت کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ تم سب کے سب جھوٹے ہو ۔

بعد والی آیت ان کو جواب دیتے ہوئے کہتی ہے : اگر کافر اس زمانے کو جانتے ہوتے کہ جب وہ آگ کے شعلوں کو



Marfat.com

اپنے چہروں اور پشتوں سے دُور نہیں کر سکیں گے، اور کوئی شخص ان کی امداد کے لیے بھی نہیں آئے گا، تو وہ ہرگز عذاب کے لیے جلدی نہ کرتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔ ( لو یعلم الذین کفروا حین لا یکفون عن وجوھھم النار ولا عن ظھورھم ولا ھم ینصرون )۔

زیر بحث آیت میں "چہروں" اور "پشتوں" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوزخ کی آگ اس طرح نہیں ہوگی کہ وہ ان کے ایک ہی طرف رہے بلکہ ان کے سامنے کا حصّہ بھی آگ میں ہوگا اور پُشت والا حصہ بھی۔ گویا وہ آگ کے اندر غرق ہوں گے

"ولا ھم ینصرون" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت کہ جن کے بارے میں وہ یہ گمان کرتے رہے تھے کہ وہ ان کے شفیع و مددگار ہوں گے، اُن سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔

اور یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ "یہ خدائی سزا اور جلا ڈالنے والی آگ اس طرح سے اچانک اُنہیں آئے گی کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے": ( بل تأتیھم بغتۃ فتبھتھم )۔

"اور انہیں اس طرح سے غافل اور مقہور و مغلوب کر دے گی کہ اُن میں اسے دُور کرنے کی بھی طاقت نہ ہوگی": ( فلا یستطیعون ردھا )۔

یہاں تک کہ اگر وہ اب مہلت کی خواہش بھی کریں اور اُس کے برخلاف کہ جس کے لیے وہ پہلے جلدبازی کیا کرتے تھے تاخیر کی درخواست کرنے لگیں تو بھی" انہیں مہلت نہیں دی جائے گی: ( ولا ھم ینظرون )۔

## چند اہم نکات :

**۱۔ جلد باز کو جلد بازی سے ممانعت :** زیر بحث آیات پر توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر انسان فطری طور پر جلد باز ہے تو پھر اسے جلد بازی سے منع کرتے ہوئے کیوں کہا گیا ہے: " فلا تستعجلون " ( تم جلدی نہ کرو )۔ کیا یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ انسان کے ارادہ کے اختیار اور آزادی اور اس کی اخلاقی صفات، خصوصیات اور جذبات و روحیات کے قابلِ تغیر ہونے کی طرف توجہ دیں تو واضح ہوگا کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ تربیّت اور تزکیہ نفس کے ذریعے اس حالت کو بدلا جا سکتا ہے۔

**۲۔ "بل تأتیھم بغتۃ فتبھتھم" کا مفہوم :** اس کا معنی ہے عذابِ الٰہی اچانک ان کی طرف آئے گا اور انہیں مبہوت کر دے گا"۔ یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے عذاب کی ہر چیز دنیا کے عذاب سے مختلف ہے۔ مثلاً: جہنم کی آگ کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے:

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ

خدا کی روشن کی ہوئی آگ تو (ایسی ہے کہ جو) انسان کے دل میں جا کے لگے گی ( ہمزہ - ۶ - ۷ )

یا یہ کہ جہنم کے ایندھن کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ:



Marfat.com

وقودھا الناس والحجارۃ

جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ (بقرہ۔ ۲۴)

اس قسم کی تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جہنم کی آگ اچانک اور غفلت کی حالت میں آنے والی اور مبہوت کر دینے والی ہے۔

٭ ٭ ٭

۴۱۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ ع

۴۲۔ قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ط بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُونَ ۝

۴۳۔ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُونِنَا ط لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُونَ ۝

۴۴۔ بَلْ مَتَّعْنَا هٰؤُلَاءِ وَاٰبَاءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ط اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ط اَفَهُمُ الْغٰلِبُونَ ۝

۴۵۔ قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ صلے وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ اِذَا مَا يُنْذَرُونَ ۝

## ترجمہ

۴۱۔ (اگر یہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں تو پریشان نہ ہو) تجھ سے پہلے پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا جاتا تھا لیکن آخرکار جس چیز کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، وہی عذاب تمسخر اڑانے والوں کے دامن گیر ہو گیا۔

۴۲۔ تم کہہ دو کہ رات کو اور دن کو خدا (کے عذاب) سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ لیکن وہ اپنے پروردگار کی یاد



Marfat.com

سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

۴۳۔ کیا ان کے معبود ایسے ہیں کہ جو ہمارے مقابلہ میں ان کا دفاع کریں؟ یہ (بناوٹی خدا) تو اپنی مدد بھی نہیں کرسکتے (دوسروں کی مدد کیا کریں گے) اور نہ ہی ہماری طرف سے کسی طاقت کے ذریعہ ان کی مدد ہوگی۔

۴۴۔ ہم نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمر پائی (اور وہی ان کے غرور وطغیان کا سبب بن گئی) کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم پے در پے اور مسلسل زمین (اور اس میں رہنے والوں) میں کمی کرتے جا رہے ہیں، کیا وہ غالب ہیں (یا ہم)؟

۴۵۔ تم کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف وحی کے ذریعے ڈراتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ کہ جن کے کان بہرے ہیں، جس وقت انہیں ڈرایا جاتا ہے تو وہ باتوں کو سنتے ہی نہیں ہیں۔

# تفسیر

## کان دھر کے سنو اگر تمہارے کان ... ... ..

گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مشرکین اور کفار پیغمبر اکرمؐ کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہی کام کہ جو تمام جاہل اور مغرور لوگوں کی پرانی عادت ہے کہ وہ حقیقی اور اہم واقعات کو بھی مذاق اور استہزاء کے طور پر لیتے ہیں۔

زیر بحث پہلی آیت میں پیغمبرؐ کو دلاسہ اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صرف تم ہی نہیں ہو کہ جس کا مذاق اڑایا جارہا ہے بلکہ "تجھ سے پہلے جو پیغمبر آئے تھے انہوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا تھا": (ولقد استھزئ برسل من قبلك)۔

"لیکن آخر کار وہ عذاب الٰہی کہ جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے تمسخر اڑانے والوں کے دامن گیر ہوگیا: (فحاق بالذین سخروا منھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

لہٰذا تم کسی قسم کے غم و اندوہ کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دو اور جاہلوں کے اس طرح کے کام سے تیری عظیم روح پر معمولی سا اثر بھی نہیں ہونا چاہیئے اور یہ تیرے آہنی عزم میں کسی قسم کا خلل نہ ڈالنے پائیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: نہ صرف قیامت میں عذاب الٰہی سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی یہی حال ہے۔ تم کہہ دو کہ رات اور دن میں خدائے رحمان کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکتا ہے: (قل من یکلؤکم باللیل والنھار من الرحمٰن)۔

حقیقت میں اگر خدا نے آسمان (جو زمین) کو ایک محفوظ چھت قرار نہ دیا ہوتا ـــــ جیسا کہ پہلی آیات میں بیان ہوا ہے ـــــ تو تمہارے لیے صرف یہی کافی تھا کہ رات دن تم آسمانی پتھروں کی زد میں ہوتے۔

خدائے رحمٰن تم سے اس قدر محبت رکھتا ہے کہ اس نے تمہاری نگہبانی اور حفاظت کے لیے ایسے ایسے مامورین قرار دیئے ہوئے



Marfat.com

کہ اگر وہ ایک لحظہ کے لیے تم سے جدا ہو جائیں تو مصائب و آلام کا سیلاب تم پر ٹوٹ پڑے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "اللہ" کی بجائے "رحمٰن" استعمال ہوا ہے۔ یعنی تم یہ تو دیکھو کہ تم نے کس قدر گناہ کیے ہیں کہ تم نے اُس خدا کو بھی ناراض کر دیا ہے جو رحمتِ عامہ کا مرکز ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: لیکن اُنہوں نے پروردگار کی یاد سے منہ موڑ لیا ہے۔ نہ اس کے انبیاء کے واعظ و نصائح کی طرف کان دھرتے ہیں اور نہ ہی خدا اور اس کی نعمتوں کی یاد ان کے دلوں کو ہلاتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بارے میں سوچتے ہیں" بلکہ انہوں نے اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیر لیا ہے": (بل ھم عن ذکر ربھم معرضون)۔

پھر سوال کیا گیا ہے کہ: یہ ظالم اور گنہگار کافر، خدائی عذاب کے مقابلے میں کس پر اعتماد کیے ہوئے ہیں "کیا وہ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلہ میں ان کا دفاع کر سکیں": (ام لھم اٰلھة تمنعھم من دوننا)۔

"ان کے یہ جعلی خدا تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے" اور نہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں: (لا یستطیعون نصر انفسھم)۔

اور نہ ہی ان کی ہماری طرف سے رحمت اور معنوی قوت کے ذریعے کوئی مدد کی جائے گی اور نہ ہی ان کا کسی طرح سے کوئی ساتھ دیا جائے گا: (ولا ھم منا یصحبون)[۱]

بعد والی آیت میں بے ایمان لوگوں کی سرکشی اور طغیان کی ایک اہم علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: ہم نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو انواع و اقسام کی نعمتیں عطا کیں، یہاں تک کہ انہوں نے طولانی عمریں پائیں۔ (بل متعنا ھٰؤلاء وآبائھم حتیٰ طال علیھم العمر)۔

لیکن بجائے اس کے کہ یہ طولانی عمر اور فراواں نعمت اُن میں شکرگزاری کا احساس اُبھارتی اور وہ حق تعالیٰ کے آستانِ عبودیت پر سر رکھتے، یہی ان کے غرور اور طغیان کا سبب بن گئی۔

لیکن کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جہان اور اس کی نعمتیں پائیدار نہیں ہیں۔ "کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم مسلسل زمین اور زمین کے رہنے والوں میں کمی کر رہے ہیں": (افلا یرون انا نأتی الارض ننقصھا من اطرافھا)۔

اقوام و قبائل یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، چھوٹے اور بڑے افراد میں سے کوئی بھی عمرِ جاودانی نہیں رکھتا اور سب کے سب اپنا سر نقابِ فنا چھپا رہے ہیں۔ وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی، زیادہ طاقتور اور زیادہ سرکش تھیں سب نے تاریک مٹی کے نیچے اپنا منہ چھپا لیا۔ یہاں تک کہ دانشمند بزرگ اور علماء کہ جو قوامِ زمین تھے، انہوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں "تو ان حالات میں کیا وہ غالب ہیں، یا ہم غالب ہیں": (افھم الغالبون)۔

اس بارے میں کہ "انا نأتی الارض ننقصھا من اطرافھا" (ہم زمین کی طرف آتے ہیں اور مسلسل اس کے اطراف کو کم کرتے رہتے ہیں کے جملے سے کیا مراد ہے، مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں:

---

۱: "یصحبون" باب افعال سے ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے کسی چیز کو مدد اور حمایت کے طور پر کسی شخص کر دے دینا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بُت نہ ذاتی طور پر دفاع کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی طرف سے اس قسم کی قدرت ان کے اختیار میں دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عالم ہستی میں ہر دفاعی قوت یا کسی ذات کے اندر سے ابھرتی ہے یا خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔



Marfat.com

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا مشرکین کی زمینوں اور بستیوں میں بتدریج کمی کر رہا ہے اور مسلمانوں کے شہروں میں اضافہ کر رہا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اُس زمانے میں مسلمانوں کو ایسی فتوحات حاصل نہیں ہو رہی تھیں، یہ تفسیر مناسب نظر نہیں آتی۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد زمینوں کی تدریجی خرابی اور ویرانی ہے۔

۳۔ بعض اسے زمین میں رہنے والوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

۴۔ بعض نے یہاں خصوصیت سے دانشمندوں اور علماء کا ذکر کیا ہے۔

لیکن ان سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ زمین سے مراد اس دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگ ہیں، وہ مختلف افراد اور قومیں جو بتدریج دیارِ عدم کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں اور دنیا کی زندگی کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ اور اس طرح سے دائمی طور پر اطراف زمین کم ہوتی رہتی ہیں۔

بعض روایات میں کہ جو آئمہ اہل بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں، یہ آیت علماء اور دانشمندوں کی موت سے تعبیر ہوتی ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

نقصانها ذهاب عالمها

زمین کا نقصان اور کم ہونا علماء کے فقدان کے معنی میں ہے۔[1]

البتہ ہم جانتے ہیں کہ یہ روایات عموماً واضح اور ظاہر مصداق بیان کرنے کے لیے ہیں نہ یہ کہ مفہوم آیت کو مخصوص افراد میں انحصار کرتی ہیں۔

اس طرح سے آیت کا منشاء و مفہوم یہ ہے کہ بزرگوں، بڑی بڑی قوموں یہاں تک کہ علماء کی تدریجی موت کو، مغرور اور بے خبر کافروں کے لیے ایک درسِ عبرت کے طور پر بیان کرے اور اس بات کی نشاندہی کرے کہ خدا سے مقابلہ کرنے کی صورت میں ان کے لیے کامیابی ممکن نہیں۔

اس کے بعد یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ پیغمبرؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو وحی کے ذریعے ڈرائے۔ اس لیے رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، میں تو صرف وحی کے ذریعے تمہیں ڈراتا ہوں: (قل انما انذركم بالوحی)۔

اور اگر تمہارے سخت دل پر اس کا اثر نہیں ہوتا تو یہ بات باعثِ تعجب نہیں ہے اور نہ ہی وحی آسمانی میں کسی نقص کی دلیل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "بہرے لوگوں کو جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ سُنتے ہی نہیں": (ولا يسمع الصم الدعاء اذا ما ينذرون)۔

سُننے والے کان کی ضرورت ہے تاکہ وہ خدا کی بات سُنے نہ کہ ایسے کان کی کہ جن پر گناہ، غفلت اور غرور کے پردے اس طرح پڑے ہوئے ہوں کہ وہ حق بات سُننے کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صہ ۴۲۱۔



Marfat.com

۴۶۔ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ○

۴۷۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۭ
وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا
حٰسِبِيْنَ ○

## ترجمہ

۴۶۔ اگر تیرے پروردگار کا معمولی سا عذاب بھی انہیں چھولے تو وہ چیخ اٹھیں اور کہنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب ظالم تھے۔

۴۷۔ قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے، لہٰذا کسی بھی شخص پر ذرا سی بھی زیادتی نہیں ہوگی، اور اگر کسی نے رائی برابر بھی کوئی نیکی یا برائی کی ہوگی تو ہم اس کو حاضر کردیں گے اور اس کے لیے یہی کافی ہے کہ حساب کرنے والے ہم ہوں گے

## تفسیر

### قیامت میں عدل کے ترازو:

گزشتہ آیات میں بے ایمان لوگوں کے غرور اور بے خبری کی حالت بیان کی گئی تھی۔ زیرِ نظر آیات میں فرمایا گیا ہے: یہ مغرور اور بے خبر لوگ نعمت اور سکون کی حالت میں تو ہرگز خدا کے بندے نہیں بنتے (لیکن) اگر تیرے پروردگار کے عذاب کا ایک ذرہ بھی ان کے دامن کو آلگے۔ تو اس طرح سے وحشت زدہ ہوجائیں اور چیخنے لگیں کہ ہائے افسوس ہم تو سب کے سب ظالم تھے (ولئن مستهم نفحة من عذاب ربك ليقولن يا ويلنا انا كنا ظالمين)۔

مفسرین اور اربابِ لغت کے قول کے مطابق لفظ "نفحة" حقیر یا کم مقدار چیز یا ملائم ہوا کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ لفظ زیادہ تر رحمت و نعمت کی ہواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[1]

تفسیر کشاف کے مطابق "لئن مستهم نفحة ....." میں تین تعبیریں ایسی ہیں کہ جو سب ناچیزی اور کمی کی طرف اشارہ

[1] تفسیر رازی، تفسیر فی ظلال، مفردات راغب آیہ زیر بحث اور مادہ "نفحة" کے ذیل میں۔



Marfat.com

کرتی ہیں۔ "مس" کی تعبیر اور "نفحۃ" کی تعبیر مادۂ لغت کے اعتبار سے نیز وزن اور صیغہ کے لحاظ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دل کے اندھے، سالہا سال تک پیغمبر کی باتیں اور وحی کی منطق سنتے رہتے ہیں مگر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا مگر جس وقت عذاب کا تازیانہ — چاہے وہ کتنا ہی خفیف اور مختصر ہو — ان کی پشت پر لگے گا تو پھر ان کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے اور کہنے لگیں گے کہ "اناکنا ظالمین" — تو کیا عذاب کا تازیانہ کھا کر ہی انہیں بیدار ہونا چاہیئے؟

اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ یہ اضطراری بیداری بھی ان کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگی، اس لیے کہ اگر طوفانِ عذاب رُک جائے اور وہ سکون حاصل کرلیں تو وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگیں گے اور وہی طرزِ عمل اپنا لیں گے۔

٭ ٭ ٭

زیر بحث دوسری آیت قیامت میں دقیق حساب کتاب اور عادلانہ جزا و سزا کی طرف اشارہ کر رہی ہے تاکہ بے ایمان اور ستمگر یہ جان لیں کہ اگر بالفرض دنیا کا عذاب انہیں دامنگیر نہ ہوا تو آخرت کی سزا تو حتمی ہے اور باریک بینی کے ساتھ ان کے تمام اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔

لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: ہم قیامت کے دن عمل کے ترازو نصب کریں گے: (ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ)۔

"قسط" کبھی تو عدم تبعیض اور ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مطلق طور پر عدالت کے معنی میں اور یہاں دوسرا معنی مناسب ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "قسط کا لفظ یہاں پر "موازین" کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یہ ناپ تول کے ترازو ایسے دقیق اور منظم ہیں کہ گویا عین عدالت ہیں[۱]۔

اسی بنا پر ساتھ ہی مزید ارشاد ہوتا ہے: کسی بھی شخص پر وہاں معمولی سا بھی ظلم وستم نہیں ہوگا: (فلا تظلم نفس شیئا)۔

نہ نیکی کرنے والوں کی جزاء میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی بدکاروں کی سزا میں کوئی زیادتی کی جائے گی۔

لیکن ظلم وستم کی اس نفی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حساب کتاب میں باریک بینی نہیں ہوگی بلکہ "اگر رائی کے برابر بھی کسی کا کوئی نیک یا بدکام ہوگا، تو ہم اُسے حاضر کردیں گے" (اور اُسے تول کر دکھائیں گے): (وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینابھا)۔

"اور (عدل کے لیے) اتنی بات ہی کافی ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب کرنے والے ہم خود ہوں گے": (وکفیٰ بنا حاسبین)۔

"خردل[۲]" کالے رنگ کے بہت چھوٹے چھوٹے دانوں والی ایک گھاس ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے پن اور حقیر اور معمولی چیز ہونے میں ضرب المثل ہے۔

اس تعبیر کی ایک نظیر قرآن میں ایک اور جگہ "مثقال ذرۃ" "ایک ذرّہ کا وزن" (ایک بہت ہی چھوٹی سی چیونٹی یا مٹی اور

---

۱: اگرچہ "موازین" جمع ہے اور "قسط" مفرد لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قسط مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں ہوتی لہٰذا کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔

۲: ہمارے ہاں اسے "رائی" کہتے ہیں۔ (مترجم)



Marfat.com

غبار کا ایک چھوٹا سا ذرہ، کے عنوان سے آئی ہے۔ (زلزال - ۷)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چھ موقعوں پر "مثقال ذرۃ" کی تعبیر اور دو موقعوں پر "مثقال حبۃ من خردل" کی تعبیر آئی ہے۔

درحقیقت زیر نظر آیت میں قیامت کے دن کے دقیق حساب و کتاب کے مسئلے پر چھ مختلف تعبیروں کے ساتھ تاکید ہوئی ہے۔

۱۔ لفظ "موازین" وہ بھی جمع کی صورت میں

۲۔ پھر "قسط" کے وصف کا ذکر

۳۔ اس کے بعد ظلم کی نفی پر تاکید "فلا تظلم نفس"

۴۔ اس کے بعد کلمہ "شیئًا" (کوئی بھی چیز) کا استعمال

۵۔ اور اس کے بعد رائی کے دانے کی مثال

۶۔ اور آخر میں "کفی بنا حاسبین" (یہی کافی ہے کہ حساب لینے والے ہم ہوں گے کا جملہ)

یہ سب تاکیدیں اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت کے دن حساب کتاب حد سے زیادہ دقیق اور ہر قسم کے ظلم و ستم سے پاک ہوگا۔

اس بارے میں کہ ناپ تول کے ترازو سے مراد کیا ہے؟ بعض نے تو یہ خیال کیا ہے کہ وہاں اس دنیا کے ترازوؤں کی طرح کے ترازو نصب ہوں گے اور اس بنا پر فرض کر لیا ہے کہ انسان کے اعمال وہاں پر بوجھ اور وزن رکھتے ہوں گے تاکہ وہ ان ترازوؤں میں تولے جانے کے قابل ہوں۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ یہاں پر "میزان" ناپ تول اور وزن کرنے کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کے وزن کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ خود اس کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ تھرمامیٹر (ڈگری کی مقدار معلوم کرنے کا آلہ) بیرومیٹر (ہوا کی رفتار معلوم کرنے کا آلہ) اور اسی طرح دوسرے موازین۔ ہر ایک اسی چیز کے مطابق ہوتا ہے، جسے اس وسیلے اور ذریعے سے ماپنا مطلوب ہوتا ہے۔

احادیث اسلامی میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وزن کرنے کے ترازو انبیاء، آئمہ اور نیک پاک لوگ ہوں گے کہ جن کے نامۂ اعمال میں کوئی تاریک نقطہ ہے ہی نہیں۔[1]

ہم (زیارت میں) پڑھتے ہیں:

السلام علی میزان الاعمال

اعمال کے ترازو پر سلام ہے۔

(اس موضوع کی مزید تفصیل چھٹی جلد کے صـ ۸۹ ـــــ پر دیکھیے)

یہ بھی ممکن ہے کہ "موازین" کا ذکر جمع کی صورت میں (کہ جو میزان کی جمع ہے) اسی بات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ مردان حق

[1] بحار الانوار، ج ۷، صـ ۲۵۲ (اشاعت جدید)۔



Marfat.com

میں سے ہر ایک انسان کے اعمال کے لیے کسی نہ کسی ناپ تول کی میزان ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ سب کے سب ممتاز حیثیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی اُن میں سے ہر ایک کا ایک خاص امتیاز بھی ہے کہ جو اس خاص حصّے کی ناپ تول کے لیے ترازو یا نمونہ ہے دوسرے لفظوں میں جو شخص جتنی مقدار میں اُن سے شباہت رکھتا ہوگا اور صفات و اعمال کے لحاظ سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگا، اسی قدر اس کا وزن بوجھل ہوگا۔ جس قدر وہ ان بزرگوں سے دُور اور اُن سے مختلف ہوگا، اتنا ہی ہلکا وزن رکھنے والا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

۴۸۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

۴۹۔ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝

۵۰۔ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝

## ترجمہ

۴۸۔ ہم نے موسیٰ و ہارون کو فرقان (حق کو باطل سے جُدا کرنے کا وسیلہ) نور اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت کا ذریعہ عطا فرمایا۔

۴۹۔ وہی (پرہیزگار) کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں ڈرتے ہیں اور قیامت کا خوف رکھتے ہیں۔

۵۰۔ اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے، جسے ہم نے (تم پر) نازل کیا ہے۔ تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو؟

## تفسیر

### انبیاؑ کی کچھ داستان:

ان آیات میں اور ان کے بعد انبیاؑ کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں کہ جن میں بہت سے تربیتی نکات ہیں۔ ان حالات سے پیغمبر اسلامؐ کی نبوّت کے بارے میں گزشتہ بحثوں اور مخالفین کے ساتھ ان کے مقابلے اور مشکلات، زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ ان میں بہت سے مشترک پہلو موجود ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے موسیٰ و ہارون کو "فرقان" یعنی حق کو باطل سے جُدا کرنے کا ذریعہ، نور اور پرہیزگاروں



Marfat.com

کے لیے نصیحت عطا کی: (ولقد اٰتینا موسٰی و ھارون الفرقان وضیاءً و ذکرًا للمتقین)۔

"فرقان" دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو حق کو باطل سے جُدا کر دے اور ان دونوں کی پہچان کا ذریعہ ہو۔ یہ کہ اس سے مراد کیا ہے۔ تو علمانے اس کے لیے متعدد تفسیریں بیان کی ہیں:

بعض نے تو اس سے مراد تورات لی ہے۔

بعض نے اسے بنی اسرائیل کے لیے دریا کا شق ہو جانا سمجھا ہے کہ جو حق کی عظمت اور موسیٰ کی حقانیت کی واضح نشانی تھی۔

جبکہ بعض نے ان تمام دلائل اور سارے معجزات کہ جو موسیٰ و ہارون کو دیئے گئے تھے، کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ فرقان "تورات" کی طرف بھی اشارہ ہو، اور موسیٰ کے تمام معجزات و دلائل کی طرف بھی اشارہ ہو۔

نیز تمام آیات میں "فرقان" کا کبھی تو خود "قرآن" پر اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً:

تبارک الذی نزل الفرقان علٰی عبدہ لیکون للعالمین نذیرًا

بزرگ اور برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ سارے جہان والوں کو ڈرانے والا ہو۔ (فرقان - ۱)

کبھی اُن معجزانہ کامیابیوں پر۔ اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کو حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ جنگ بدر کے بارے میں "یوم الفرقان" فرمایا ہے۔ (انفال - ۴۱)

باقی رہا لفظ "ضیاء" تو وہ نور اور روشنی کے معنی میں ہے کہ جو کسی ذات کے اندر سے پیدا ہو اور مسلمہ طور پر قرآن، تورات اور انبیاءؑ کے معجزات اسی طرح کے ہیں۔[۱]

"ذکر" ہر وہ چیز ہے کہ جو انسان کو غفلت اور بے خبری سے دُور رکھے اور یہ بھی آسمانی کتابوں اور خدائی معجزات کے واضح آثار میں سے ہے۔

ان تینوں تعبیروں کو یکے بعد دیگرے بیان کرنا، گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لیے پہلے "فرقان" کا محتاج ہے۔ یعنی دوراہے یا چوراہے پر کھڑا ہوا اصلی راستے کو معلوم کرے۔ جب وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کا راستہ معلوم کرلے تو پھر راستہ چلتے چلتے کبھی رکاوٹ بھی پیش آجاتی ہے۔ ایسی رکاوٹوں میں سب سے اہم غفلت ہے۔ لہذا کسی ایسے وسیلے اور ذریعے کا محتاج ہے کہ جو اُسے مسلسل خبردار کرتا رہے، یاد دلاتا رہے اور ذکر کرتا رہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "فرقان" معرفہ کی صورت میں آیا ہے اور "ضیاء" اور "ذکر" نکرہ کی صورت میں ہے اور اس کا اثر متقین اور پرہیزگاروں کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ معجزات اور پیامِ آسمانی تو سب کے لیے راستہ واضح کرتے ہیں لیکن سب لوگ ایسے نہیں ہوتے کہ جو مصمم ارادہ کرلیں اور ضیاء و ذکر سے استفادہ کریں، بلکہ

---

[۱] ضیاء کے معنی اور نور سے اس کے فرق کے بارے میں سورہ یونس آیہ ۵ کے ذیل میں ہم نے جلد ۸ میں مزید وضاحت کی ہے۔



Marfat.com

وہ صرف وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں، اور تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت پرہیزگاروں کا اس طرح تعارف کراتی ہے: وہ وہی لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار سے غیب میں اور پنہاں طور پر ڈرتے ہیں: (الذین یخشون ربھم بالغیب)۔

اور قیامت کے دن کا خوف رکھتے ہیں: (وھم من الساعة مشفقون)۔

لفظ "غیب" کی یہاں پر دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ پروردگار کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ خدا نظروں سے پوشیدہ اور پنہاں ہے، وہ عقل کی دلیل کی بنا پر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کی پاک ذات کے سامنے مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ پرہیزگار لوگ صرف معاشرے کے سامنے ہی خدا کا خوف نہیں رکھتے۔ بلکہ اپنی خلوت گاہوں میں بھی اسے حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا سے خوف کے لیے لفظ "خشیت" استعمال ہوا ہے۔ اور قیامت کے بارے میں "اشفاق" کی تعبیر آئی ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ خوف کے معنی میں ہیں لیکن کتاب مفردات میں راغب کے قول کے مطابق "خشیت" اس حال میں بولا جاتا ہے کہ جب خوف احترام و تعظیم کے ساتھ ہو۔ اس خوف کی مانند کہ جو ایک بیٹا اپنے والد بزرگوار سے رکھتا ہے۔ اس بنا پر پرہیزگاروں کا خدا سے خوف معرفت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔

لیکن "اشفاق" کا لفظ اُس تعلق اور توجہ کے معنی میں ہے کہ جو خوف سے ملا ہوا ہو۔ مثلاً یہ تعبیر کبھی اولاد اور دوستوں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے کہ انسان جن سے تعلق اور دوستی رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ آفات و تکلیف میں گرفتار ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں ڈرتا رہتا ہے۔

حقیقت میں پرہیزگار لوگ قیامت کے دن سے بہت لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں کیونکہ وہ جزاء اور خدا کی رحمت کا مرکز ہے لیکن اس کے باوجود معاملۂ حساب و کتاب کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

البتہ بعض اوقات یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

آخری زیر بحث آیت میں قرآن کا گزشتہ کتابوں سے ایک موازنہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ ایک مبارک ذکر ہے کہ جسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے: (وھذا ذکر مبارک انزلناہ)۔

کیا تم اس کا انکار کرتے ہو: (افانتم لہ منکرون)۔

انکار کیوں کرتے ہو؟ یہ تو ذکر ہے اور تمہارے لیے بیداری و آگاہی اور یاد آوری کا باعث ہے۔ یہ تو مرکز برکت ہے۔ اس میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور یہ تمام کامیابیوں اور خوش بختیوں کا سرچشمہ ہے۔

کیا ایسی کتاب سے بھی انکار کی گنجائش ہے؟ اس کی حقانیت کی دلیلیں خود اسی کے اندر پوشیدہ ہیں، اس کی نورانیت آشکار ہے



Marfat.com

اور اس کے راستے پر چلنے والے سعادت مند اور کامیاب ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ یہ قرآن کس حد تک آگاہی کا سبب اور برکت کا موجب ہے، یہی بات کافی ہے کہ ہم قرآن کے نزول سے جزیرہ عرب میں رہنے والوں کی حالت کو دیکھیں۔ کہ وہ وحشت و جہالت، فقر و فاقہ، بدبختی اور پراگندگی میں زندگی بسر کرتے تھے ــــ اور ان کی نزول قرآن کے بعد کیا کیفیت ہو گئی۔ بعد میں وہ دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ بن گئے ــــ اسی طرح دوسری اقوام کی ان کے درمیان قرآن کے ورود سے پہلے اور بعد کی وضع و کیفیت کو دیکھیں۔

❊ ❊ ❊

۵۱۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ○

۵۲۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ

۵۳۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ○

۵۴۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

۵۵۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ○

۵۶۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

۵۷۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ○

۵۸۔ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ○

## ترجمہ

۵۱۔ ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی رشد و ہدایت (کا ذریعہ) دے دیا تھا اور ہم اس (کی اہلیت) سے آگاہ تھے۔

۵۲۔ جس وقت اُس نے اپنے باپ (چچا آزر) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ بے رُوح مجسمے کہ جن کی تم ہمیشہ پرستش کرتے رہتے ہو، کیا ہیں؟

۵۳۔ (انھوں نے) کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۵۴۔ (ابراہیم نے) کہا کہ یقیناً تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی کھلی گمراہی میں پڑے رہے ہو۔



Marfat.com

۵۵۔ (انہوں نے) کہا کہ کیا تو حق بات لے کر ہمارے پاس آیا ہے، یا مذاق کر رہا ہے؟

۵۶۔ (ابراہیم نے) کہا (میں تو کامل طور پر حق لے کر آیا ہوں کہ) تمہارا پروردگار تو وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے کہ جس نے اُن کو پیدا کیا ہے اور میں بھی اس بات کا گواہ ہوں۔

۵۷۔ خدا کی قسم میں تمہارے جانے کے بعد تمہاری غیبت میں تمہارے بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناؤں گا۔

۵۸۔ آخر کار (ایک مناسب موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے) ان کے بڑے بت کے سوا۔ ان سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ وہ اس کے پاس آئیں (اور وہ بڑا بُت ان سے حقیقت بیان کرے)۔

# تفسیر

## ابراہیمؑ بتوں کی نابودی کا منصوبہ بناتے ہیں:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں ــ سولہ پیغمبروں کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور اس سورہ کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ یہ انبیاءؑ کے بارے میں ہے۔ گزشتہ آیات میں موسیٰؑ و ہارونؑ کی رسالت کی طرف کچھ اشارہ ہوا ہے۔ زیر بحث آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور بُت پرستوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی کا ایک اہم حصہ بیان ہو رہا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ ہم نے رشد و ہدایت کا وسیلہ پہلے سے ابراہیمؑ کو دے دیا تھا اور ہم اس کی اہلیت سے آگاہ تھے: (ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عالمین)۔

"رشد" اصل میں مقصد تک راہ پانے کے معنی میں ہے اور یہاں ممکن ہے حقیقتِ توحید کی طرف اشارہ ہو کہ ابراہیمؑ بچپن ہی میں اُس سے آگاہ ہو گئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کے وسیع معنی کے لحاظ سے، ہر قسم کی خیر و صلاح کی طرف اشارہ ہو۔

"کنا بہ عالمین" کا جملہ ان سب نعمات کو حاصل کرنے کے لیے ابراہیمؑ کی صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ درحقیقت خدا کوئی نعمت کسی کو بلا وجہ نہیں دیتا۔ یہ صلاحیتیں اور لیاقتیں ہی ہیں کہ جن کی بناء پر نعماتِ الٰہی حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ مقامِ نبوّت بھی ایک مقام نعمت و عطا ہے۔

* * *

اس کے بعد حضرت ابراہیم کے ایک اہم کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ابراہیم کا یہ رشد و ہدایت اس وقت ظاہر ہوا کہ جب اُس نے اپنے باپ (یہ ان کے چچا آزر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرب بعض اوقات چچا کو بھی "اب" کہتے ہیں) اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مورتیاں کیا ہیں کہ جن کے تم گردیدہ ہو اور رات دن ان کا طواف کرتے ہو اور اُن سے دستبردار نہیں ہوتے: (اذ قال لابیہ وقومہ ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون)۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ الفاظ کہہ کر ان بتوں کی کہ جو اُن کی نظروں میں انتہائی عظمت رکھتے تھے، شدت سے تحقیر و تذلیل کی۔



Marfat.com

پہلے "ماھذہ" (یہ کیا ہیں؟) کہا۔[1] دوسرے: "تماثیل" کی تعبیر استعمال کی کیونکہ "تماثیل" "تمثال" کی جمع ہے اور یہ تصویر یا بے رُوح مجسمہ کے معنی میں ہے (بُت پرستی کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شروع شروع میں یہ تصاویر اور مجسمے انبیا اور علماء کی یادگار کے طور پر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسے مقدس سمجھے جانے لگے کہ معبود بن گئے)۔

"انتم لھا عاکفون" میں "عکوف" احترام کے ساتھ ملی ہوئی خدمت کے معنی میں ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے بتوں کے ساتھ ایسی دل بستگی پیدا کر لی تھی اور ان کے آستانے پر اس طرح سر جھکاتے تھے اور ان کے گرد چکر لگاتے تھے کہ گویا ہمیشہ کے لیے ان کے ملازم اور خدمت گار ہیں۔

ابراہیمؑ کی یہ گفتگو درحقیقت بُت پرستی کے ابطال کے لیے ایک واضح اور روشن استدلال ہے کیونکہ بتوں میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ یہی مجسمہ و تمثال ہی ہے۔ باقی تخیل ہے اور توہم ہے اور خیال۔ کونسا عقلمند انسان خود کو اس بات کی اجازت دے گا کہ وہ ایک چھوٹے سے پتھر اور لکڑی کے لیے اس قدر عظمت، احترام اور قدرت کا قائل ہو جائے۔ آخر وہ انسان کہ جو خود اشرف مخلوقات ہے اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کے سامنے اس طرح سے خضوع و خشوع کیوں کرے اور اپنی مشکلات کا حل اس سے کیوں طلب کرے؟

⁂

لیکن بُت پرست درحقیقت اس منہ بولتی اور واضح منطق کا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کی ذمہ داری اپنے بڑوں کے سر تھوپ دیں۔ لہٰذا انہوں نے کہا: ہم نے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے ہیں اور ہم اپنے بڑوں کی سُنّت کو پُورا کر رہے ہیں: (قالوا وجدنا اٰبآءنا لھا عابدین)۔

چونکہ صرف بڑوں کی سُنّت اور روش کسی مشکل کو حل نہیں کرتی اور ہمارے پاس اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ بزرگان گزشتہ آئندہ آنے والی نسلوں سے زیادہ عالم اور زیادہ عاقل تھے۔ بلکہ اکثر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے فوراً انہیں جواب دیا: تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی یقیناً واضح گمراہی میں تھے: (قال لقد کنتم انتم واٰباؤکم فی ضلال مبین)۔

⁂

یہ تعبیر کہ جس میں بہت سی تاکیدیں موجود ہیں اور بڑی قاطعیت رکھتی ہیں، اس بات کا سبب بنی کہ بت پرست کچھ ہوش میں آئیں اور تحقیق کی جانب مڑیں۔ ابراہیم کی طرف رُخ کر کے کہنے لگے: کیا سچ مچ تو کوئی حق بات لے کر آیا ہے یا مذاق کر رہا ہے: (قالوا اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین)۔

کیونکہ وہ لوگ جنہیں بتوں کی پرستش کی عادت پڑ چکی تھی اور اسے ایک قطعی واقعیت سمجھتے تھے، یہ باور نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ بُت پرستی کی مخالفت کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے تعجب کے ساتھ یہ سوال کیا۔

لیکن ابراہیمؑ نے صراحت کے ساتھ انہیں جواب دیا: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سنجیدہ، محکم اور عین واقعیت ہے کہ تمہارا

---

[1] "ما" اس قسم کے موقعوں پر عموماً غیر عاقل کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اسم اشارہ قریب بھی ایسے موقعوں پر ——— ایک قسم کی تحقیر کو ظاہر کرتا ہے، ورنہ دور کا اشارہ مناسب تھا۔



Marfat.com

پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے : ( قال بل ربکو رب السماوات والارض)۔
وہی خدا کہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور خود بھی اس عقیدہ کے گواہوں میں سے ہوں: ( الذی فطرھن وانا علی ذالکو من الشاھدین)۔
حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اس دو ٹوک گفتگو سے یہ واضح کیا : کہ وہ ذات ہی پرستش کے لائق ہے کہ جو ان سب کی زمین کی اور تمام موجودات کی خالق ہے لیکن پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے کہ جو خود ایک ناچیز مخلوق ہیں ، پرستش کے لائق نہیں ہیں۔ خاص طور پر "وانا علیٰ ذالکو من الشاھدین" کے جملے نے یہ ثابت کیا کہ صرف میں ہی نہیں ہوں کہ جو اس حقیقت پر گواہ ہوں بلکہ سب فہمیدہ ، آگاہ اور صاحبانِ علم — کہ جنہوں نے اندھی تقلید کے رشتوں کو توڑ دیا ہے — اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

❊ ❊ ❊

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یہ بات سو فی صد صحیح اور محکم ہے اور وہ اس عقیدہ پر ہر مقام تک قائم ہیں اور اس کے نتائج و لوازم کو — جو کچھ بھی ہوں انہیں — جان و دل سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، مزید کہتے ہیں : مجھے خدا کی قسم، جس وقت تم یہاں پر موجود نہیں ہو گے اور یہاں سے کہیں باہر جاؤ گے . تو میں تمہارے بتوں کو نابود کرنے کا منصوبہ بناؤں گا: ( وتاللہ لاکیدن اصنامکو بعدان تولوا مدبرین)۔
" اکیدن" "کید" کے مادہ سے لیا گیا ہے کہ جو پوشیدہ منصوبہ اور مخفیانہ چارہ جوئی کے معنی میں ہے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ انہیں صراحت کے ساتھ سمجھا دیں ، کہ آخر کار میں اسی موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں نابود اور درہم برہم کر دوں گا .
لیکن شاید ان کی نظر میں بتوں کی عظمت اور رعب اس قدر تھا کہ انہوں نے اس کو کوئی سنجیدہ بات نہ سمجھا اور کوئی ردّ عمل ظاہر نہ کیا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قوم و ملت کے مقدسات کے ساتھ — ایسا کھیل کھیلے جب کہ ان کی حکومت بھی سو فی صد ان کی حامی ہے، وہ کس برتے اور کس طاقت کے بل بوتے پر ایسا کرے گا ؟
اِس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ جملہ اپنے دل میں کہا تھا یا بعض مخصوص افراد سے کہا تھا ، کسی لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ یہ بات کامل طور سے ظاہر آیت کے خلاف ہے۔
اِس کے علاوہ بعد کی چند آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ بُت پرستوں کو ابراہیمؑ کی یہ بات یاد آ گئی اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ ایک جوان بتوں کے خلاف ایک سازش کی بات کرتا ہے۔

❊ ❊ ❊

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن جب کہ بُت خانہ خالی پڑا تھا اور بُت پرستوں میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھا . اپنے منصوبے کو عملی شکل دے دی۔
اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق بت پرست ہر سال ایک مخصوص دن بُتوں کی عید مناتے تھے۔ طرح طرح کے کھانے بُت خانے میں چڑھا کر، سب کے سب اکٹھے شہر سے باہر چلے جایا کرتے تھے اور شام ڈھلے واپس بُت خانہ میں آتے تھے تاکہ — وہ کھانے کھائیں کہ جو اُن کے عقیدے کے مطابق متبرک ہو گئے تھے۔



Marfat.com

حضرت ابراہیمؑ سے بھی انہوں نے تقاضا کیا کہ اُن کے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے بیماری کا عذر کیا اور ان کے ساتھ نہ گئے۔

بہر حال وہ — بغیر اس کے کہ اس کام کے خطرات سے ڈرتے یا جو طوفان اِس کام کے بعد کھڑا ہو گا، اس کا کوئی خوف دل میں لاتے — مردانہ وار میدان میں کُود پڑے اور بڑی شجاعت سے ان تراشے ہوئے خداؤں سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے کہ جن کے اتنے متعصب اور نادان عقیدت مند تھے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سوائے ان کے بڑے بُت کے سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا: (فجعلهم جذاذاً الا كبيراً لهم)۔

مقصد ان کا یہ تھا کہ "شاید بُت پرست لوٹ کر اس کے پاس آئیں اور وہ بھی ساری باتیں اُن سے کہے (لعلهم اليه يرجعون)"۔[1]

# چند اہم نکات

**۱۔ بُت پرستی کی مختلف شکلیں:** یہ ٹھیک ہے کہ ہم بُت پرستی کے لفظ سے زیادہ تر پتھر اور لکڑی کے بتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن ایک لحاظ سے بت اور بت پرستی وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو غیر خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ — خواہ وہ کسی بھی شکل و صورت میں ہو — پر محیط ہے اور مشہور و معروف حدیث کے مطابق کہ:

كلما شغلك عن الله فهو صنمك

جو چیز بھی انسان کو اپنی طرف مشغول اور خدا سے دُور کرے، وہ اس کا بُت ہے۔

ایک حدیث میں اصبغ بن نباتہ سے کہ جو علی علیہ السلام کے مشہور اصحاب میں سے ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ:

ان عليا مر بقوم يلعبون الشطرنج فقال: ما هذه التماثيل التي انتم لها عاكفون؟ لقد عصيتم الله ورسوله

امیر المومنین علیہ السلام کچھ لوگوں کے قریب سے گزرے۔ وہ شطرنج کھیل رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: یہ مجسمے (اور بت) کہ جن کے ساتھ تم مشغول ہو گئے ہیں؟ تم خدا کے بھی نافرمان ہو اور اس کے رسول کے بھی۔[2]

* * *

---

[1] بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "الیہ" کا مرجع خود حضرت ابراہیمؑ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بڑا بُت ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہ جو کچھ مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ ان کا بڑا تھا، ممکن ہے کہ یہ ظاہری بڑے ہونے کی طرف اشارہ ہو یا بے ہودہ بت پرستوں کی نگاہ میں اس کے زیادہ احترام کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔



Marfat.com

۲۔ **بُت پرستوں کی گفتگو اور ابراہیمؑ کا جواب** : یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بُت پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں افراد کی کثرت کا بھی ذکر کیا اور طولِ زمانہ کا بھی۔ وہ کہنے لگے : ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی دین پر پایا ہے۔
انہوں نے بھی دونوں حصّوں کا جواب دیا : تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی، ہمیشہ واضح گمراہی میں رہے ہیں۔
یعنی عاقل انسان کہ جو استقلالِ فکری رکھتا ہو ہرگز ان اوہام کا پابند نہیں ہوتا۔ نہ ہی کسی رسم اور سنت کے طرفداروں کی کثرت کو اس کی درستی کی دلیل سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کے ہمیشہ ہوتے رہنے کو اس کی حقانیت کی دلیل جانتا ہے۔

۵۹۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۶۰۔ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ○ؕ

۶۱۔ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ○

۶۲۔ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ؕ

۶۳۔ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○

۶۴۔ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ۙ

۶۵۔ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ○

۶۶۔ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا
وَّلَا يَضُرُّكُمْ ○ؕ

۶۷۔ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

## ترجمہ

۵۹۔ انہوں نے کہا کہ جس نے بھی ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ وہ قطعی طور ظالم و ستمگر ہے (اور اسے سزا ملنی چاہیئے)

۶۰۔ (کچھ نے) کہا : ہم نے ایک جوان کو سنا ہے کہ جو بتوں کی (مخالفت) کی بات کرتا تھا، اس کا نام ابراہیم ہے۔

۶۱۔ (بعض نے) کہا : اُسے لوگوں کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ گواہی دیں۔



Marfat.com

۶۲۔ (جب انہوں نے ابراہیم کو حاضر کیا تو) اُس سے کہا : اے ابراہیم کیا تُو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے ؟

۶۳۔ تو اس نے کہا بلکہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہوگا۔ انہی سے پُوچھ لو اگر یہ بات کرتے ہوں۔

۶۴۔ وہ اپنے ضمیر کی طرف لوٹے (اور اپنے آپ سے) کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ تم خود ہی ظالم ہو۔

۶۵۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا رُخ موڑ لیا (اور اپنے ضمیر کی آواز کو بالکل بھلا دیا اور کہنے لگے) تُو تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔

۶۶۔ (ابراہیمؑ نے) کہا : کیا تم خدا کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان (کہ جو تمہیں ان سے نفع کی کوئی اُمید ہو یا کسی نقصان کا خوف ہو)۔

۶۷۔ تُف ہے تم پر بھی اور اس پر بھی جسے خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو کیا تم سوچتے نہیں ہو (اور کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے)۔

# تفسیر

## ابراہیمؑ کی دندان شکن دلیل :

آخر وہ عید کا دن ختم ہوگیا اور بُت پرست خوشی مناتے ہوئے شہر کی طرف پلٹے اور سب بُت خانے کی طرف گئے تاکہ بُتوں سے اظہارِ عقیدت بھی کریں اور وہ کھانا بھی کھائیں کہ جو اُن کے گمان کے مطابق بُتوں کے پاس رکھے رہنے سے بابرکت ہوگیا تھا۔ جونہی وہ بُت خانے کے اندر پہنچے تو ایک ایسا منظر دیکھا کہ اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ آباد بُت خانہ کے بجائے بتوں کا ایک ڈھیر تھا ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے۔ وہ تو چیخنے چلانے لگے ؛ یہ بلا اور مصیبت ہمارے خداؤں کے سر پر کون لایا ہے" : (قالوا من فعل هذا بالهتنا)۔[1]

"یقیناً جو کوئی بھی تھا ظالموں میں سے تھا" : (انه لمن الظالمین)۔

اُس نے ہمارے خداؤں پر بھی ظلم کیا ہے ، ہماری قوم اور معاشرے پر بھی اور خود اپنے اُوپر بھی کیونکہ اُس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو بُتوں کے بارے میں ابراہیمؑ کی دھمکیوں سے آگاہ تھے اور ان جعلی خداؤں کے بارے میں ان کی اہانت آمیز باتوں کو جانتے تھے ، کہنے لگے : ہم نے سُنا ہے ایک جوان بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا اور انہیں بُرا بھلا کہتا تھا ، اس کا نام ابراہیم ہے : (قالوا سمعنا فتی یذکرهم یقال له ابراهیم)۔[2]

---

[1] بعض مفسرین لفظ "من" کو یہاں موصولہ سمجھتے ہیں لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرنے سے کہ جو سوال کا جواب ہے ، اس طرح نظر آتا ہے کہ "من" یہاں استفہامیہ ہے۔

[2] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ، بُت پرست اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ وہ یہ کہیں کہ وہ جوان بتوں کو بُرا بھلا کہتا تھا۔ بس اتنا کہا کہ وہ بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔



Marfat.com

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اس وقت مکمل طور پر جوان تھے اور احتمال یہ ہے کہ ان کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں تھی اور یہ بھی درست ہے کہ جوانمردی کی تمام خصوصیات ، شجاعت ، شہامت ، صراحت اور قاطعیت ان کے وجود میں جمع تھیں لیکن اس طرح سے بات کرنے سے بُت پرستوں کی مراد یقیناً تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ ابراہیمؑ نے یہ کام کیا ہے، کہتے ہیں کہ ایک جوان ہے کہ جسے ابراہیم کہتے ہیں، وہ اس طرح کہتا تھا . . . . یعنی ایک ایسا شخص کہ جو بالکل گمنام اور ان کی نظر میں بے حیثیت ہے۔

اصولاً معمول یہ ہے کہ جب کسی جگہ کوئی جُرم ہو جائے تو اُس شخص کو تلاش کرنے کے لیے کہ جس سے وہ جُرم سرزد ہوا ہو ان سے دشمنی رکھنے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے اور اس ماحول میں ابراہیمؑ کے سوا مسلماً کوئی شخص بتوں کے ساتھ دست و گریبان نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا تمام افکار انہی کی طرف متوجہ ہو گئے اور بعض نے کہا: "اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو جاؤ اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ لوگ کہ جو پہچانتے ہیں اور خبر رکھتے ہیں گواہی دیں": ( قالوا فأتوا به على اعين الناس لعلهم يشهدون )۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ کی سزا کے منظر کا مشاہدہ ہے نہ کہ ان کے مجرم ہونے کی شہادت۔ لیکن بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیادہ تر بازپرس کا پہلو رکھتی ہیں، اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ "لعل" (شاید) کی تعبیر بھی دوسرے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ اگر لوگ سزا کا منظر دیکھنے کے لیے آئیں تو یقیناً اسے دیکھیں گے اور اُس کا مشاہدہ کریں گے۔ ایسے موقع پر شاید کی گنجائش نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

منادی کرنے والوں نے شہر میں ہر طرف یہ منادی کی کہ جو شخص بھی ابراہیمؑ کی بُتوں سے دشمنی اور ان کی بدگوئی کے بارے میں آگاہ ہے، حاضر ہو جائے۔ جلد ہی جو آگاہ تھے وہ لوگ بھی اور تمام دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تاکہ دیکھیں کہ اس ملزم کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایک عجیب و غریب شور و غلغلہ لوگوں میں پڑا ہوا تھا، چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ایک ایسا جُرم جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ایک آشوب طلب جوان نے شہر میں برپا کر دیا تھا۔ اِس کام نے اس علاقے کے لوگوں کی مذہبی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

آخر کار عدالت لگی اور بازپرس ہوئی۔ زعمائے قوم وہاں جمع ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ خود نمرود اس عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔

پہلا سوال جو اُنہوں نے ابراہیمؑ سے کیا وہ یہ تھا: "اُنہوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا تُو نے ہی ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے": ( قالوا ءانت فعلت هٰذا بالهتنا يا ابراهيم )۔

وہ اِس بات تک کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ کہیں کہ تُو نے ہمارے خداؤں کو توڑا ہے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بلکہ صرف یہ کہا کہ کیا تُو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟

❊ ❊ ❊

ابراہیمؑ نے ایسا جواب دیا کہ وہ خود گھر گئے اور ایسے گھرے کہ نکلنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ "ابراہیم نے کہا: یہ کام اس بڑے بُت نے کیا ہے، ان سے پوچھو اگر یہ بات کرتے ہوں": ( قال بل فعله كبيرهم هٰذا فسئلوهم ان كانوا ينطقون )۔



Marfat.com

جرائم کی تفتیش کے اصول یہ ہیں کہ جس کے پاس آثارِ جرم یا آلۂ جرم ملے وہ ملزم ہے (مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے وہ کلہاڑا بڑے بُت کی گردن میں ڈال دیا تھا)

اصلاً ، تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ تم اپنے بڑے خدا کو ملزم قرار کیوں نہیں دیتے؟ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ وہ چھوٹے خداؤں پر غضبناک ہو گیا ہو یا اس نے انہیں اپنا آیندہ کا رقیب فرض کرتے ہوئے ان سب کا حساب ایک ہی ساتھ پاک کر دیا ہو؟

چونکہ اس تعبیر کا ظاہر مفسرین کی نظر میں واقعیت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور چونکہ ابراہیمؑ پیغمبر ہیں اور معصوم ہیں اور وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتے ۔ لہذا انہوں نے اس جملے کی تفسیر میں مختلف مطالب بیان کیے ہیں، جو مطلب ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ :

ابراہیمؑ نے قطعی طور پر اس عمل کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا ، لیکن تمام قرائن اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس بات سے کوئی سنجیدہ اور مستقل قصد نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ بُت پرستوں کے مسلمہ عقائد کو، جو کہ خرافاتی اور بے بنیاد تھے ، ان کے منہ پر دے ماریں اور اُن کا مذاق اُڑائیں اور انہیں یہ سمجھائیں کہ یہ بے جان پتھر اور لکڑیاں اس قدر حقیر ہیں کہ ایک جملہ تک بھی منہ سے نہیں نکال سکتیں، کہ اپنی عبادت کرنے والوں سے مدد طلب کر لیں، چہ جائیکہ وہ یہ چاہیں کہ ان کی مشکلات حل کر دیں ۔

اس تعبیر کی نظیر ہمارے روزمرہ کے محاورات میں بہت زیادہ ہے کہ مدِ مقابل کی بات کو باطل کرنے کے لیے، اسی کے مسلمات کو ، امر یا خبر یا استفہام کی صورت میں اس کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ مغلوب ہو جائے اور یہ بات کسی طرح بھی جھوٹ نہیں ہوتی ۔ " **جھوٹ وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ نہ ہو** "

اس روایت میں کہ جو کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے ، یہ بیان ہوا ہے کہ :

انما قال بل فعله کبیرهم ارادة الاصلاح ، و دلالة علی انهم لا یفعلون ، ثم قال واللّٰه ما فعلوه وما کذب :

" ابراہیم نے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ ان کے افکار کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور انہیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ایسے کام بُتوں سے نہیں ہو سکتے ۔"

اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا :

خدا کی قسم بتوں نے یہ کام نہیں کیا تھا اور ابراہیمؑ نے بھی جھوٹ نہیں بولا ۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس مطلب کو ایک جملۂ شرطیہ کی صورت میں ادا کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر یہ بت بات کریں تو یہ کام انہوں نے کیا ہے ، اس تفسیر کے مضمون کی ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے ۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ، کیونکہ جملۂ شرطیہ (ان کانوا ینطقون) سوال کرنے کے لیے (فاسئلوهم) ایک قید ہے ، (بل فعله کبیرهم) کے جملہ کے لیے نہیں ہے (غور کیجئے گا)

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ عبارت یہ ہے کہ اُن بتوں سے کہ جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں



Marfat.com

یہ سوال ہونا چاہیئے کہ یہ مصیبت اُن کے سر پر کس نے ڈالی ہے نہ کہ بڑے بُت سے (سوال، کیونکہ "ھُم" کی ضمیر اور اسی طرح "ان کانوا ینطقون" سب جمع کی صُورت میں ہیں اور یہ پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہے[1]

ابراہیم کی باتوں نے بُت پرستوں کو ہلا کر رکھ دیا، ان کے سوئے ہوئے وجدان کو بیدار کیا اور اُس طوفان کی مانند کہ جو آگ کی چنگاریوں کے اُوپر پڑی ہوئی بہت سی راکھ کو ہٹا دیتا ہے اور اس کی چمک کو آشکار کر دیتا ہے۔ ان کی فطرتِ توحیدی کو تعصب، جہالت اور غرور کے پردوں کے پیچھے سے آشکار وظاہر کر دیا

زود گزر لمحے میں وہ موت کی سی ایک گہری نیند سے بیدار ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وہ اپنے وجدان اور فطرت کی طرف پلٹے اور خود اپنے آپ سے کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ ظالم تو تم خود ہی ہو: (فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون)[2]

تم نے تو خود اپنے اُوپر بھی ظلم وستم کیا ہے اور اُس معاشرے کے اُوپر بھی جس کے ساتھ تمہارا تعلق ہے اور نعمتوں کے بخشنے والے پروردگار کی ساحت مقدس میں بھی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے ابراہیم پر ظالم ہونے کا اتہام لگایا تھا لیکن اب انہیں یہاں معلوم ہو گیا کہ اصلی اور حقیقی ظالم تو وہ خود ہیں۔

اور واقعاً ابراہیمؑ کا اصل مقصد بتوں کے توڑنے سے یہی تھا۔ مقصد تو بت پرستی کی فکر اور بُت پرستی کی رُوح کو توڑنا تھا۔ ورنہ بتوں کے توڑنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہٹ دھرم بُت پرست اُن سے زیادہ اور اُن سے بھی بڑے اور بنا لیتے اور ان کی جگہ پر رکھ دیتے۔ جیسا کہ نادان، جاہل اور متعصب اقوام کی تاریخ میں اس مسئلے کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔

ابراہیمؑ اِس حد تک کامیاب ہوئے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کے ایک بہت ہی حساس اور ظریف مرحلہ کو ایک نفسیاتی طوفان بپا کر کے طے کر لیا اور وہ تھا سوئے ہوئے وجدانوں کو بیدار کرنا۔

لیکن افسوس! کہ جہالت وتعصب اور اندھی تقلید کا زنگ اس سے کہیں زیادہ تھا کہ وہ توحید کے اِس ہیرو کی صیقل بخش پکار سے کُلی طور پر دُور ہو جاتا۔

افسوس کہ یہ روحانی اور مقدس بیداری زیادہ دیر تک نہ رہ سکی اور ان کے آلودہ اور تاریک ضمیر میں، جہالت اور شیطانی قوتوں کی طرف سے اس نورِ توحید کے خلاف قیام عمل میں آگیا اور ہر چیز اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئی۔ قرآن کتنی لطیف تعبیر پیش کر رہا ہے: اس کے بعد وہ اپنے سر کے بل اُلٹے ہو گئے: (ثم نکسوا علی رؤسھم)۔

اور اس غرض سے کہ اپنے گونگے اور بے زبان خداؤں کی طرف سے کوئی عذر پیش کریں، انہوں نے کہا: "تو تو جانتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کرتے": (لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون)۔

---

[1] علاوہ ازیں ظاہر یہ ہے کہ "کبیرھم" کی ضمیر باقی ضمیروں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

[2] بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ (فرجعوا الی انفسھم) سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے اور ایک دوسرے کو ملامت وسرزنش کرنے لگے لیکن جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔



Marfat.com

یہ تو ہمیشہ چُپ رہتے ہیں اور خاموشی کے رُعب کو نہیں توڑتے۔

اور اس تراشے ہوئے عذر کے ساتھ اُنہوں نے یہ چاہا کہ بُتوں کی کمزوری، بدحالی اور ذلت کو چھپائیں۔

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں ابراہیم جیسے ہیرو کے سامنے منطقی استدلال کے لیے میدان کُھل گیا تاکہ ان پر تابڑ توڑ حملے کریں اور ان کے ذہنوں کو ایسی سرزنش اور ملامت کریں کہ جو منطقی اور بیدار کرنے والی ہو۔" (ابراہیم نے) پکار کر کہا: کیا تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ضرر"۔ (قال افتعبدون من دون الله مالا ینفعکم شیئًا ولا یضرکم)۔

یہ خیالی خدا کہ جو نہ بات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نہ شعور و ادراک رکھتے ہیں، نہ خود اپنا دفاع کر سکتے ہیں، نہ بندوں کو اپنی حمایت کے لیے بلا سکتے ہیں، اصلاً ان سے کونسا کام ہو سکتا ہے اور کس درد کی دوا ہیں؟!

ایک معبود کی پرستش یا تو اس بناء پر ہے کہ وہ عبودیت کے لائق ہے۔ تو یہ بات بتوں کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی یا کسی فائدہ کی اُمید کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا ان سے کسی نقصان کے خوف سے، لیکن بُتوں کے توڑنے کے میرے اقدام نے بتا دیا کہ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو کیا اس حال میں تمہارا یہ کام احمقانہ نہیں ہے؟

٭ ٭ ٭

پھر یہ معلّمِ توحید بات کو اس سے بھی بالا تر لے گیا اور سرزنش کے تازیانے ان کی بے درد رُوح پر لگائے اور کہا: "تُف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی کہ جنہیں تم نے خدا کو چھوڑ کر اپنا رکھا ہے"۔ (اف لکم ولما تعبدون من دون الله)۔

"کیا تم کچھ سوچتے نہیں ہو اور تمہارے سر میں عقل نہیں ہے"۔ (افلا تعقلون)۔

لیکن انہیں بُرا بھلا کہنے اور سرزنش کرنے میں نرمی اور ملائمت کو بھی نہیں چھوڑا کہ کہیں اور زیادہ ہٹ دھرمی نہ کرنے لگیں۔[1]

درحقیقت ابراہیمؑ نے بہت ہی جچے تُلے انداز میں اپنا منصوبہ آگے بڑھایا۔ پہلی مرتبہ انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہیں پکار کر کہا: یہ بے رُوح مجسمے کیا ہیں؟ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑوں کی سنّت ہے تو تم بھی گمراہ ہو اور وہ بھی گمراہ تھے۔

دوسرے مرحلے میں ایک عملی اقدام کیا تاکہ یہ بات واضح کر دیں کہ یہ بُت اس قسم کی کوئی قدرت نہیں رکھتے کہ جو شخص ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے تو اس کو نابود کر دیں۔ خصوصیت کے ساتھ پہلے سے خبردار کر کے بتوں کی طرف گئے اور انہیں بالکل درہم برہم کر دیا تاکہ یہ بات واضح کریں کہ وہ خیالات و تصورات جو انہوں نے باندھے ہوئے ہیں سب کے سب فضول اور بیہودہ ہیں۔

تیسرے مرحلے میں اُس تاریخی عدالت میں انہیں بُری طرح پھنسا کے رکھ دیا۔ کبھی ان کی فطرت کو اُبھارا، کبھی ان کی عقل کو جھنجھوڑا، کبھی پند و نصیحت کی اور کبھی سرزنش و ملامت۔

خلاصہ یہ کہ اس عظیم خدائی معلّم نے ہر راستہ اختیار کیا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا اُسے بروئے کار لایا لیکن تاثیر کے لیے ظرف میں قابلیت کا ہونا بھی مسلمہ شرط ہے۔ افسوس یہ اس قوم میں موجود نہیں تھی۔

---

[1] ہم "اف" کے معنی کے بارے میں ج ۱۲ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔



Marfat.com

لیکن بلاشبہ ابراہیمؑ کی باتیں اور کام، توحید کے بارے میں کم از کم استفہامی علامات کی صورت میں ان کے ذہنوں میں باقی رہ گئے اور یہ آئندہ کی وسیع بیداری اور آگاہی کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید بن گئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کچھ افراد اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت تھے ــــ اُن پر ایمان لے آئے تھے [1] اور نسبتاً کچھ آمادگی کا سامان دوسروں کے لیے بھی پیدا ہو گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

۶۸۔ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ۝

۶۹۔ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝

۷۰۔ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۝

## ترجمہ

۶۸۔ انہوں نے کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم کچھ کر سکتے ہو۔

۶۹۔ (آخر کار اُسے آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے) کہا: اے آگ! ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا۔

۷۰۔ وہ چاہتے تھے کہ اس منصوبے سے ابراہیم کو نابود کر دیں لیکن ہم نے انہیں سب سے زیادہ خسارے میں ڈال دیا۔

## تفسیر

### آگ گلزار ہو گئی:

اگرچہ ابراہیمؑ کے علمی و منطقی استدلالات کے ذریعے سب کے سب بُت پرست مغلوب ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے دل میں اس شکست کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔

لیکن تعصب اور شدید ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے ابراہیم کے بارے میں بہت ہی سخت اور خطرناک قسم کا ارادہ کر لیا اور وہ ابراہیمؑ کو بدترین صورت میں قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ انہیں جلا کر راکھ کر دیا جائے۔

عام طور پر طاقت اور منطق کے درمیان معکوسی رابطہ ہوتا ہے، جس قدر انسان میں طاقت اور قدرت زیادہ ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی منطق کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سوائے مردانِ حق کے کہ وہ جتنا زیادہ قوی اور طاقتور ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ متواضع اور منطقی

[1] کامل ابن اثیر، جلد اوّل ص۱۰۱۔



Marfat.com

ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ طاقت کی زبان سے بات کرتے ہیں۔ جب وہ منطق کے ذریعے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں تو فوراً اپنی طاقت و قدرت کا سہارا لے لیتے ہیں۔ ابراہیمؑ کے بارے میں ٹھیک یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ان لوگوں نے (چیخ کر) کہا: اسے جلادو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم سے کوئی کام ہوسکتا ہے: (قالوا حرقوه وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين)۔

طاقتور صاحبانِ اقتدار بے خبر عوام کو مشتعل کرنے کے لیے عام طور پر ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ نفسیات کو پہچانتے ہیں اور اپنے کام کرنا خوب جانتے ہیں۔

جیسا کہ انہوں نے اس قصہ میں کیا اور ایسے نعرے لگانے کہ جس سے، اصطلاح کے مطابق۔ ان کی غیرت کو للکارا: یہ تمہارے خدا ہیں، تمہارے مقدسات خطرے میں پڑ گئے ہیں، تمہارے بزرگوں کی سنت کو پاؤں تلے روند ڈالا گیا ہے۔ تمہاری غیرت و حمیت کہاں چلی گئی؛ تم اس قدر ضعیف اور زبوں حال کیوں ہو گئے ہو؟ اپنے خداؤں کی مدد کیوں نہیں کرتے؛ ابراہیمؑ کو جلادو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر کچھ کام تم سے ہوسکتا ہے اور بدن میں توانائی اور جان ہے۔

دیکھو! سب لوگ اپنے مقدسات کا دفاع کرتے ہیں، تمہارا تو سب کچھ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے اس قسم کی بہت سی فضول اور مہمل باتیں کیں اور لوگوں کو ابراہیم کے خلاف بھڑکایا اس طرح سے کہ لکڑیوں کے چند گٹھوں کی بجائے کہ جو کئی افراد کے جلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، لکڑیوں کے ہزارہا گٹھے ایک دوسرے پر رکھ کر لکڑیوں کا ایک پہاڑ بنا دیا اور اس کے بعد آگ کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ اس عمل کے ذریعہ سے اپنا انتقام بھی اچھی طرح سے لے سکیں اور بتوں کا وہ خیالی رُعب و داب اور عظمت بھی جس کو ابراہیم کے طرزِ عمل سے سخت نقصان پہنچا تھا، کسی حد تک بحال ہو سکے۔

تاریخ والوں نے اس مقام پر بہت سے مطالب تحریر کیے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی بعید نظر نہیں آتا۔

منجملہ ان کے کہتے ہیں کہ لوگ چالیس دن تک لکڑیاں جمع کرنے میں لگے رہے اور ہر طرف سے بہت سی خشک لکڑیاں لا لا کر جمع کرتے رہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ عورتیں تک بھی کہ جن کا کام گھر میں بیٹھ کر چرخا کاتنا تھا، وہ اس کی آمدنی سے لکڑیوں کا گٹھا لے کر اس میں ڈلواتی تھیں اور وہ لوگ کہ جو قریب المرگ ہوتے تھے، اپنے مال میں سے کچھ رقم سے لکڑیاں خریدنے کی وصیت کرتے تھے اور حاجت مند اپنی حاجتوں کے پورے ہونے کے لیے یہ منت مانتے تھے کہ اگر ان کی حاجت پوری ہوگئی، تو اتنی مقدار لکڑیوں کا اضافہ کریں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب اُن لکڑیوں میں مختلف اطراف سے آگ لگائی گئی تو اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ پرندے اس علاقے سے نہیں گزر سکتے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی آگ کے تو قریب بھی نہیں جایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ ابراہیمؑ کو لے جا کر اُس میں پھینکیں مجبوراً منجنیق سے کام لیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس کے اندر بٹھا کر بڑی تیزی کے ساتھ آگ کے اس دریا میں پھینک دیا گیا[1]

---

[1] مجمع البیان، تفسیر المیزان، تفسیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں اور کامل ابن اثیر جلد ۱ صفحہ ۹۸۔



Marfat.com

ان روایات میں کہ جو شیعہ اور سُنی کی طرف سے نقل ہوئی ہیں' یہ بیان ہوا ہے کہ :

جس وقت حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق کے اُوپر بٹھایا گیا اور انہیں آگ میں پھینکا جانے لگا تو آسمان' زمین اور فرشتوں نے فریاد بلند کی اور بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ توحید کے اس ہیرو اور حریت پسندوں کے لیڈر کو بچالے۔

یہ بھی منقول ہے کہ اس وقت جبرئیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا :

الك حاجة

کیا تمہاری کوئی حاجت ہے کہ میں تمہاری مدد کروں ؟

ابراہیم علیہ السلام نے مختصر سا جواب دیا :

اما اليك فلا

تجھ سے حاجت ؟ نہیں ! نہیں ! ( میں تو اسی ذات سے حاجت رکھتا ہوں کہ جو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے ) ۔

تو اس موقع پر جبرئیل نے کہا :

فاسئل ربك

تو پھر تم اپنی حاجت خدا سے طلب کرو ۔

انہوں نے جواب میں کہا :

حسبي من سؤالي علمه بحالي

میرے سوال کرنے کی بجائے یہی کافی ہے کہ وہ میری حالت سے آگاہ ہے ۔[1]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے اس طرح راز و نیاز میں بات کی

يا احد يا احد يا صمد يا صمد يا من لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا احد توكلت على الله ۔[2]

اے اکیلے! اے اکیلے! اے بے نیاز! اے بے نیاز! اے وہ کہ جس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ جو جنا گیا اور کوئی جس کا ہم پلہ نہیں ! میں اللہ پر ہی بھروسہ رکھتا ہوں

یہ دعا مختلف عبارات کے ساتھ دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے ۔

بہرحال لوگوں کے شور و غل ہاؤ ہو اور جوش و خروش کے اس عالم میں حضرت ابراہیمؑ آگ کے شعلوں کے اندر پھینک دیئے گئے۔ لوگوں نے خوشی سے اس طرح نعرے لگائے گویا بتوں کو توڑنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود اور خاکستر ہو گیا۔

لیکن وہ خدا کہ جس کے فرمان کے سامنے تمام چیزیں سرخم کیے ہوئے ہیں ۔ جلانے کی صلاحیت اُسی نے آگ میں رکھی۔

---

[1] المیزان ، ج ۱۴ ص ۳۲۶ بحوالہ روضۃ الکافی

[2] تفسیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں



Marfat.com

ہے اور ماؤں کے دل میں محبت بھی اسی نے ڈالی ہے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ یہ خالص بندۂ مومن آگ کے اس دریا میں صحیح وسالم رہے تاکہ اس کے افتخار اور اعزاز کی سندوں میں ایک اور سند کا اضافہ ہو جائے۔[1]

جیسا کہ قرآن اس مقام پر کہتا ہے: ہم نے آگ سے کہا: اے آگ! ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا: (قلنا یا نار کونی بردًا و سلامًا علیٰ ابراهیم)۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں خدا کا فرمان فرمانِ تکوینی تھا۔ وہی فرمان کہ جو وہ جہانِ ہستی میں آفتاب و مہتاب، زمین و آسمان، پانی اور آگ، نباتات اور پرندوں کو دیتا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ آگ اس قدر ٹھنڈی ہوگئی کہ ابراہیمؑ کے دانت ٹھنڈک کی شدت سے بجنے لگے اور پھر بعض مفسرین کے قول کے مطابق تو اگر "سلامًا" کی تعبیر ساتھ نہ ہوتی تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ ابراہیمؑ کی جان سردی سے خطرے میں پڑ جاتی۔

ایک مشہور روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ نمرود کی آگ خوبصورت گلستان میں تبدیل ہوگئی۔[1]

یہاں تک کہ بعض نے تو کہا ہے کہ جس دن ابراہیمؑ آگ میں رہے، ان کی زندگی کے دنوں میں سب سے بہترین راحت و آرام کا دن تھا۔[2]

بہرحال اس بارے میں کہ آگ نے حضرت ابراہیمؑ کو کیوں نہ جلایا، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اجمالی بات یہ ہے کہ بینشِ توحیدی کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی سبب سے بھی خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ ایک دن وہ ابراہیمؑ کے ہاتھ میں موجود چھری سے کہتا ہے: نہ کاٹ اور دوسرے دن آگ سے کہتا ہے: نہ جلا اور ایک دن پانی کو جو سببِ حیات ہے حکم دیتا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کو غرق کر دے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں نتیجہ پیش کرتے ہوئے مختصر اور چچے تُلے الفاظ میں فرمایا گیا ہے: اُنہوں نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ ابراہیم کو ایک خطرناک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نابود کردیں لیکن ہم نے اُنہیں کو سب سے زیادہ گھاٹے میں رہنے والا قرار دے دیا: (واراد وا بہ کیدًا فجعلناھم الاخسرین)۔

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابراہیم کے آگ میں صحیح و سالم رہ جانے سے صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ خوشی اور مسرت کا شور و غل ختم ہوگیا۔ تعجب سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے کے کان میں رونما ہونے والی اس عجیب چیز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ابراہیمؑ اور اس کے خدا کی عظمت کا ورد زبانوں پر جاری ہوگیا۔ نمرود کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا لیکن پھر بھی تعصب اور ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں پوری طرح حائل ہوگئی۔ اگرچہ کچھ بیدار دل اس واقعے سے بہرہ ور بھی ہوئے اور ابراہیمؑ کے خدا کے بارے میں ان کے ایمان میں زیادتی اور اضافہ ہوا، مگر یہ لوگ اقلیت میں تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

# چند اہم نکات :

**۱۔ سبب سازی و سبب سوزی :** بعض اوقات انسان عالم اسباب میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے کہ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ آثار و خواص خود انہیں موجودات کے ذاتی ہیں اور اُس عظیم مبداء سے کہ جس نے ان موجودات کو یہ مختلف آثار و صفات بخشے ہیں، غافل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر خدا بندوں کو بیدار کرنے کے لیے "سبب سازی" اور "سبب سوزی" کو بیان کر رہا ہے۔

وہ موجودات کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، وہ عظیم آثار کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ مکڑی کو حکم دیتا ہے کہ وہ چند کمزور تار غار ثور کے دھانے پر تن دے اور انہی چند تاروں کی وجہ سے پیغمبر اسلام کے تعاقب میں نکلنے والے آپ کو نہ پا سکے جبکہ اگر وہ آپ کو پا لیتے تو قتل کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی چھوٹی سی چیز سے تاریخ عالم کا رخ موڑ کے رکھ دیا اور اس کے برعکس بعض اوقات ان اسباب کو کہ جو عالم مادّ میں ضرب المثل ہیں (آگ جلانے میں اور چھری کاٹنے میں) انہیں بیکار کر دیتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی ذاتی طور پر کچھ نہیں کیونکہ اگر" رب جلیل ان کو منع کردے اور روک دے تو وہ اپنا کام نہیں کر سکتے۔ چاہے ابراہیم خلیل حکم بھی دے۔

ان حقائق کی طرف توجہ ـــــ کہ جن کے بے شمار نمونے ہم نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں ـــــ روحِ توحید اور توکل کو مومن کی بندگی میں اس قدر زندہ اور بیدار کر دیتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور اس کے غیر سے مدد طلب نہیں کرتا "مشکلات کی آگ" کو خاموش کرنے کی صرف اُسی سے دُعا کرتا ہے اور دشمنوں کے مکر کی نابودی بھی اس کی بارگاہ سے طلب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اور اس کے غیر سے کسی چیز کی تمنا نہیں کرتا۔

**۲۔ بہادر نوجوان :** بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی[۱] اور بعض نے اس وقت ان کا سن ۲۶ سال کا ذکر کیا ہے۔[۲]

بہرحال وہ جوانی کی عمر میں تھے اور باوجود اس کے کہ ظاہری طور پر ان کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے اس عظیم طاغوت کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کہ جو دوسرے طاغوتوں کا سرپرست تھا۔ آپ تن تنہا جہالت، خرافات اور شرک کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ماحول کے تمام خیالی مقدسات کا مذاق اُڑایا اور لوگوں کے غصّے اور انتقام سے ذرا بھی نہ گھبرائے کیونکہ ان کا دل عشق خدا سے معمور تھا اور ان کا اس پاک ذات پر ہی توکل اور بھروسہ تھا۔

ہاں! ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ یہ جہاں پیدا ہو جاتا ہے وہاں جراٴت و شجاعت پیدا کر دیتا ہے اور جس میں یہ موجود ہو۔ اُسے شکست نہیں ہو سکتی۔

آج کی طوفانی دُنیا میں مسلمانوں کو عظیم شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے جس اہم ترین چیز کی ضرورت ہے وہ یہی ایمان کا عظیم سرمایہ ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

ان المؤمن اشد من زبر الحدید، ان زبر الحدید اذا دخل النّار

---

[۱] مجمع البیان، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر قرطبی، جلد ۶ ص ۴۲-۴۳۔



Marfat.com

تغیروان المؤمن لوقتل ثم نشر ثم قتل لم یتغیر قلبہ

مومن فولاد کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ محکم ہوتا ہے کیونکہ فولاد کو جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں تغیر اور تبدیلی آجاتی ہے لیکن مومن کو اگر قتل بھی کر دیا جائے اور پھر دوبارہ زندہ کیا جائے اور پھر اسے قتل کر دیا جائے، پھر بھی اس کے دل میں تبدیلی نہیں آتی۔[1]

۳۔ **ابراہیمؑ اور نمرود کے مابین معرکہ:** تاریخوں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا، نمرود کو یقین ہوگیا تھا کہ ابراہیمؑ مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گئے ہیں لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو زندہ ہیں، تو اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا مجھے تو ابراہیم زندہ دکھائی دے رہا ہے۔ شاید مجھے اشتباہ ہو رہا ہے۔ وہ ایک بلند مقام پر چڑھ گیا اور خوب غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ تو اسی طرح ہے۔ نمرود نے پکار کر کہا: اے ابراہیم! واقعاً تیرا خدا عظیم ہے اور اس قدر قدرت رکھتا ہے کہ اُس نے تیرے اور آگ کے درمیان ایک رکاوٹ پیدا کر دی!۔۔۔۔۔ اب جبکہ یہ بات ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس کی اس قدرت اور عظمت کی وجہ سے اس کے لیے قربانی کروں۔ (اور اس نے چار ہزار قربانیاں اس مقصد کے لیے تیار کیں) لیکن ابراہیمؑ نے اُس سے کہا: تجھ سے کسی قسم کی قربانی اور کارِ خیر قبول نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ تو پہلے ایمان لے آئے۔

نمرود نے جواب میں کہا: اِس صورت میں تو میری حکومت ختم ہو جائے گی اور میں یہ بات گوارا نہیں کر سکتا۔

بہر حال یہی حادثات اس بات کا سبب بن گئے کہ کچھ آگاہ اور بیدار دل لوگ ابراہیمؑ کے خدا پر ایمان لے آئے یا ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا اور شاید یہی واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ نمرود ابراہیمؑ کے مقابلہ میں کسی سخت ردِ عمل کا اظہار نہ کرے اور صرف ان کو سرزمین بابل سے جلا وطن کرنے پر قناعت کرے۔[2]

۞ ۞ ۞

۷۱۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

۷۲۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝

۷۳۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۳۷ (مادہ امن)۔

[2] کامل ابن اثیر، جلد اول، ص ۹۹



Marfat.com

# ترجمہ

۷۱۔ اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین (شام) کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سب اہل جہان کے لیے پُر برکت بنایا ہے۔
۷۲۔ اور ہم نے اُسے اسحاق اور (اس کے بعد) یعقوب بھی بخشا اور ہم نے اُن سب کو مردان صالح قرار دیا۔
۷۳۔ اور ہم نے انہیں ایسے امام (اور پیشوا) قرار دیا کہ جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انہیں نیک کام انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔

# تفسیر

## بُت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیمؑ کی ہجرت:

ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ اور اس خطرناک مرحلہ سے ان کی معجزانہ نجات نے نمرود کے ارکان حکومت کو لرزہ براندام کردیا۔ نمرود تو بالکل حواس باختہ ہوگیا کیونکہ اب وہ ابراہیمؑ کو ایک فتنہ کھڑا کرنے والا اور نفاق ڈالنے والا جوان نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ابراہیمؑ اب ایک خدائی رہبر اور بہادر ہیرو کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ابراہیم اس کے تمام تر طاقت و وسائل کے باوجود اُس کے خلاف جنگ کی ہمت رکھتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر ابراہیمؑ ان حالات میں اس شہر اور اس ملک میں رہا تو اپنی باتوں، قوی منطق اور بے نظیر شجاعت کے ساتھ مسلمہ طور پر اس جابر، خودسر اور خودغرض حکومت کے لیے ایک خطرے کا مرکز بن سکتا ہے۔ لہذا اُس نے فیصلہ کیا کہ ابراہیم کو ہر حالت میں اس سرزمین سے چلے جانا چاہیئے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ حقیقت میں اپنی رسالت کا کام اس سرزمین میں انجام دے چکے تھے۔ وہ حکومت کی بنیادوں پر یکے بعد دیگرے چکنا چور کرنے والی ضربیں لگا چکے تھے۔ اس سرزمین میں ایمان و آگاہی کا بیج بو چکے تھے۔ اب صرف ایک مدت کی ضرورت تھی کہ جس سے یہ بیج آہستہ آہستہ بارآور ہو اور بُت پرستی کی بساط اُلٹ جائے۔

اب ان کے لیے بھی مفید یہی تھا کہ یہاں سے کسی دوسری سرزمین کی طرف چلے جائیں اور اپنی رسالت کے کام کو وہاں بھی عملی شکل دیں۔ لہذا انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ لوط (جو آپؑ کے بھتیجے تھے) اور اپنی بیوی سارہ اور احتمالاً مومنین کے ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ لے کر اس سرزمین سے شام کی طرف ہجرت کر جائیں۔

جیسا کہ قرآن زیر بحث آیات میں کہتا ہے: ہم نے ابراہیم اور لوط کو ایسی سرزمین کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سارے جہان والوں کے لیے برکتوں والا بنایا تھا: (ونجيناه ولوطا الى الارض التى باركنا فيها للعالمين)۔

اگرچہ قرآن میں اس سرزمین کا نام صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہے لیکن سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت (سبحان الذی اسرٰی بعبده ليلاً من المسجد الحرام الى المسجد الاقصى الذى باركنا حوله)۔ پر توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی شام کی سرزمین ہے، جو ظاہری اعتبار سے بھی پُر برکت، زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے اور معنوی لحاظ سے بھی کیونکہ وہ انبیا کی پرورش



Marfat.com

کا مرکز تھی ۔

ابراہیمؑ نے یہ ہجرت خود اپنے آپ کی تھی یا نمرود کی حکومت نے انہیں جلاوطن کیا یا یہ دونوں ہی صورتیں واقع ہوئیں اس بارے میں تفاسیر و روایات میں مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا مجموعی مفہوم یہی ہے کہ ایک طرف تو نمرود اور اس کے ارکان حکومت ابراہیمؑ کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انھیں اس سرزمین سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور دوسری طرف ابراہیمؑ بھی اس سرزمین میں اپنی رسالت کے کام تقریباً مکمل کر چکے تھے اور اب کسی دوسرے علاقے میں جانے کے خواہاں تھے کہ دعوتِ توحید کو وہاں بھی پھیلائیں۔ خصوصاً بابل میں رہنے سے ممکن تھا کہ آپؑ کی جان چلی جاتی اور آپؑ کی عالمی دعوت نامکمل رہ جاتی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا کہ جس وقت نمرود نے یہ ارادہ کیا کہ ابراہیمؑ کو اس سرزمین سے جلاوطن کر دے تو اس نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم کی بھیڑیں اور ان کا سارا مال ضبط کر لیا جائے اور وہ اکیلا ہی یہاں سے باہر جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اُن سے کہا یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ اگر تم میرا مال لینا چاہتے ہو تو میری اُس عمر کو جو میں نے اس سرزمین میں گزاری ہے مجھے واپس دے دو۔ لہٰذا طے یہ پایا کہ حکومت کے قاضیوں میں سے ایک اس بارے میں فیصلہ دے۔ قاضی نے حکم دیا کہ ابراہیم کا مال لے لیا جائے اور جو عمر انہوں نے اس سرزمین میں خرچ کی ہے وہ انہیں واپس کر دی جائے۔

جس وقت نمرود اس واقعے سے آگاہ ہوا تو اس نے بہادر قاضی کے حقیقی مفہوم کو سمجھ لیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کا مال اور اس کی بھیڑیں اُسے واپس کر دی جائیں تاکہ وہ انہیں ساتھ لے جائے اور کہا: مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ یہاں رہ گیا تو وہ تمہارے دین و آئین کو خراب کر دے گا اور تمہارے خداؤں کو نقصان پہنچائے گا: (انه ان بقی فی بلادکم افسد دینکم واضر بالهتکم)۔[1]

بعد والی آیت میں ابراہیمؑ پر خدا کی ایک نہایت اہم نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے صالح اولاد اور ایک پھلنے پھولنے والی اچھی نسل فرمایا گیا ہے: ہم نے اُسے اسحاق (سا بیٹا) عطا کیا اور (اس کے بعد اسحاق کا بیٹا) یعقوب بھی عطا کیا: (ووهبنا له اسحٰق ویعقوب نافلة)۔[2]

اور ہم نے ان سب کو صالح، شائستہ اور مفید قرار دیا"۔ (وکلا جعلنا صالحین)۔

سالہا سال گزر گئے کہ ابراہیم اس فرزند صالح کے انتظار اور خواہش میں ہی زندگی بسر کرتے رہے اور سورہ صافات کی آیہ ۱۰۰ ان کی اس اندرونی خواہش کو بیان کر رہی ہے:

رب هب لی من الصالحین

پروردگارا! مجھے ایک صالح فرزند مرحمت فرما۔

آخر کار خدا نے ان کی دُعا قبول کر لی۔ پہلے اسمٰعیلؑ اور پھر اسحاقؑ انہیں مرحمت فرمایا کہ جن میں سے ہر ایک، ایک بزرگ پیغمبر اور صاحب منزلت تھے۔

---

[1] المیزان زیر بحث آیات کے ذیل میں، بحوالہ روضۃ الکافی

[2] یہاں اسماعیل کا ذکر نہ کرنا جب کہ وہ ابراہیمؑ کے پہلے بیٹے تھے، شاید اس وجہ سے ہو کہ اسحاق سارہ جیسی بانجھ خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی اس سن میں جب معمولاً وضع حمل ممکن نہ تھا۔ لہٰذا یہ ایک عجیب غیر معمولی مسئلہ معلوم ہوتا تھا جبکہ اسماعیلؑ کا اپنی والدہ ہاجرہ سے پیدا ہونا ایسا عجیب نہ تھا۔



Marfat.com

"نافلہ" کی تعبیر کہ جو ظاہری طور پر صرف یعقوب کی توصیف ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ ابراہیم نے تو صرف ایک صالح فرزند کیلیے دُعا کی تھی، خدا نے ایک صالح پوتے کا بھی اس پر اضافہ کر دیا کیونکہ "نافلہ" در اصل نعمت کے یا اضافی کام کے معنی میں ہے۔

آخری زیر بحث آیت ان عظیم پیغمبروں کے مقام امامت و رہبری اور ان کی کچھ صفات اور اہم پروگراموں کی طرف اجتماعی طور پر اشارہ کر رہی ہے۔

اس آیت میں مجموعی طور پر ان کی چھ صفات شمار کی گئی ہیں۔ ان میں صالح ہونے کی صفت کا اضافہ کر لیا جائے تو سات ہو جاتی ہیں کیونکہ گزشتہ آیت میں یہ صفت بیان ہوئی ہے ــــ یہ احتمال بھی ہے کہ ان چھ صفات کا مجموعہ کہ جو اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ ان کے صالح ہونے کی تشریح ہو کہ جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں امام اور لوگوں کا رہبر قرار دیا (وجعلناهم ائمة)۔ یعنی مقام نبوت و رسالت کے بعد ہم نے انہیں مقام امامت بھی عطا کیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ امامت انسانی ارتقاء اور سیر تکامل کا آخری مرحلہ ہے کہ جو لوگوں کی مادی و معنوی، ظاہری و باطنی، جسمانی و رُوحانی رہبری کے معنی میں ہے۔

نبوت و رسالت کا امامت کے ساتھ یہ فرق ہے کہ انبیاء و رسل مقام نبوت و رسالت میں صرف فرمان حق کو حاصل کرتے اور اس کی خبر دیتے اور لوگوں کو اس کی تبلیغ کرتے ہیں، ایسا ابلاغ کہ جس میں بشارت و نذارت موجود ہو۔

لیکن مرحلہ امامت میں وہ ان خدائی پروگراموں کا اجراء کرتے ہیں، چاہے وہ حکومت عادلہ کی تشکیل کے ذریعے ہو یا اس کے بغیر۔ اس لحاظ سے وہ تربیت کرنے والے احکام اور پروگرام جاری کرنے والے، انسانوں کی تربیت کرنے والے اور پاک و پاکیزہ انسانی ماحول کو وجود میں لانے والے ہوتے ہیں۔

در حقیقت مقام امامت تمام خدائی پروگراموں کو عملی صورت دینے کا مقام ہے۔

دوسرے لفظوں میں مقصود و مطلوب تک پہنچانا اور تشریعی و تکوینی ہدایت کرنا ہے۔

امام اس لحاظ سے ٹھیک آفتاب کی مانند ہے کہ جو اپنی شعاعوں کے ذریعے زندہ موجودات کی پرورش کرتا ہے۔[1]

بعد کے مرحلے میں اس مقام کی فعلیت اور اس کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے: وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں۔ (یهدون بامرنا)۔

ہدایت صرف راہنمائی اور راستہ دکھانے کے معنی میں نہیں ہے ــــ کیونکہ یہ بات تو نبوت و رسالت میں بھی موجود ہوتی ہے ــــ بلکہ دستگیری کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے (البتہ اُنہی لوگوں کے لیے کہ جو آمادگی اور اہلیت رکھتے ہیں)

تیسری، چوتھی اور پانچویں نعمت اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ: ہم نے انہیں اچھے کام انجام دینے اور (اسی طرح) نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی (واوحینا الیهم فعل الخیرات و اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة)۔

یہ وحی "تشریعی وحی" بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ہم نے مختلف قسم کے کارہائے خیر اور ادائے نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کو ان کے دینی پروگراموں میں داخل کر دیا اور یہ وحی تکوینی بھی ہو سکتی ہے یعنی ہم نے ان امور کو انجام دینے کے لیے انہیں توفیق و توانائی اور معنوی جذبہ عطا فرمایا۔

البتہ ان امور میں سے کوئی بھی چیز جبری اور اضطراری پہلو نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ صرف اہلیتیں ہیں کہ جو خود ان کے اپنے ارادہ اور خواہش

---

[1] اس سلسلہ میں مزید تشریح جلد اول سورہ بقرہ کی آیہ ۱۲۴ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔



Marfat.com

کے بغیر ہرگز کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتیں۔

"فعل خیرات" کے بعد قیام صلوٰۃ اور "ادائے زکوٰۃ" کا ذکر، ان دونوں امور کی اہمیت کی وجہ سے ہے کہ جو پہلے تو عام حیثیت سے "واوحینا الیھم فعل الخیرات" کے جملے میں اور اس کے بعد بطور خاص بیان ہوا ہے۔

آخری حصے میں ان کے مقام "عبودیت" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے (وکانوا لنا عابدین)[1]

ضمنی طور پر "کانوا" کی تعبیر کہ جو اس پروگرام میں پہلے سے مسلسل عمل کرتے رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مقام نبوت و رسالت تک پہنچنے سے پہلے بھی صالح، موحد اور اہل لوگ تھے اور ان امور پر عمل کرتے رہنے کی بنا پر ہی، خدا نے انہیں نئے انعامات سے نوازا ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "یھدون بامرنا" کا جملہ درحقیقت باطل کے رہبروں اور پیشواؤں کے مقابلہ میں، حقیقی آئمہ اور پیشواؤں کی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ باطل کے پیشواؤں کے کام کی بنیاد تو شیطانی ہوا و ہوس پر ہے۔

> ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: قرآن میں دو قسم کے اماموں کا ذکر ہے، ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ: وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا"
>
> یعنی خدا کے حکم سے، نہ کہ لوگوں کے حکم سے، وہ خدا کے حکم کو اپنے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔
>
> لیکن دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:
>
> وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار
>
> ہم نے انہیں ایسا امام و پیشوا قرار دے دیا ہے کہ جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اپنے حکم کو خدا کے حکم سے مقدم شمار کرتے ہیں اور اپنے حکم کو اس کے حکم سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی ہوا و ہوس کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں[2]
>
> اور یہ ہے معیار اور کسوٹی امام حق اور امام باطل میں تمیز کی۔

٭ ٭ ٭

---

[1] لفظ "لنا" کو "عابدین" پر مقدم رکھنا حصر کی دلیل ہے اور ان بزرگوں کے خالص مقام توحید کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صرف خدا کی عبادت کرتے تھے۔

[2] دوسری آیت جو کہ سورۂ قصص کی آیہ ۴۱ ہے فرعون اور اس کے لشکر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ حدیث تفسیر صافی میں کتاب کافی سے نقل ہوئی ہے۔



Marfat.com

٧٤۔ وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبَائِثَ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَاسِقِينَ ۝

٧٥۔ وَأَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا ۖ إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

## ترجمہ :

٧٤۔ اور لوط (کو یاد کرو) کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا اور اس شہر سے نجات بخشی کہ جہاں کے لوگ قبیح اور گندے کام کرتے تھے کیونکہ وہ بُرے اور فاسق لوگ تھے۔

٧٥۔ اور ہم نے اس کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ بیشک وہ صالحین میں سے تھا۔

## تفسیر

### بُروں کے علاقوں سے لُوط کی نجات :

حضرت لُوطؑ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ داروں اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کے بعد، ابلاغِ رسالت کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد اور کوششوں کے ایک حصّہ کی طرف اور ان کے لیے پروردگار کے انعامات و احسانات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے : اور لُوط کو یاد کرو کہ جسے ہم نے حکم اور علم دیا ( ولوطًا اٰتیناہ حکمًا و علمًا )[1]

لفظ "حکم" بعض مقامات پر تو فرمانِ نبوّت و رسالت کے معنی میں آیا ہے اور کچھ دوسرے مقامات پر قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں، جب کہ بعض اوقات عقل و خرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان معانی میں سے یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ ان معانی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے[2]

"علم" سے مراد ہر قسم کا علم و دانش ہے کہ جس کا انسان کی سعادت اور انجام میں گہرا اثر ہوتا ہے۔

لوطؑ بزرگ انبیاء میں سے ہیں، جو ابراہیمؑ کے ہمعصر تھے اور اُنہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ سرزمینِ بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے جُدا ہو کر "سدوم" شہر میں آئے کیونکہ اس علاقے کے لوگ گناہ اور بدکاری میں مبتلا تھے۔ خصوصاً جنسی انحرافات اور آلودگیوں میں غرق تھے۔ انہوں نے اس منحرف قوم کی ہدایت کے لیے بہت کوشش کی اور اس راستے میں خونِ جگر کے گھونٹ پیئے، لیکن ان دل کے اندھوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔

---

[1] لفظ "لوط" کا یہاں منصوب ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ فعل مقدر کا مفعول ہے، یہ فعل ممکن ہے کہ "اٰتینا" ہو یا "اذکر" ہو۔

[2] لفظ "حکم" اور "علم" کی تفسیر اور ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں ہم جلد ٩ صفحہ ٣٢٥ (اُردو ترجمہ) پر بھی بحث کر چکے ہیں۔



Marfat.com

انجام کار — جیسا کہ ہم جانتے ہیں — خدا کے شدید عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کی آبادیاں بالکل تہ و بالا ہوگئیں اور سوائے لوط کے گھر والوں کے، ان کی بیوی کے علاوہ سب کے سب نابود ہوگئے۔ جیسا کہ اس کی پوری تفصیل ہم سورہ ھود کی آیت ،، کے بعد بیان کر چکے ہیں [1]

لہٰذا زیر بحث آیت کے آخر میں اس کرم فرمائی کی طرف کہ جو اس نے لوطؑ پر کی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اُسے اس شہر سے کہ جہاں لوگ قبیح کام کرتے تھے رہائی بخشی (ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث)۔

کیونکہ وہ بُرے لوگ تھے اور وہ فرمانِ حق کی اطاعت سے باہر نکل گئے تھے: (انھم کانوا قوم سوء فاسقین)۔

اہلِ شہر کی بجائے، قبیح اور بُرے اعمال کی "قریہ" (شہر اور آبادی) کی طرف نسبت دینا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ اور بدکاری میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے، کہ گویا ان کی آبادی کے در و دیوار سے گناہ اور قبیح و پلید اعمال برس رہے تھے۔

اور "خبائث" کی تعبیر جمع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ "لواطت کے انتہائی گندے عمل کے علاوہ" اور بھی بُرے اور خبیث عمل کیا کرتے تھے کہ جن کی طرف ہم جلد ۹ کے صـ۱۸۸ (اُردو ترجمہ) میں اشارہ کر چکے ہیں۔

اور "قوم سوء" کے بعد "فاسقین" کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو، کہ وہ خدا کے قوانین کے لحاظ سے بھی فاسق لوگ تھے اور انسانی معیاروں کے لحاظ بھی۔ یہاں تک کہ دین و ایمان سے قطع نظر وہ پست، پلید، آلودہ اور منحرف افراد تھے۔

اس کے بعد حضرت لوطؑ پر کیے گئے آخری انعام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اُسے اپنی خاص رحمت میں داخل کیا (وادخلناہ فی رحمتنا)۔

کیونکہ وہ صالح اور نیک بندوں میں سے تھا (انہ من الصالحین)۔

خدا کی یہ خاص رحمت بلاوجہ کسی شخص پر نہیں ہوتی، یہ حضرت لوطؑ کی اہلیت تھی جس نے انہیں اس قسم کی رحمت کا مستحق بنا دیا۔

واقعاً اس سے زیادہ مشکل اور کونسا کام ہوگا اور کونسا اصلاحی پروگرام اس سے زیادہ طاقت فرسا ہوگا کہ انسان ایک طویل مدت تک ایسے شہر میں کہ جس میں اس قدر گناہ اور آلودگی ہو، ٹھہرا رہے اور مسلسل گمراہ اور منحرف لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کرتا رہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ وہ اس کے مہمانوں تک کے ساتھ بھی مزاحمت کرنے لگیں۔ واقعاً یہ صبر و استقامت خدائی پیغمبروں اور ان کی راہ پر چلنے والوں کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم میں سے کون ایسا شخص ہے کہ جو اس قسم کی جانکاہ رُوحانی سختیوں کو برداشت کر سکتا ہو؟

٭ ٭ ٭

۷۶۔ وَنُوحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۹ صـ۱۷۳ سے بعد تک۔



Marfat.com

۷۷۔ وَنَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ
سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝

# ترجمہ

۷۶۔ اور نوح (کو یاد کرو) جبکہ اس نے (ابراہیم و لوط سے) پہلے اپنے پروردگار کو پکارا۔ تو ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اُسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات دی۔

۷۷۔ اور ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، مدد کی۔ کیونکہ وہ بُری قوم تھی لہذا ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

# تفسیر

## متعصّب اور ہٹ دھرم لوگوں سے نوحؑ کی نجات :

ابراہیمؑ اور لوطؑ کی داستان کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے ایک حصہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

اور نوح کو یاد کرو جبکہ اس نے (ابراہیم و لوط سے پہلے) اپنے پروردگار کو پکارا اور بے ایمان منحرف لوگوں کے چنگل سے نجات کے لیے درخواست کی (ونوحًا اذ نادٰی من قبل)۔

حضرت نوحؑ کی یہ ندا ظاہری طور پر ان کی اس نفرین اور بددعا کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید کی سُورہ نوح میں بیان ہوئی ہے، جہاں پر ہے :

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا انك ان تذرهم یضلوا
عبادك ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا

پروردگارا ! اس بے ایمان قوم کے کسی فرد کو باقی نہ رہنے دے کیونکہ اگر یہ باقی رہ گئے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی کافر و فاجر ہی ہوگی۔ (نوح ۲۶-۲۷)

اور یا اس جملہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو سورہ قمر کی آیہ ۱۰ میں ہے :

فدعا ربه انی مغلوب فانتصر

اس نے اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ میں ان کے مقابلہ میں مغلوب ہوں تو میری مدد فرما۔



Marfat.com

"نادی" کی تعبیر کہ جو عام طور پر پکارنے کے لیے آتی ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس بزرگ پیغمبر کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ وہ آخر کار چیخ اُٹھا اور واقعاً اگر حضرت نوحؑ کے حالات کا ــ کہ جن کا کچھ حصّہ سورہ نوح میں بیان ہوا ہے اور کچھ حصّہ سورہ ھود میں ــ اچھی طرح سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ فریاد کرنے میں حق بجانب تھے [1]

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی دعا قبول کرلی اور اُسے اور اس کے گھر والوں کو اس عظیم غم سے نجات بخشی:

( فاستجبنا له فنجيناه واهله من الكرب العظيم)۔

درحقیقت لفظ "فاستجبنا" تو ان کی دُعا قبول ہونے کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے اور "فنجيناه واهله من الكرب العظيم" اس کی تشریح و تفصیل شمار ہوتا ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں پر لفظ "اهل" سے کون مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ اگر اس سے مراد حضرت نوحؑ کے گھر والے ہی ہوں تو یہ صرف آپ کے بعض بیٹوں کے لیے ہی ہوگا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا ایک بیٹا، بُرے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اپنی خاندانِ نبوّت کی اہلیت کھو بیٹھا تھا۔

ان کی بیوی بھی ان کے مسلک اور طریقہ پر نہیں تھی اور اگر "اهل" سے مراد، ان کے خاص پیروکار اور ان کے صاحب ایمان ساتھی ہوں، تو یہ "اهل" کے مشہور معنی کے برخلاف ہے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر "اهل" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں آپ کے مومن عزیز و اقارب بھی شامل ہیں اور خاص اصحاب و انصار بھی۔ کیونکہ ان کے نااہل بیٹے کے بارے میں تو یہ بیان ہوا ہے کہ:

انه ليس من اهلك

وہ تیرے خاندان میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس نے مکتب و مذہب تجھ سے جُدا کر لیا ہے۔ (ھود-۴۶)

اس بناء پر وہ لوگ کہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ مکتب و مذہب کا رشتہ رکھتے تھے وہ حقیقت میں آپ کے خاندان سے شمار ہوتے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ لفظ "کرب" لغت میں "اندوہ شدید" کے معنی میں ہے اور دراصل یہ "کرب" سے لیا گیا ہے کہ جو زمین الٹنے پلٹنے کے معنی میں ہے۔ اندوہ شدید کیونکہ انسان کے دل کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور اس کی "عظیم" کے ساتھ توصیف نوحؑ کے اندوہ کی شدت کی انتہا کو ظاہر کر رہی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا غم و اندوہ ہوگا کہ صریح آیاتِ قرآنی کے مطابق کہ انہوں نے ۹۵۰ سال دینِ حق کی دعوت دی لیکن مفسرین کے درمیان مشہور قول کے مطابق اس ساری طویل مدت میں صرف اسّی افراد آپ پر ایمان لائے [2]

اور باقی لوگوں کا کام، ٹھٹھہ کرنے، مذاق اُڑانے، اذیت دینے، اور آزار پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی، اس قوم کے مقابلہ میں مدد کی کہ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتی تھی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۸۳ سے لے کر ۱۲۹ (اردو ترجمہ) تک مراجعہ فرمائیں۔

[2] مجمع البیان، سورہ ھود کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں اور نور الثقلین ج ۲ ص ۳۵۔



Marfat.com

ا ونصرناه من القوم الذین کذبوا بآیاتنا) [1]

" کیونکہ وہ بُری قوم تھی لہٰذا ہم نے ان سب کو غرق کر دیا " ۔ (انھم کانوا قوم سوء فاغرقناھم اجمعین) ۔

یہ جملہ ایک بار پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ خدائی عذاب اور سزائیں ہرگز انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ بنیاد یہ ہے کہ حیات اور نعماتِ زندگی سے استفادہ کرنے کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہے کہ جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے ۔ اللہ کے راستے پر چل رہے ہوں اور اگر ان سے کسی دن انحرافی راستے میں قدم پڑ بھی جائے ، تو وہ اپنی غلطی پر غور کرتے ہوئے واپس لوٹ آئیں لیکن وہ گروہ کہ جو فاسد ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ان کی اصلاح کی کوئی اُمید نہیں ہے ، تو اُن کا انجام سوائے موت اور نابودی کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔

## ایک نکتہ

اس نکتے کا بیان بھی ضروری ہے کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کی سرگزشت میں بھی ان کی جابر دشمنوں اور مصائب سے نجات کا ذکر ہے ۔ اور اسی طرح " ایوبؑ " اور " یونسؑ " کے قصہ میں بھی نوح کی طرح ہی ان کی جابر دشمنوں اور مصیبتوں کے چنگل سے نجات کا ذکر آئے گا ۔

گویا پروگرام یہ ہے کہ خدا اس سورۂ انبیاء میں پیغمبروں کی بے دریغ حمایت ، اور ان کی مشکلات کے چنگل سے نجات کو بیان کرے تاکہ رسولِ اسلامؐ کے لیے تسلی اور مومنین کے لیے اُمید کا سبب ہو ۔ خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکی ہے اور مسلمان اس وقت شدید پریشانی اور رنج و تکلیف میں تھے ۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی زیادہ واضح اور روشن ہو جاتی ہے ۔

٭ ٭ ٭

۷۸۔ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ

۷۹۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۖ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

۸۰۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝

---

[1] عام طور پر " نصر " " علیٰ " کے ذریعہ دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے ، مثلاً کہا جاتا ہے " اللھم انصرنا علیھم " لیکن یہاں " من " استعمال ہوا ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے مراد ایسی مدد کرنا ہے کہ جو نجات کے ساتھ وابستہ ہو کیونکہ نجات کا مادہ " من " کے ساتھ متعدی ہو جاتا ہے ۔



Marfat.com

# ترجمہ

۷۸۔ اور داؤد و سلیمان (کو یاد کرو) کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں ـــــ کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کو چر گئی تھیں (اور اسے خراب کر دیا تھا) ـــــ فیصلہ کر رہے تھے اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔

۷۹۔ ہم نے اس کا (صحیح فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا تھا اور ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو فیصلہ کی (لیاقت اور) آگاہی دی تھی اور ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ (خدا کی) تسبیح کرتے تھے اور ہم یہ کام کرنے پر قادر ہیں۔

۸۰۔ اور ہم نے اُسے زرہ بنانے کی تعلیم دی، تاکہ وہ تمہیں، تمہاری جنگوں میں محفوظ رکھے۔ کیا (تم خدا کی ان نعمتوں کا) شکر ادا کرتے ہو؟

# تفسیر

## داؤدؑ اور سلیمانؑ کا فیصلہ:

حضرت موسٰیؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، اور حضرت نوحؑ سے متعلق واقعات کے بیان کے بعد زیر بحث آیات، داؤد و سلیمان کی زندگی کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ابتداء میں ایک فیصلے کا ذکر ہے کہ جو حضرت داؤدؑ اور سلیمان نے کیا تھا ـــــ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اور داؤد و سلیمان کو یاد کرو کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کے وقت چر گئی تھیں (و داؤد و سلیمان اذ یحکمان فی الحرث اذ نفشت فیہ غنم القوم[1])۔

اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے (وکنا لحکمھم شاھدین)۔

اگرچہ قرآن نے اس فیصلے کا واقعہ کا ملاً سربستہ طور پر بیان کیا ہے۔ اور ایک اجمالی اشارہ پر ہی اکتفا کیا ہے، اور صرف اس کے اخلاقی اور تربیتی نتیجہ پر کہ جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے قناعت کی ہے، لیکن اسلامی روایات اور مفسرین کے بیانات میں اس سلسلے میں بہت سی بحثیں نظر آتی ہیں۔

کچھ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح تھا: کہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ رات کے وقت انگوروں کے ایک باغ میں داخل ہوگیا اور انگوروں کی بیلوں اور انگوروں کے گچھوں کو کھا گیا اور انہیں خراب اور ضائع کر دیا۔ باغ کا مالک حضرت داؤد کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔

[1] "نفشت" "نفش" (بروزن کفش) کے مادہ سے رات کو پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے، اور چونکہ بھیڑوں کا رات کو پراگندہ ہونا، اور وہ بھی ایک کھیت میں، طبعی طور پر اس میں چرنے سے ملا ہوا ہوگا، لہٰذا بعض نے اُسے رات کو چرنا کہا ہے، اور "نفش" (بروزن قفس) ان بھیڑوں کے معنی میں ہے کہ جو رات کو پراگندہ اور منتشر ہو جائیں۔



Marfat.com

حضرت داؤدؑ نے حکم دیا کہ اس اتنے بڑے نقصان کے بدلے میں تمام بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔ سلیمانؑ جو اس وقت بچے تھے باپ سے کہتے ہیں کہ: اے خدا کے عظیم پیغمبر! آپ اس حکم کو بدل دیں اور منصفانہ فیصلہ کریں! باپ نے کہا کہ وہ کیسے؟ آپ جواب میں کہتے ہیں کہ: بھیڑیں تو باغ کے مالک کے سپرد کی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ اور اُون سے فائدہ اُٹھائے اور باغ کو بھیڑوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرے۔ جس وقت باغ پہلی حالت میں لوٹ آئے تو وہ اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائے اور بھیڑیں بھی اپنے مالک کے پاس لوٹ جائیں گی (اور خدا نے بعد والی آیت کے مطابق سلیمان کے فیصلہ کی تائید کی)۔

یہ مضمون ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔[۱]

ممکن ہے یہ تصور ہو کہ یہ تفسیر لفظ "حرث" کے ساتھ جو کہ زراعت کے معنی میں ہے مناسبت نہیں رکھتی لیکن ظاہراً "حرث" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں زراعت بھی شامل ہے اور باغ بھی۔ جیسا کہ باغ والوں کی داستان (اصحاب الجنۃ سورہ قلم آیہ ۱۷ تا ۳۲) سے معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہاں چند اہم سوال باقی رہ جاتے ہیں:

۱۔ ان دونوں فیصلوں کی بُنیاد اور معیار کیا تھا؟

۲۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف کیوں تھے؟ کیا وہ اجتہاد کی بُنیاد پر فیصلہ کیا کرتے تھے؟

۳۔ کیا یہ مسئلہ، ایک مشورے کی صورت میں تھا یا دونوں نے ایک دوسرے سے الگ، قطعی اور مستقل حیثیت سے فیصلہ دیا تھا؟

پہلے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ معیار اور بنیاد خسارے اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے غور کیا اور دیکھا کہ انگوروں کے باغ میں جو نقصان ہوا ہے، وہ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہے۔ لہذا انہوں نے حکم دے دیا کہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں کیونکہ قصور بھیڑوں کے مالک کا تھا۔

> اس بات کی طرف توجہ رہے کہ بعض اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت بھیڑوں والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ریوڑ کو دوسروں کے کھیتوں میں داخل ہونے سے روکے اور دن کے وقت حفاظت کی ذمہ داری کھیتوں کے مالک کی ہے۔[۲]

اور حضرت سلیمانؑ کے حکم کا ضابطہ یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ باغ کے مالک کا نقصان بھیڑوں کے ایک سال کے منافع کے برابر ہے۔ اس بناء پر فیصلہ تو دونوں نے حق و انصاف کے مطابق کیا ہے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ زیادہ گہرائی پر مبنی تھا، کیونکہ اس کے مطابق خسارہ یکمشت پورا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس طرح خسارہ تدریجی طور پر پورا ہوتا اور یہ فیصلہ بھیڑوں والے پر بھی گراں نہ تھا۔ علاوہ ازیں نقصان اور تلافی کے درمیان ایک تناسب تھا، کیونکہ انگور کی جڑیں ختم نہیں ہوئی تھیں، صرف ان کا وقتی منافع ختم ہوا تھا،

---

[۱] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[۲] مجمع البیان میں زیر بحث آیہ کے ذیل میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ: روی عن النبی انہ قضیٰ بحفظ المواشی علی اربابھا لیلا و قضی بحفظ الحرث علی اربابھا نھاراً" یہی مضمون تفسیر صافی میں بھی کتاب کافی سے منقول ہے۔



Marfat.com

لہٰذا زیادہ منصفانہ فیصلہ یہ تھا کہ اصل بھیڑیں باغ کے مالک کو نہ دی جائیں۔ بلکہ اُسے ان کا منافع دیا جائے۔

دوسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ: بے شک انبیاءؑ کا فیصلہ خدائی وحی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب بھی کسی فیصلے کا موقع ہو، تو ہر خاص فیصلہ کے وقت خاص وحی نازل ہوتی ہے بلکہ وہ ان عمومی ضابطوں کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں جو انہوں نے وحی سے حاصل کیے ہوتے ہیں۔

اس بناء پر اصطلاحی معنی میں اجتہاد نظری یعنی اجتہاد ظنی کی — ان کے بارے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ ایک ضابطۂ کلی کو عملی شکل دینے میں دو راستے موجود ہوں اور دو پیغمبروں میں سے ہر ایک ان میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرلے جبکہ حقیقت میں وہ دونوں کے دونوں صحیح ہوں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہماری اس بحث میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے لیکن جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے۔ وہ راہ جو سلیمان نے اختیار کی (وہ اجرائی لحاظ سے زیادہ مناسب تھی اور " وکلاً اتینا حکماً و علماً " (ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو حکم و علم دیا تھا) کا جملہ جو اگلی آیت میں آئے گا دونوں فیصلوں کی درستی پر گواہ ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بعید نہیں ہے کہ یہ بات مشاورت کے طور پر ہی ہو، ایسی مشاورت کہ جو احتمالاً سلیمان کی آزمائش اور امر قضاوت میں ان کی لیاقت کو آزمانے کے لیے صورت پذیر ہوئی ہو۔ "حکمھما" (ان دونوں کا حکم) کی تعبیر بھی ان کے آخری حکم کے ایک ہونے پر گواہ ہے۔ اگرچہ ابتداء میں دو مختلف تجویزیں ہی تھیں (غور کیجیے گا)۔

ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

لم یحکما انما کانا یتناظران

انہوں نے آخری فیصلہ نہیں دیا تھا وہ تو اس میں اپنی اپنی آراء پیش کر رہے تھے اور مشورہ کر رہے تھے۔[۱]

ایک اور روایت سے کہ جو اصول کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ماجرا داؤد کے وصی و جانشین کے تقرر کے لیے آزمائش کے طور پر تھا۔[۲]

بہرحال بعد والی آیت میں سلیمان کے فیصلے کی اس صورت میں تائید کی گئی ہے: "ہم نے یہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا تھا" اور ہماری تائید سے اس نے اس جھگڑے کے حل کی بہترین راہ معلوم کرلی (ففھمناھا سلیمان)۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ غلط تھا۔ کیونکہ قرآن ساتھ ہی کہتا ہے: ہم نے اُن دونوں میں سے ہر ایک کو آگاہی اور فیصلے کی اہلیت اور علم عطا کیا تھا (وکلاً اتینا حکماً و علماً)۔

اس کے بعد ایک اور اعزاز کہ جو خدا نے حضرت داؤدؑ کو دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور اسی طرح پرندوں کو بھی (وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر)۔

---

[۱] "من لا یحضرہ الفقیہ"۔

[۲] مزید وضاحت کے لیے تفسیر صافی میں زیر بحث آیہ کے ذیل رجوع کریں۔



Marfat.com

یہ سب باتیں ہماری قدرت کے سامنے کوئی اہم چیز نہیں ہیں" ہم یہ کام انجام دینے پر قادر تھے (وکنا فاعلین)۔

## ایک نکتہ :

اِس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ پہاڑ اور پرندوں کا داؤد کے ساتھ ہم صدا ہونا کس صُورت میں تھا۔ مختلف مفسرین کی بعض آراء ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں :

۱۔ کبھی تو یہ احتمال ظاہر کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی آواز بڑی پُرکشش تھی کہ جو پہاڑوں میں گونجا کرتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

۲۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تسبیح ایک ایسے شعور کی حامل تھی کہ جو ذرّات عالم کے باطن میں موجود ہے۔ کیونکہ اس نظریے کے مطابق عالم کے تمام موجودات عقل و شعور رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ جس وقت حضرت داؤد کی مناجات و تسبیح سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہمصدا ہو جاتے تھے اور ان کی تسبیح کا غلغلہ بھی ان کی آواز کے ساتھ مل جاتا تھا۔

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہی "تسبیح تکوینی" ہے کہ جو تمام موجوداتِ عالم زبان حال سے کرتی ہیں کیونکہ ہر موجود کا ایک نظام ہے ایک ایسا نظام کہ جو بہت ہی دقیق اور حساب شدہ ہے۔ یہ دقیق اور حساب شدہ نظام ایک ایسے خدا کے وجود پر دلالت کرتا ہے کہ جو پاک و منزہ بھی ہے اور صفاتِ کمال کا مالک بھی۔ عالمِ ہستی کے اس حیرت انگیز نظام کی بنا پر ہر گوشہ میں تسبیح اور حمد جاری ہے۔ (تسبیح کا معنی نقائص سے پاک شمار کرنا ہے اور حمد اس کی صفاتِ کمال کی تعریف کرنا ہے[1]۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تسبیح تکوینی نہ تو پہاڑوں اور پرندوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ تمام موجودات اس تسبیح میں مصروف ہیں۔

اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے! یہ عمومی تسبیح تو ہے، لیکن سب اس کو سنتے تو نہیں ہیں۔ یہ تو حضرت داؤدؑ کی عظیم رُوح تھی کہ جو اس حالت میں عالمِ ہستی کے اندر اور باطن کی ہم راز اور ان سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی اور وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے اور سُنتے تھے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ ہمصدا ہیں اور تسبیح کر رہے ہیں۔

ان تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی ہمارے پاس کوئی قطعی اور دو ٹوک دلیل نہیں ہے۔ آیت کے ظاہر سے، جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ ہمصدا ہو جاتے تھے اور خدا کی تسبیح کرتے تھے۔ البتہ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ان تینوں کو ایک ساتھ بھی لیا جا سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

زیر بحث آخری آیت میں ایک اور نعمت کی طرف کہ خدا نے اس عظیم پیغمبر کو عطا کی تھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اُسے زرہ بنانے کی تعلیم دی تھی تاکہ تمہاری جنگوں میں تمہاری حفاظت کرے، کیا تم خدا کا اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہو (وعلمناه صنعة لبوس لكم لتحصنكم من بأسكم فهل انتم شاكرون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۴ کے ذیل میں رجوع کریں۔



Marfat.com

"لبوس" جیسا کہ طبرسی مرحوم "مجمع البیان" میں کہتے ہیں، ہر قسم کے دفاعی اور حملوں میں استعمال ہونے والے اسلحہ جیسے زرہ، تلوار اور نیزہ وغیرہ کو کہتے ہیں [1]

لیکن قرآن کی آیت میں جو قرائن ہیں، وہ اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "لبوس" یہاں پر زرہ کے معنی میں ہے کہ جو جنگوں میں حفاظت کے کام آتی ہے۔

لیکن یہ بات کہ خدا نے حضرت داؤد کے لیے لوہے کو کس طرح سے نرم کیا تھا اور انہیں زرہ سازی کی صنعت کس طرح سکھائی، تو اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ سورہ سبا کی آیہ ۱۰ اور ۱۱ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

٭ ٭ ٭

۸۱۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ○

۸۲۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ○

## ترجمہ

۸۱۔ اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ جو اُس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کہ جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا، چلتی تھی اور ہم ہر چیز سے آگاہ تھے۔

۸۲۔ اور شیاطین کے ایک گروہ کو بھی ہم نے اُس کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ وہ اُس کے لیے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی اس کے لیے سرانجام دیتے تھے اور ہم انہیں (بغاوت اور سرکشی کرنے سے) باز رکھتے تھے۔

## تفسیر

### ہوائیں سلیمان کے زیر فرمان:

ان آیات میں بعض ان نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے اپنے ایک اور پیغمبر یعنی سلیمانؑ کو عطا کی تھیں ـــ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تیز اور طوفان خیز ہواؤں کو سلیمان کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جو اُس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھیں کہ جسے ہم نے مبارک

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



Marfat.com

قرار دیا تھا: ( ولسلیمان الریح عاصفة تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا )۔

اور یہ کوئی عجیب کام نہیں ہے۔ کیونکہ ہم ہر چیز سے آگاہ تھے اور ہیں ( وکنا بکل شیء عالمین )۔

ہم عالم ہستی کے اسرار اور اس پر حاکم قوانین اور نظاموں سے بھی آگاہ ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں کس طرح سے زیر فرمان کیا جا سکتا ہے اور اس کام کے نتیجہ اور انجام سے بھی واقف ہیں۔ بہر حال ہر چیز ہمارے علم و قدرت کے سامنے قانع اور تابع فرمان ہے۔

" ولسلیمان ....." کا جملہ " وسخرنا مع داؤد الجبال " کے جملہ پر عطف ہے۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہے کہ ہم کبھی تو پہاڑوں کو اپنے ایک بندے کے لیے مسخر کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے ہمراہ تسبیح کریں اور کبھی ہواؤں کو اپنے کسی ایک بندے کے زیر فرمان کر دیتے ہیں تاکہ وہ اسے ہر جگہ پہنچائیں۔

"عاصفہ" کا لفظ تیز ہوا یا طوفان کے معنی میں ہے جبکہ قرآن کی بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائم اور آہستہ آہستہ چلنے والی ہوائیں بھی سلیمانؑ کے حکم کے تابع تھیں، جیسا کہ سورہ " صٓ " کی آیہ ۳۶ میں ہے:

فسخرنا له الریح تجری بامرہ رخاءً حیث اصاب

ہم نے ہوا کو اس کے تابع فرمان کر دیا تھا کہ وہ نرمی سے آہستہ آہستہ جہاں وہ چاہتا تھا اُسی طرف کو چلتی تھی۔

البتہ یہاں لفظ " عاصفہ " ( تیز و تند ہوا ) کا استعمال ممکن ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی اہمیت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہو یعنی نہ صرف نرم و ملائم ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں بلکہ سخت طوفان اور آندھیاں بھی ان کی اطاعت گزار تھیں۔ کیونکہ دوسری بات زیادہ عجیب اور تعجب انگیز ہے۔

اور یہ ہوائیں صرف سرزمین مبارک ( شام ) کی راہ میں ہی ــــ جو کہ سلیمان کا پایہ تخت تھا ــــ ان کے لیے مسخر نہیں تھیں۔ بلکہ سورہ صٓ کی آیہ ۳۶ کے مطابق، وہ جس طرف بھی چاہتے تھے وہ اسی طرف چلتی تھیں لہٰذا مبارک سرزمین کے نام کی تصریح زیادہ تر اس بنا پر ہے، کہ وہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا دارالسلطنت اور پایہ تخت تھا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ہوا ان کے اختیار میں کس طرح سے تھی اور کتنی سرعت اور تیزی سے چلتی تھی؟

سلیمان اور ان کے اصحاب کس چیز پر بیٹھ کر آیا جایا کرتے تھے؟

چلتے وقت کونسا عامل انہیں گرنے یا ہوا کے دباؤ اور دوسری مشکلات سے محفوظ رکھتا تھا؟

خلاصہ یہ کہ وہ کونسی پُراسرار قدرت اور طاقت تھی کہ جس نے اس زمانے میں ان کے لیے ایسے تیز رفتار سفر کو ممکن بنا دیا تھا[1]

یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ ایک عنایتِ الٰہی اور بخشش خداوندی اور غیر معمولی بات اور معجزہ تھی کہ اس عظیم پیغمبر کے اختیار میں دی گئی تھی اور ہم اُس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہیں اور کتنے ہی ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ جن کو ہم اجمالی طور پر تو جانتے ہیں لیکن ان کی تفصیل نہیں جانتے۔ ہماری معلومات

---

[1] سورۂ سبا کی آیہ ۱۲ " ولسلیمان الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر " سے اجمالی طور پر اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح کے وقت ایک ماہ کی اور عصر کے وقت ایک ماہ کی مسافت طے کیا کرتے تھے ( اُس زمانے کی رفتار کے لحاظ سے )۔



Marfat.com

ان باتوں کے مقابلہ میں کہ جو ہمیں معلوم نہیں ہیں، ایک بہت بڑے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ کی سی ہیں یا ایک عظیم پہاڑ کے مقابلہ میں غبار کے ایک ذرے کی مانند ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک خدا پرست اور موحد انسان کی بصیرت کے لحاظ سے کوئی چیز خدا کی قدرت کے سامنے مشکل اور غیر ممکن نہیں ہے وہ ہر چیز پر قادر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

البتہ حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے دوسرے حیرت انگیز حصّوں کی مانند ان کی زندگی کے اس حصّے کے بارے میں بھی بہت سے جھوٹے یا مشکوک افسانے لکھے گئے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قرآن نے یہاں پر بیان کیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دورِ حاضر کے مصنفین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے حضرت سلیمانؑ اور ان کی بساط کے ہوا کے ذریعے چلنے کے بارے میں کوئی بات صریحی طور پر بیان نہیں کی ہے بلکہ صرف ہوا کو سلیمان کے لیے مسخر کر دینے کی بات کی ہے اور ممکن ہے کہ یہ زراعت سے مربوط مسائل، نباتات میں زرپاشی و تلقیح، گندم وغیرہ کے خرمنوں کو صاف کرتے اور کشتیوں کے چلانے کے لیے ہوا کی طاقت سے استفادہ کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ خاص طور سے جبکہ حضرت سلیمانؑ کی سرزمین (شام) ایک طرف سے تو وہ زرعی زمین تھی اور دوسری طرف سے اس کا ایک اہم حصّہ بحیرۂ روم کے ساحل سے ملتا تھا اور جہازرانی کے لیے کام آسکتا تھا۔[1]

لیکن یہ تفسیر، سورہ "سبا" اور سورہ "صٓ" کی آیات اور بعض روایات کے ساتھ، کہ جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، چنداں مطابقت نہیں رکھتی۔

❁ ❁ ❁

بعد والی آیت حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک اور خاص عنایت کو بیان کرتی ہے: ہم نے بعض شیاطین کو اس کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جو اس کے لیے سمندر میں غوطے لگاتے تھے (اور جواہرات اور قیمتی چیزیں باہر نکال کر لاتے تھے) اور اس کے لیے ان کے علاوہ اور خدمت بھی انجام دیتے تھے: (ومن الشياطين من يغوصون له و يعملون عملاً دون ذٰلك)۔

اور ہم انہیں اس کے فرمان سے سرکشی سے روکے رکھتے تھے (وكنا لهم حافظين)۔

اُوپر والی آیت میں جو کچھ "شیاطین" کے حوالے سے بیان ہوا ہے، سورہ سبا کی آیات میں اسے "جن" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے (سبا۔ ۱۲، ۱۳) سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں "تعبیریں" ایک دوسرے کے کوئی منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "شیاطین" بھی جنوں کے ہی قبیلے سے ہوتے ہیں۔

بہرحال جیسے کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں جن مخلوقات کی ایک ایسی نوع ہے کہ جو عقل شعور استعداد اور جوابدہی رکھتی ہے۔ یہ مخلوق ہم انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اسی وجہ "جن" کے نام سے موسوم ہے اور جیسا کہ سورہ جن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے ان کے بھی انسانوں کی طرح دو گروہ ہیں:

۱۔ صالح مومن ۲۔ سرکش کافر، اور ہمارے پاس ایسی موجودات کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے اور چونکہ مخبر صادق (قرآن) نے ان کی خبر دی ہے لہٰذا ہم انہیں قبول کرتے ہیں۔

سورہ صٓ اور سورہ سبا کی آیات اور اسی طرح زیر بحث آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جنات کا یہ گروہ کہ جو حضرت سلیمانؑ

---

[1] تصص قرآن، ص ۱۸۵ - اعلام قرآن، ص ۳۸۶۔



Marfat.com

کے لیے مسخر تھا سمجھدار، فعال اور ہنرمند افراد پر مشتمل تھا۔
اور " یعملون عملاً دون ذٰلك " (اور اس کے علاوہ ان کے لیے اور کام بھی انجام دیتے تھے) جس چیز کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل سورہ سبا آیت ۱۳ میں آئی ہے۔

یعملون له مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان کالجواب و قدور راسیات

سورہ سبا کی یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس کے لیے "محرابیں" بہت اعلیٰ اور خوبصورت عبادت گاہیں اور ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں بشمول دیگیں، بڑی بڑی سینیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بنایا کرتے تھے۔
حضرت سلیمانؑ کے متعلق بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کا ایک سرکش گروہ بھی موجود تھا کہ جنہیں حضرت سلیمانؑ نے قید کر رکھا تھا:

واٰخرین مقرنین فی الاصفاد[1]

اور شاید: " وکنالھم حافظین " کا جملہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ہم نے سلیمان کے اس خدمت کار گروہ کو سرکشی سے روک رکھا تھا۔
آپ اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاءاللہ سورہ سبا اور سورہ ص کی تفسیر میں پڑھیں گے۔
ہم پھر یاددہانی کراتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کی زندگی اور ان کے لشکر کے بارے میں بہت سے جھوٹے یا مشکوک افسانے گھڑے ہوئے ہیں کہ جنہیں ہرگز قرآن کے متن کے ساتھ مخلوط نہیں کرنا چاہیئے تاکہ وہ بہانہ سازوں کے لیے دستاویز نہ بن جائیں۔

٭ ٭ ٭

۸۳۔ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝
۸۴۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝

## ترجمہ

۸۳۔ اور ایوب (کو یاد کرو) جب کہ اس نے اپنے پروردگار کو پکارا (اور عرض کی) بدحالی اور مشکلات نے میری طرف رُخ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔
۸۴۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جن آلام میں وہ مبتلا تھے انہیں ہم نے برطرف کر دیا (یعنی ان کی بیماری دُور کی اور تندرست کر دیا)

[1] اور دوسروں کو زنجیروں میں جکڑ کے رکھا گیا تھا۔ (ص-۳۸)



Marfat.com

اور اس کے گھر والے اسے پلٹا دیئے اور ان ہی جیسے اسے مزید عطا کیے۔ اپنی رحمت خاص کے طور پر تاکہ یہ عبادت گزاروں کے لیے ایک سبق بن جائے۔

# تفسیر

## حضرت ایوبؑ کی مشکلات سے نجات:

یہ آیات خدا کے ایک اور عظیم پیغمبر اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں ہیں اور وہ " ایوبؑ " ہیں۔ آپؑ وہ دسویں پیغمبر ہیں کہ جن کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف سورہ انبیا میں اشارہ ہوا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی داستان دردناک بھی ہے اور باوقار بھی۔ ان کا صبر و ضبط خصوصاً ناگوار حادثات میں عجیب و غریب تھا، اس طرح سے کہ " صبر ایوب " ایک ضرب المثل بن گیا۔

لیکن زیر بحث آیات میں، خاص طور سے مشکلات سے ان کی نجات اور کامیابی کا ذکر ہے اور کھوئی ہوئی نعمتیں دوبارہ حاصل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ ہر زمانے میں، تمام مومنین کے لیے کہ جو مشکلات میں گھر جاتے ہیں ایک سبق بن جائے خصوصاً مکہ کے مومنین کے لیے ایک سبق تھا کہ جو ان آیات کے نزول کے وقت، دشمن کے تنگ گھیرے میں تھے۔

فرمایا گیا ہے: ایوب کو یاد کرو کہ جس وقت اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا کہ دکھ، درد اور بیماری نے میری طرف رُخ کر لیا ہے اور تو ارحم الراحمین ہے (وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین)۔

" ضُر " (بروزن "حر") ہر قسم کی بیماری اور پریشانی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کی رُوح اور جسم کو عارض ہو اور اسی طرح سے یہ لفظ کسی عضو کا نقص، مال کا تلف ہو جانا، عزیزوں کی موت، حیثیت و مقام کی پامالی اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ ایوبؑ ان میں سے بہت سی تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تھے۔

ایوب نے بھی دوسرے تمام انبیا کی طرح ان طاقت فرسا مشکلات کے دُور ہونے کے لیے دعا کرتے وقت بارگاہ الٰہی میں انتہائی ادب کو ملحوظ رکھا۔ یہاں تک کہ زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالی کہ جس سے شکایت کی بُو آتی ہو۔ صرف اتنا کہا: میں کچھ مشکلات میں گرفتار ہو گیا ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ میری مشکل کو دُور کر دے کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بزرگ و برتر ہے اور بزرگی کے تقاضوں کو جانتا ہے۔

اگلی آیت کہتی ہے: ایوب کی اس دُعا کے بعد ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اس کے رنج، دُکھ اور پریشانی کو برطرف کر دیا: (فاستجبنا لہ فکشفنا مابہ من ضر)۔

اور اس کے خاندان والے اسے پلٹا دیئے اور ان کے ساتھ ان ہی جیسے مزید بھی عطا کیے (و آتیناہ اھلہ ومثلھم معھم)۔

تاکہ یہ ہماری طرف سے ان کے لیے رحمت خاص ہو اور یہ خدا کی عبادت کرنے والوں کے لیے بھی ایک سبق ہو (رحمۃ من عندنا وذکری للعابدین)۔



Marfat.com

تاکہ مسلمان یہ جان لیں کہ مشکلات چاہے جتنی بھی ہوں اور مصیبتیں چاہے جس قدر ہوں، دشمن بھی چاہے جتنے بھی پھیلے ہوئے ہوں اور وہ (دشمن) چاہے جتنی بھی طاقت و قدرت رکھتے ہوں، پھر بھی پروردگار کے تھوڑے سے لطف و کرم سے یہ سب کچھ برطرف ہونے والی چیزیں ہیں، نہ صرف نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات خدا با استقامت صبر کرنے والوں کی جزا کے عنوان سے، جو کچھ ان کے ہاتھ سے گیا ہوا ہوتا ہے، اتنا ہی اور مزید اس پر اضافہ کر دیتا ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے۔ خصوصاً ان مسلمانوں کے لیے جو ان آیات کے نزول کے وقت دشمن کے سخت دباؤ اور بہت زیادہ مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔

## چند نکات:

### ۱- حضرت ایوبؑ کی مختصر داستان

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: کسی شخص نے آپ سے پوچھا، کہ جو مصیبت ایوبؑ کو دامنگیر ہوئی تھی وہ کس لیے تھی؟

امام صادق علیہ السلام نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

> ایوب پر جو مصیبت آئی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہوں نے کوئی کفران نعمت کیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس شکر نعمت کی وجہ سے تھی، کیونکہ ابلیس نے اُن پر حسد کیا اور بارگاہ خدا میں عرض کی کہ اگر وہ تیری نعمتوں کا اتنا شکر ادا کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اسے بڑی خوشحال زندگی دی ہے اگر تو اس سے دنیا کی مادی نعمات کو چھین لے تو پھر وہ ہرگز تیرا شکر ادا نہیں کرے گا تُو مجھے اس کی دنیا پر مسلط کر دے تو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔
>
> خدا نے اس مقصد سے، کہ یہ قصہ راہ حق کے تمام راہیوں کے لیے ایک سند بن جائے، شیطان کو اس بات کی اجازت دے دی وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ایوب کے مال و اولاد کو یکے بعد دیگرے ختم کرتا چلا گیا، لیکن ان دردناک حادثات نے نہ صرف یہ کہ شکر ایوب میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ ان کا شکر اور بھی بڑھتا گیا۔ شیطان نے خدا سے درخواست کی کہ اسے انکی زراعت اور بھیڑوں پر مسلط کر دے۔ یہ اجازت بھی اُسے دے دی گئی اور اُس نے ساری زراعت کو آگ لگا دی اور ساری بھیڑوں کو ہلاک کر دیا۔ پھر بھی ایوب کی طرف سے حمد پروردگا اور شکر میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔
>
> آخر شیطان نے خدا سے یہ درخواست کی کہ وہ ایوب کے بدن پر مسلط ہو جائے اور ان کیلئے شدید بیماری کا سبب بنے اور ایسا بھی ہو گیا۔ اس طرح سے کہ وہ شدت بیماری اور زخموں کی وجہ سے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے بھی مجبور ہو گئے۔
>
> البتہ ان کی عقل و شعور میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔



Marfat.com

خلاصہ یہ کہ تمام نعمتیں یکے بعد دیگرے ایوب سے لی جا رہی تھیں لیکن ان کا شکر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ راہب انہیں دیکھنے کے لیے آئے اور انہوں نے پوچھا:

ہمیں بتا تو سہی! کہ تُو نے کونسا بڑا گناہ کیا ہے کہ ایسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے؟

(اور اس طرح سے ہر کہ و مہ کی شماتت کا آغاز ہو گیا اور یہ امر ایوب پر گراں گزرا) ایوب نے جواب دیا: مجھے اپنے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں نے کسی غذا کا کوئی ایک لقمہ بھی اس وقت تک نہیں کھایا، جب تک کہ کوئی یتیم و ضعیف میرے دسترخوان پر نہ بیٹھا ہو اور خدا کی کوئی اطاعت سامنے نہیں آئی، مگر یہ کہ میں نے اُس میں سے سخت ترین کو اختیار کیا۔

یہ وہ موقع تھا جب ایوب تمام امتحانات سے صبر و شکر کے ساتھ عہدہ برآ ہو چکے تھے، تو زبان مناجات اور دُعا کے لیے کھولی اور خدا سے اپنی مشکلات کا حل انتہائی مؤدبانہ طریقے سے چاہا۔ لہجہ ہر قسم کی شکایت سے خالی تھا۔ وہی دُعا جو مذکورہ بالا آیات میں ابھی گزری ہے۔

"رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین"

اس موقع پر خدا کی رحمت کے دروازے کھُل گئے، مشکلات بڑی تیزی کے ساتھ برطرف ہو گئیں اور نعماتِ الٰہی نے اُن سے بھی کہیں زیادہ کہ جو پہلے ان کے پاس تھیں ان کی طرف رُخ کیا۔[1]

ہاں ہاں! جو مردانِ حق ہوتے ہیں نعمتوں کے دگرگوں ہونے سے ان کے افکار اور طرزِ عمل نہیں بدلتے۔ وہ راحت و آرام میں ہوں یا مصیبت میں آزاد ہوں یا قید میں صحیح سلامت ہوں یا بیمار طاقت و قدرت کی حالت میں ہوں یا ضعف و کمزوری میں خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں پروردگار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور زندگی کے تغیرات اور انقلابات ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ان کی رُوح ایک عظیم سمندر کی مانند ہے کہ جس کے آرام و سکون کو کسی قسم کے طوفان درہم برہم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ ہرگز تلخ حوادث کی کثرت سے مایوس نہیں ہوتے، وہ ڈٹ جاتے ہیں اور استقامت دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کی رحمت کے دروازے کھُل جائیں، وہ جانتے ہیں کہ سخت حوادث خدائی آزمائشیں ہیں کہ جن کے ذریعے وہ کبھی کبھی اپنے خاص بندوں کو آزماتا ہے تاکہ انہیں اور زیادہ جلا بخشے۔

۲۔ **"آتیناه اهله ومثلهم معهم" کی تفسیر:** مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو پھر سے زندگی عطا کر دی تھی اور ان کے علاوہ اور بیٹے بھی انہیں دیئے تھے (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ خدا نے اُن بیٹوں کو بھی کہ جو اس واقعے میں مر سے تھے انھیں رحمت فرمایا اور ان بیٹوں کو بھی زندہ کر دیا جو اس واقعے سے پہلے مر چکے تھے۔[2]

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ خدا نے حضرت ایوبؑ کو نئے بیٹے اور پوتے عنایت کیے کہ جنہوں نے مرجانے والوں کی خالی جگہ کو پُر کر دیا۔

---

[1] تفسیر المیزان، بحوالہ تفسیر قمی۔

[2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۴۴۸۔



Marfat.com

بعض غیر معتبر روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ایوبؑ کے بدن میں شدید بیماری کے زیر اثر اس طرح بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ ان کے قریب نہیں آسکتے تھے لیکن اہل بیتؑ کی طرف سے بیان کی گئی روایات میں اس بات کی نفی کی گئی ہے اور دلیل عقلی بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر پیغمبر میں کوئی نفرت انگیز حالت یا صفت ہوگی، تو یہ بات اس کی رسالت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ پیغمبر کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ تمام لوگ اس سے میل ملاپ رکھ سکیں اور کلمات حق کو اس سے سُن سکیں۔ پیغمبر میں ہمیشہ قوت جذب و کشش ہوتی ہے۔

حضرت ایوبؑ کی داستان کی تفصیل انشاء اللہ سورہ صٓ کی آیہ ۴۱ تا ۴۴ میں بیان ہوگی۔

٭ ٭ ٭

۸۵۔ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ‌ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۝

۸۶۔ وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا‌ ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝

## ترجمہ

۸۵۔ اور اسمٰعیل، ادریس اور ذا الکفل (کو یاد کرو) کہ وہ سب صابرین میں سے تھے۔

۸۶۔ اور ہم نے انہیں رحمت میں داخل کیا، کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔

## تفسیر

### اسماعیلؑ ادریسؑ اور ذا الکفلؑ :

ایوب کی سبق آموز سرگزشت اور طوفان حوادث کے مقابلہ میں ان کے صبر و ضبط کو بیان کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں خدا کے تین دوسرے پیغمبروں کے مقام صبر و شکیبائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اسمٰعیل ادریس اور ذا الکفل کو یاد کرو، وہ سب کے سب صابرین میں سے تھے۔ (واسماعیل و ادریس و ذا الکفل کل من الصابرین)۔

ان میں سے ہر ایک نے دشمنوں کے مقابلہ میں یا زندگی کی طاقت فرسا مشکلات کے سامنے صبر و استقامت دکھائی ہے اور انہوں نے ان حوادث کے سامنے ہرگز گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اُن میں سے ہر ایک استقامت اور پامردی کا ایک نمونہ تھا۔

اس کے بعد اس صبر و استقامت پر ان کے لیے خدا کے عظیم انعام کا ذکر ہے: ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (وادخلناھم فی رحمتنا انھم من الصالحین)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہا کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت عطا کی بلکہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ گویا



Marfat.com

وہ اپنے پورے جسم و جان کے ساتھ رحمتِ الٰہی میں غوطہ زن ہوتے، جیسے کہ وہ پہلے مشکلات کے دریا میں غرق تھے۔

## ادریسؑ اور ذا الکفلؑ :

ادریسؑ خدا کے بزرگ پیغمبر تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے مفسرین کے مطابق وہ حضرت نوحؑ کے والد کے دادا تھے۔ ان کا نام تورات میں اخنوخ اور عربی میں " ادریسؑ " ہے کہ جسے بعض " درس " کے مادہ سے ماخوذ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ وہ مقام نبوت کے علاوہ علم نجوم اور علم ہیئت پر بھی دسترس رکھتے تھے اور کہتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے لباس سینے کا طریقہ انسانوں کو سکھایا تھا۔

باقی رہے ذوالکفل، تو مشہور یہ ہے کہ وہ انبیاءؑ میں سے تھے[1] اگرچہ بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور نیک انسان تھے۔ قرآن کی آیات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نبی تھے کیونکہ انہیں بزرگ انبیاءؑ کے ساتھ شمار کیا گیا ہے اور زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انبیاءؑ بنی اسرائیل میں سے تھے۔[2]

اس نام کے ساتھ ان کو موسوم کرنے کی علت کے بارے میں متعدد احتمالات پیش کیے گئے ہیں البتہ اس بات کی طرف توجہ رہے کہ "کفل" (بروزن فکر) حصہ کے معنی میں بھی ہے، اور کفالت کے معنی میں بھی آیا ہے ــــ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بکثرت عبادات کیں اور اعمال انجام دیئے اس پر اللہ نے اپنی رحمت اور ثواب کا وافر حصہ، انہیں مرحمت فرمایا تھا لہٰذا وہ ذوالکفل کے نام سے موسوم ہوئے (یعنی وافر حصہ والے)

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ انہوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ راتیں عبادت میں کھڑے ہو کر گزاریں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور انہوں نے آخر تک اپنے اس عہد کو پورا کیا لہٰذا ذوالکفل نام ہو گیا۔

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ ذوالکفل حضرت الیاسؑ کا لقب ہے، جیسا کہ 'اسرائیل' حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے، مسیح حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے اور ذاالنون حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔[3]

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فی ظلال، جلد ۵ ص۵۵۶۔

[3] تفسیر فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں اور تاریخ کامل میں بھی یہی لکھا ہے کہ ذوالکفل حضرت ایوبؑ کے ایک بیٹے تھے اور ان کا اصلی نام "بشر" تھا اور وہ شام میں رہتے تھے۔ کامل ابن اثیر ج ۱ ص ۱۳۶۔



Marfat.com

۸۷۔ وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ
فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ٭ اِنِّیۡ كُنۡتُ
مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۚ
۸۸۔ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّیۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنۡجِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝

## ترجمہ

۸۷۔ اور ذوالنون (یونس کو بھی یاد کرو) کہ جب وہ غصے میں آکر (اپنی قوم کے درمیان سے) چلا گیا اور اس کا خیال تھا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ (لیکن جب وہ مگرمچھ کے منہ میں چلا گیا) تو وہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پکارا: خداوندا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو پاک و منزہ ہے، میں ہی قصوروار تھا۔

۸۸۔ ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور اسے رنج سے نجات بخشی اور ہم مومنین کو اسی طرح سے نجات عطا کرتے ہیں۔

## تفسیر

### یونس کی وحشتناک زنداں سے رہائی:

یہ دونوں آیات عظیم پیغمبر یونسؑ کی سرگزشت کا ایک حصہ بیان کر رہی ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے: "ذاالنون" کو یاد کرو جبکہ وہ اپنی بُت پرست اور نافرمان قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے (وذاالنون اذ ذھب مغاضباً)۔

"نون" لغت میں بہت بڑی مچھلی یا مگرمچھ یا ایک بہت بڑے دریائی جانور کے معنی میں ہے، اس بنا پر "ذوالنون" کا معنی ہے مچھلی والا (یا مگرمچھ والا)۔ حضرت یونسؑ کو "ذوالنون" کیوں کہا گیا ہے اس سلسلے میں ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل ہم انشاءاللہ بیان کریں گے۔

بہرحال اس نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہم اُس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔ (فظن ان لن نقدر علیه)[1]

ان کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے اپنی نافرمان قوم میں اپنی رسالت کا کام پوری طرح انجام دے دیا ہے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی ترکِ اولیٰ تک بھی نہیں کیا۔ اور اب جبکہ قوم کو اس کی حالت پر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حالانکہ بہتر یہ تھا

[1] "نقدر" "قدر" کے مادہ سے سخت گیری اور تنگی دینے کے معنی میں ہے چونکہ انسان سخت گیری کرتے وقت ہر چیز کو "قدر" کے ساتھ محدود سمجھتا ہے نہ کہ کھلا ہوا اور بے حساب۔



Marfat.com

کہ وہ ان لوگوں میں رہتے ـــــ اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے اور خونِ جگر پیتے۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور خدا کی طرف رجوع کر لیں۔

آخر کار اسی ترکِ اَولیٰ کی وجہ سے انہیں سختی کا منہ دیکھنا پڑا، ایک بہت بڑے مگرمچھ نے انہیں نگل لیا" اور انہوں نے گھٹاٹوپ اندھیروں میں پکارا: خداوندا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے"؛ (فنادٰی فی الظلمات ان لا الٰہ الا انت)۔

"خداوندا! تو پاک اور منزہ ہے، میں ہی ستمگاروں میں سے تھا"؛ (سبحانک انی کنت من الظالمین)۔

میں نے خود اپنے اُوپر بھی ظلم کیا ہے اور اپنی قوم کے اُوپر بھی مجھے چاہیئے تھا کہ میں اس سے بھی زیادہ شدائد اور سختیوں کو برداشت کرتا اور تمام مصیبتوں کو جھیلتا، شائد وہ راہِ راست پر آجاتے۔ بالآخر ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور غم سے اُسے رہائی بخشی (فاستجبنا لہ ونجیناہ من الغم)۔ اس طرح ہم مومنین کو نجات دیں گے (وکذالک ننجی المؤمنین)۔

ہاں! ہاں! ہم مومنین میں سے جو بھی بارگاہِ خداوندی میں اپنی کوتاہی اور تقصیر پر توبہ کرے گا اور اس کی ذاتِ پاک سے مدد اور رحمت طلب کرے گا تو ہم اس کی دعا قبول کر کے اس کے غم و اندوہ برطرف کر دیں گے۔

۞ ۞ ۞

## چند اہم نکات :

۱۔ **یونسؑ کی سرگزشت** : انشاءاللہ تفصیل کے ساتھ تو حضرت یونسؑ کی سرگزشت سورۂ صافات میں آئے گی لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

وہ سالہا سال تک اپنی قوم کے درمیان (عراق کی سرزمین نینوا میں) دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے۔ لیکن انہوں نے جتنی کوشش کی، ان کے ارشادات اور ہدایت کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تو آپ نے اُن سے خفا ہو کر اُس جگہ کو چھوڑ دیا اور دریا کی طرف چلے گئے۔ وہاں کشتی پر سوار ہو گئے۔ راستے میں دریا میں طوفان آگیا۔ اور سب اہلِ کشتی کے غرق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔

کشتی کے ملاح نے کہا، میرا خیال یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھاگا ہوا غلام موجود ہے کہ جسے دریا میں پھینک دینا چاہیئے۔ (یا اُس نے یہ کہا کہ کشتی زیادہ بوجھل ہے لہذا ہم ایک شخص کو قرعہ کے ذریعے دریا میں پھینک دیں) بہرحال انہوں نے چند بار قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونسؑ کا نام نکلا۔ یونسؑ سمجھ گئے کہ اس کام میں کوئی راز پوشیدہ ہے اور خود کو حوادث کے سپرد کر دیا۔

جس وقت انہیں دریا میں پھینکا گیا تو ایک مگرمچھ نے نگل لیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر زندہ رکھا۔

آخر کار وہ متوجہ ہوئے کہ ان سے ترکِ اَولیٰ ہو گیا ہے۔ لہذا بارگاہِ خدا کا رُخ کیا اور اپنی تقصیر اور کوتاہی کا اعتراف کیا۔ خدا نے بھی ان کی دُعا کو قبول کر لیا اور اس تنگ و تاریک جگہ سے انہیں نجات دی[1]۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ سائنسی لحاظ سے ممکن نہیں ہے لیکن بلا شک و شبہ یہ ایک خلافِ معمول واقعہ ہے نہ کہ

[1] تفسیر فخر رازی، مجمع البیان اور نورالثقلین زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔



Marfat.com

ایک محال عقلی۔ جیسا کہ مُردوں کا زندہ ہو جانا کہ جو نہ صرف خلافِ معمول ہے لیکن محال نہیں ہے ۔ دوسرے لفظوں میں عام اور مروجہ طریقے سے اس کا انجام پانا ممکن نہیں ہے لیکن پروردگار کی بے پایاں اور لامحدود قدرت کی مدد سے کوئی مشکل نہیں رہتی ۔

اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آپ سورہ صافات کی تفسیر میں پڑھیں گے ۔

**۲۔ یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں ؟** ممکن ہے کہ یہ تعبیر دریا اور پانی کی گہرائیوں کی تاریکی اور اس بہت بڑی مچھلی کے پیٹ کی تاریکی اور رات کی تاریکی، کی طرف اشارہ ہو اور ایک روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے ۔ وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے[1]۔

**۳۔ یونسؑ نے کونسا ترکِ اولیٰ کیا تھا ؟** بلاشک وشبہ " مغاضبا " کی تعبیر یونس کے بے ایمان قوم پر ناراض ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اس قسم کا غصہ اور ناراضی ــــ ایسے حالات میں، کہ ایک غمگسار و دلسوز پیغمبر سالہا سال تک گمراہ قوم کو ہدایت کرنے کیلیے مشقت اُٹھاتا رہے لیکن وہ اس کی ہمدردانہ اور خیرخواہانہ دعوت کا ہرگز مثبت جواب نہ دیں ــــ کاملاً طبعی اور فطری بات ہے ۔

دوسری طرف چونکہ حضرت یونسؑ جانتے تھے کہ عنقریب عذابِ الٰہی انہیں آلے گا ۔ اس لیے اس شہر کو چھوڑ دینا کوئی گناہ نہیں تھا لیکن یونسؑ جیسے عظیم پیغمبر کے لیے بہتر یہ تھا کہ پھر بھی آخری لحظے تک ــــ وہ لحظہ کہ جس کے بعد عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا ــــ انہیں چھوڑتے اسی بناء پر حضرت یونسؑ کا نسبتاً عاجلانہ فیصلہ ترکِ اُولیٰ شمار ہوا اور خدا کی طرف سے اس پر مواخذہ کیا گیا ۔

یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف ہم نے داستانِ آدمؑ میں بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ مطلق گناہ نہیں ہے، بلکہ نسبتی گناہ ہے یا دوسرے لفظوں میں "حسنات الابرار سیئات المقربین " کے مصداق ہے ۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد ص۱۱۴ ( اُردو ترجمہ ) کی طرف رجوع کریں ۔

**۴۔ کردار ساز سبق :** " کذٰلک ننجی المؤمنین " کا پُرمعنی جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گرفت اور نجات کے سلسلہ میں جو کچھ حضرت یونسؑ پر گزری، یہ کوئی ایک خصوصی فیصلہ نہیں تھا ۔ بلکہ سلسلۂ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب کے لیے ایک عمومی پہلو رکھتا ہے ۔

بہت سے غم انگیز حوادث اور سخت مشکلات ، خود ہمارے گناہوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ یہ خوابیدہ رُوحوں کو بیدار کرنے کیلیے ایک تازیانہ ہوتی ہیں یا نفسِ انسانی کی دھات کو صاف کرنے کے لیے ایک کٹھالی کی مانند ہوتی ہیں ۔ ایسے موقع پر انسان ان تین نکات کی طرف توجہ کرے تو نجات یقینی ہے کہ جن کی طرف " یونس " نے توجہ کی تھی :

۱۔ حقیقت توحید کی طرف توجہ اور یہ کہ کوئی معبود اور کوئی سہارا اور پناہ گاہ اللہ کے سوا نہیں ہے ۔

۲۔ خدا کو ہر نقص وظلم سے پاک ومنزہ سمجھنا اور اس کی ذاتِ پاک کے بارے میں کسی طرح کی بدگمانی نہ کرنا ۔

۳۔ اپنے گناہ کا اعتراف کرنا ۔

اس بات کی گواہ وہ حدیث ہے کہ جو تفسیر در المنثور میں پیغمبرِ اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

> خدا کے ناموں میں سے ایک نام کہ جس کے ساتھ جو بھی خدا کو پکارے اس کی دُعا قبول ہوگی ، اور جس وقت اس کے ذریعے خدا سے کوئی چیز طلب کرے تو خدا اُسے عطا کرے گا ،

---

[1] نور الثقلین ، ج ۳ ص۴۳۶ ۔



Marfat.com

وہ" یونس" کی دعا ہے ۔

ایک شخص نے عرض کیا : یا رسول اللہ ! کیا وہ یونس کے لیے مخصوص تھی یا مسلمان بھی اس میں شامل ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا :

یہ یونس کے ساتھ بھی مربوط تھی اور تمام مومنین سے بھی مربوط ہے ، جب کہ وہ خدا کو پکارتے ہیں :
کیا تو نے قرآن میں خدا کی یہ گفتگو نہیں سنی :
"وكذٰلك ننجي المؤمنين" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اس طرح سے دعا کرے
خدا نے اس کو قبول کرنے کی ضمانت دے دی ہے [1]

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد صرف الفاظ کا پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کا نفسِ انسانی میں نقش ہو جانا ہے۔ یعنی ان الفاظ کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا تمام وجود اس کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے ۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ خدا کی سزائیں اور عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تو عذاب استیصال ہے ۔ یعنی آخری عذاب کہ جو ناقابلِ اصلاح لوگوں کی تباہی اور نابودی کے لیے آتا ہے کہ جس میں کوئی دعا فائدہ مند نہیں ہوتی کیونکہ طوفانِ بلا کے اتر جانے کے بعد پھر وہی طرزِ عمل شروع ہو جاتا ہے ۔

دوسری قسم کی سزائیں اور عذاب تنبیہی ہوتے ہیں کہ جو تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر جونہی سزا کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے اور جس کو تنبیہ کے طور پر یہ سزا دی جا رہی ہے وہ بیدار اور متوجہ ہو جاتا ہے، تو بلافاصلہ عذاب اور سزا ٹل جاتی ہے ۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفات و بلیات اور ناگوار حوادث کا ایک مقصد بیدار کرنا اور تربیت دینا ہے ۔

حضرت یونسؑ کا واقعہ راہِ حق کے تمام رہبروں کو مختلف حدود میں اس بات کی تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ کبھی پیغام رسانی کی اپنی ذمہ داری کو ختم نہ سمجھیں اور اس راستے میں ہر سعی و کوشش کو کم شمار کریں کیونکہ ان کی مسئولیت اور ذمہ داری بڑی سنگین ہے ۔

٭ ٭ ٭

۸۹۔ وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝

۹۰۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۚ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝

---

[1] تفسیر درالمنثور بہ المیزان کی نقل کے مطابق زیر بحث آیت کے ذیل میں المیزان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں یہ روایت تفسیر درالمنثور کے حوالے سے لکھی گئی ہے ۔



Marfat.com

# ترجمہ

٨٩۔ اور زکریا (کو یاد کرو) کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا (اور عرض کیا)۔ اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ (اور مجھے ایک آبرومند بیٹا عطا فرما) اور بہترین وارث تو تُو ہی ہے۔

٩٠۔ ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے یحییٰ سا بیٹا عطا کیا اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی میں صلاحیت پیدا کر دی کیونکہ وہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور (رحمت کے) شوق اور (عذاب کے) خوف کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور وہ (ادب اور مسئولیت کے احساس سے) ہمارے حضور گڑگڑایا کرتے تھے۔

# تفسیر

## زکریاؑ تنہا نہ رہے:

یہ دونوں آیتیں خدا کے دو اور بزرگ پیغمبروں حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کی زندگی کا ایک گوشہ بیان کر رہی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: زکریا کو یاد کرو جب اُس نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا: پروردگارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے: (وزکریا اذ نادی ربه رب لاتذرنی فردًا وانت خیر الوارثین)۔

زکریا کی عمر کے سالہا سال گزر گئے وہ بہت بوڑھے ہو گئے لیکن ابھی تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور دوسری طرف ان کی بیوی بانجھ تھی اور اب بچہ جننے کے قابل نہ تھی۔

انہیں ایک ایسے بیٹے کی تمنا تھی کہ جو ان کے خدائی پروگراموں کو چلائے تاکہ ان کے تبلیغی کام ادھورے نہ رہ جائیں اور ان کے بعد موقع کی تاک میں رہنے والے بنی اسرائیل ان کے عبادت خانہ اور اس کے اموال و ہدایا پر قابض نہ ہو جائیں — کیونکہ انہیں تو راہِ خدا میں صرف ہونا چاہیئے —

ایسے وقت میں آپؑ نے خلوصِ دل کے ساتھ، بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی۔ آپ نے نہائی ادب کے ساتھ خدا کو پکارا۔ آپ نے لفظ "رب" سے دعا شروع کی۔ وہی رب کہ جس کا لطف و کرم زندگی کے اوّلین لمحے سے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد "لاتذرنی" کی تعبیر آئی ہے۔ یہ لفظ "وذر" (بروزن "مرز") کے مادہ سے، کسی چیز کو معمولی اور کم سمجھ کر بے اعتنائی کی وجہ سے چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لفظ سے حضرت زکریاؑ نے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر میں تنہا رہ گیا تو فراموش ہو جاؤں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میرے پروگرام بھی بُھلا دیئے جائیں گے اور آخر میں "وانت خیر الوارثین" کے جملہ سے اس حقیقت کو بیان کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ دُنیا دارِ بقا نہیں ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تُو بہترین وارث ہے لیکن عالمِ اسباب کے لحاظ سے کسی سبب کی تلاش میں ہوں کہ جو میرے ہدف اور مقصد کی طرف رہنمائی کرے۔

خدا نے حقیقتِ عشق سے سرشار اور پُرخلوص یہ دعا قبول کر لی اور ان کی خواہش پُوری کر دی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کی دعا قبول



Marfat.com

کرلی اور اسے یحییٰ سا بیٹا عطا فرمایا: (فاستجبنا له و وهبنا له یحییٰ)۔

اور اس مقصود تک پہنچنے کے لیے، "اس کی بانجھ بیوی کو درست کر دیا اور اس میں بچے کی پیدائش کی صلاحیت پیدا کر دی: (واصلحنا له زوجه)۔

اس کے بعد اس گھرانے کی تین عمدہ صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ نیک کاموں کی انجام دہی میں جلدی کرتے تھے (انهم کانوا یسارعون فی الخیرات)۔

وہ اطاعت سے عشق اور گناہوں سے وحشت کے ساتھ ہر حالت میں ہمیں پکارتے تھے (ویدعوننا رغبا و رهبا)[1]

وہ ہمیشہ ہمارے سامنے (ادب و احترام اور احساسِ مسئولیت کے ساتھ گڑگڑایا کرتے تھے (وکانوا لنا خاشعین)۔

ان تینوں صفات کا ذکر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انہیں جس وقت کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ کم ظرف اور ضعیف الایمان لوگوں کی طرح ــ غفلتوں اور غرور میں گرفتار نہیں ہو جاتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ضرورت مندوں کو فراموش نہیں کرتے تھے اور اچھے کاموں کے کرنے میں جلدی کرتے تھے۔ وہ حالت نیاز میں بھی اور بے نیازی میں بھی، فقیری میں بھی اور غنا میں بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ نعمتوں کے اپنی طرف رُخ کرنے کی وجہ سے کبر و غرور میں گرفتار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ خاشع و خاضع رہتے تھے۔

٭ ٭ ٭

۹۱۔ وَالَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِیۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَجَعَلۡنٰهَا وَابۡنَهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝

## ترجمہ

۹۱۔ اور یاد کرو اس خاتون کو کہ جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی اور ہم نے اس کے اندر اپنی رُوح میں سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو ہم نے عالمین کے لیے ایک عظیم نشانی قرار دیا۔

---

[1] "رغبا" رغبت، میلان اور لگاؤ کے معنی میں ہے اور "رهبا" خوف، نفرت اور بیزاری کے معنی میں ہے اور یہ بات کہ یہ اعراب کے لحاظ سے، ان کا محل استعمال کیا ہے، تو متعدد احتمالات ہیں۔ ممکن ہے حال ہو، یا مفعول مطلق ہو، یا ظرفیت کا معنی رکھتا ہو" فی حال الرغبة و فی حال الرهبة" اگرچہ نتیجہ ان پانچوں احتمالات کا مختلف ہے لیکن یہ فرق آیت کے مفہوم کے جزئیات میں ہے، اس کی اساس اور نتیجہ میں نہیں ہے۔



Marfat.com

# تفسیر

## مریمؑ پاک دامن خاتون :

اس آیت میں حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کے مقام، عظمت اور احترام کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

مریمؑ کا ذکر۔ بزرگ انبیاءؑ سے مربوط مباحث کے درمیان۔ یا تو ان کے بیٹے عیسیٰؑ کی وجہ سے ہے یا اس بناء پر کہ مریمؑ کی ولادت بھی کئی جہات سے یحییٰ کی ولادت کے مشابہ تھی کہ جس کی تفصیل ہم نے سورہ مریم کی آیات کے ذیل میں بیان کی ہے[1]

اور یا اس بناء پر ہے کہ اس بات کو واضح کیا جائے کہ عظمت، عظیم مردوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسی عظیم عورتیں بھی ہو گزری ہیں کہ جن کی تاریخ ان کی عظمت کی نشانی ہے، جو عالم کی عورتوں کے لیے ایک اسوہ اور نمونہ ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے : یاد کرو مریم کو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی ( والتی احصنت فرجھا )۔

پھر ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھُونکا ( فنفخنا فیھا من رُوحنا )۔

اور اُسے اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو ہم نے عالمین کے لیے عظیم نشانی قرار دیا ( وجعلناھا وابنھا اٰیۃ للعالمین )۔

## چند اہم نکات :

**۱۔ ایک ابہام کی وضاحت :** فرج اصل میں لغت کے لحاظ سے فاصلہ اور شگاف کے معنی میں ہے۔ اور کنائے کے طور پر عورت کی اندام نہانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور چونکہ فارسی میں اس کے کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا بعض اوقات یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ لفظ کہ جو عورت کے اس عضو خاص کے لیے بولا ہے، قرآن میں کیسے آیا ہے ؟ لیکن اس کے کنایہ ہونے کی طرف توجہ اس سوال کو حل کر دیتی ہے۔

زیادہ واضح اور روشن تعبیر میں اگر ہم کنائی معنی کو ٹھیک طور سے تعبیر کرنا چاہیں تو " احصنت فرجھا " کے جملہ کا متبادل فارسی میں یہ ہے کہ " اپنے دامن کو پاک رکھا " تو کیا فارسی میں یہ تعبیر بُری ہے ؟

بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق عربی لغت میں ایسے الفاظ کہ جو عضو خاص کے لیے صراحتاً ہوں، یا جنسی اختلاط میں صراحت رکھتے ہوں، اصلاً موجود ہی نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ کنائے کا ہی پہلو رکھتا ہے۔ مثلاً قرآن کی مختلف آیات میں اختلاط کے بارے میں "لمس کرنا" "داخل ہونا" "ڈھانپنا" (غشیان[2]) " یا بیوی کے پاس جانا[3] " کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ کہ جو سب کنایہ کا پہلو رکھتے ہیں لیکن بعض اوقات فارسی زبان میں ترجمہ کرنے والے ان کے کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اس کنائی معانی کے متبادل کی بجائے فارسی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۳ سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تفسیر دیکھیے۔

[2] سورہ اعراف - ۱۸۹ -

[3] بقرہ - ۲۲۲ -



Marfat.com

کے صریح الفاظ لکھ دیتے ہیں اور یہ بات سوال کا موجب بن جاتی ہے۔

بہرحال اس قسم کے الفاظ کی تفسیر میں کہ جو قرآن میں آتے ہیں، حتمی طور پر ان کے اصلی اور بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا چاہیئے تاکہ اس کے کنایہ ہونے کا پہلو واضح ہو جائے اور ہر قسم کا ابہام ختم ہو جائے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضرت مریمؑ نے اپنی عفت کی حفاظت کی لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی میں یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے کسی مرد سے (چاہے حلال ہو یا حرام) ہر قسم کے میل جول سے خود کو بچائے رکھا[1] جیسا کہ سورۂ مریم کی آیہ ۲۰ میں ہے کہ:

ولم یمسسنی بشر ولم اک بغیّاً

نہ تو کبھی کسی بشر نے مجھے چھوا ہے اور نہ ہی میں کوئی بدکار عورت ہوں[2]

درحقیقت یہ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش اور ان کے معجزہ ہونے کے ذکر کی تمہید ہے۔

**۲۔ "روحنا" سے مراد:** جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک باعظمت اور بلند حوصلہ رُوح کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح میں اس قسم کی اضافت "اضافتِ تشریفیہ" کہلاتی ہے، کہ ہم کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے اس کی اضافت خدا کی طرف کر دیتے ہیں، مثلاً: "بیت اللہ" (خدا کا گھر) اور "شہر اللہ" (خدا کا مہینہ)۔

٭ ٭ ٭

**۳۔ ماں بیٹا ایک معجزہ:** زیر نظر آیت کہتی ہے: "ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو تمام جہان والوں کے لیے ایک آیت اور نشانی قرار دیا۔ انہیں دو آیتیں یا دو معجزات نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اس بزرگ آیت اور معجزہ میں، مریم کا وجود ان کے بیٹے کے ساتھ اس طرح ملا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بیٹے کا باپ کے بغیر پیدا ہونا اتنا ہی اعجاز آمیز ہے، جتنا کہ کسی عورت کا شوہر کے بغیر حاملہ ہونا۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات بچپن میں بھی اور بڑے ہو کر بھی ان کی والدہ کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

ان تمام امور میں سے ہر ایک، عام طبعی اسباب سے ہٹ کر اور خلافِ معمول تھا۔ یہ سب امور اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ سلسلۂ اسباب کے ماوراء ایک ایسی قدرت بھی موجود ہے جو جب چاہے، ان کی روش کو بدل دے۔ بہرحال مسیحؑ اور ان کی والدہ مریمؑ کی کیفیت پوری انسانی تاریخ میں بے نظیر ہے نہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ اس کے بعد دیکھا گیا ہے اور شاید لفظ "آیت" کا نکرہ" کی صورت میں کہ جو عظمت کی دلیل ہے، اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر فی ظلال زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] سورۂ مریم ۲۰۔



Marfat.com

۹۲۔ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ○

۹۳۔ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ○

۹۴۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ
وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ○

## ترجمہ

۹۲۔ یہ (عظیم پیغمبر کہ جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور ان کے پیروکار) سب ایک ہی اُمت ہیں (اور ایک ہی ھدف اور مقصد کے پیرو ہیں) اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس میری ہی عبادت کرو۔

۹۳۔ (بے علم اور بے خبر پیروکاروں کے ایک گروہ نے) آپس میں اپنے کام میں تفرقہ ڈال دیا ہے (لیکن آخرکار سب کے سب ہماری طرف پلٹ کر آئیں گے۔

۹۴۔ جو شخص بھی کچھ اعمالِ صالح بجالائے گا جب کہ وہ باایمان بھی ہو، تو اس کی کوششوں کی ناقدری نہیں ہوگی اور ہم ان کے تمام اعمال لکھ رہے ہیں (تاکہ سب کو بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کا بدلہ دیا جائے)

## تفسیر

### ایک اُمّت :

گزشتہ آیات میں خدا کے بعض پیغمبروں کے نام آئے ہیں اور اسی طرح مریم جیسی مثالی خاتون کا نام آیا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی بیان ہوئے ہیں۔ زیر بحث آیات میں، مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ عظیم پیغمبر کہ جن کی طرف اشارہ ہوا ہے سب کے سب ایک ہی اُمت تھے (ان هٰذه امتكم امّة واحدة)۔

اُن سب کا پروگرام بھی ایک تھا اور ان کا ھدف و مقصد بھی ایک ہی تھا۔ اگرچہ زمانہ اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف خصوصیات اور ان کا اندازِ کار کچھ مختلف تھا یعنی ان کی تکنیک مختلف تھی۔

لیکن سب کے سب آخرالامر ایک ہی مسلک اور راہ پر گامزن تھے۔ وہ سب کے سب توحید کی راہ میں شرک کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور دنیا کے لوگوں کو یگانگت، حق اور عدالت کی دعوت دیتے تھے۔

پروگراموں اور ھدف و مقصد کی یہ یگانگت اور وحدت اِس بناء پر تھی کہ وہ سب کے سب ایک ہی مبداء سے فیض حاصل کرتے تھے



Marfat.com

جو خدائے واحد و یکتا کا ارادہ تھا۔ لہذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: میں تم سب کا پروردگار ہوں لہذا تم صرف میری ہی عبادت کرو:
(وانا ربکم فاعبدون)۔

درحقیقت انبیاء کی توحید عقیدتی و عملی کا سرچشمہ وحی ہے۔ اور یہ گفتگو علی علیہ السلام کی اُس بات سے مشابہ ہے کہ جو آپؑ نے اپنے بیٹے امام مجتبیٰؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرمائی تھی:

واعلم یا بنی انه لو کان لربك شریك لاتتك رسله، ولعرفت افعاله وصفاته۔

اے بیٹا! جان لے کہ اگر تیرے پروردگار کا کوئی اور بھی شریک ہوتا، تو اس کے رسول بھی تیری طرف آتے، تو اس کے ملک اور آثارِ قدرت کو بھی دیکھتا اور اس کے افعال و صفات کو بھی پہچانتا[۱]

اُمّت جیسا کہ راغب کتاب مفردات میں کہتا ہے، ہر اس گروہ اور جمعیت کے معنی میں ہے کہ جس کی کوئی مشترک جہت اس کے افراد کو آپس میں جوڑے رکھے۔ ایک دین، ایک زمانہ یا ایک معین مکان کا اشتراک چاہے یہ وحدت اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔

بعض مفسرین نے " اُمّت واحدۃ " کو یہاں " دینِ واحد" کے معنی میں لیا ہے لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ تفسیر اُمّت کے لغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتی۔

بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس آیت میں " اُمّت " سے مراد، تمام زمانوں اور قرنوں کے تمام انسان ہیں یعنی اے تمام انسانو! تم سب کے سب ایک ہی اُمّت ہو، تمہارا پروردگار بھی ایک ہے اور تمہارا حقیقی مقصد بھی ایک ہے۔

یہ تفسیر اگرچہ گزشتہ تفسیر کی نسبت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس آیت کے، پہلی آیتوں کے ساتھ تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، یہ صحیح نظر نہیں آتی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ جملہ اُن ہی انبیاء و مرسلین کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے حالات کی تفصیل گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہے۔

٭ ٭ ٭

اگلی آیت میں، لوگوں کی اکثریت کے اس توحیدی بنیاد سے انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ اپنے معاملے میں اختلافات کا شکار ہو گئے: (وتقطعوا امرهم بينهم)۔

معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو لعن و نفرین کرنے لگا اور اس سے بیزار ہو گیا۔ انہوں نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہتھیار نکال لیے اور بہت زیادہ خونریزی کی اور یہ توحید اور حق کے دینِ واحد سے انحراف کا نتیجہ تھا۔

" تقطعوا " مادہ "قطع" سے ہے۔ یہ ایک باہم ملی ہوئی چیز کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں کر دینے کے معنی میں ہے۔ یہ "باب تفعل" سے آیا ہے۔ کہ جو قبول کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جملے کا مفہوم اس طرح ہوگا: وہ تفرقہ اور نفاق کے عوامل کے

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔



Marfat.com

سامنے جھک گئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے گانگی کو قبول کر کے اپنی فطری اور توحیدی وحدت کو ختم کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ہر قسم کی شکست ، ناکامی اور بدبختی میں گرفتار ہو گئے ۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے : لیکن یہ سب کے سب آخر کار ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے ( کل الینا راجعون )۔

یہ اختلاف جو عارضی ہے ختم ہو جائے گا اور پھر قیامت میں سب کے سب وحدت ہی کی طرف جائیں گے ۔ قرآن کی مختلف آیات میں اس مسئلے پر بہت تاکید کی گئی ہے کہ قیامت کی خصوصیات میں سے ایک ، اختلافات کا ختم ہو جانا اور وحدت کی طرف چل پڑنا ہے ۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۸ میں ہے :

الی اللہ مرجعکم جمیعًا فینبئکم بما کنتم فیه تختلفون

تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف رکھتے تھے تمہیں وہ اُن سے آگاہ کرے گا ۔

یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں نظر آتا ہے[1]۔

اور اس طرح سے انسانوں کی خلقت " وحدت " سے ہی شروع ہوتی ہے اور وحدت کی طرف ہی لوٹ جائے گی ۔

آخری زیر بحث آیت میں پروردگار کی پرستش کی راہ میں " اُمتِ واحدہ " کے ساتھ ہم آہنگی کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے : جو کوئی بھی کچھ اعمالِ صالح انجام دے گا ، جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو ، تو اس کی جدوجہد اور کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی :

( فمن یعمل من الصالحات وهو مؤمن فلا کفران لسعیه )۔

اور مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے : اور ہم اس کے اعمالِ صالح یقیناً لکھیں گے ( وانا له کاتبون )

اِس آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح ایمان اور عملِ صالح کا انسانوں کی نجات کے لیے دو اساسی اور بنیادی ارکان کے طور پر ذکر ہوا ہے لیکن لفظ " من " کے اضافہ کے ساتھ کہ جو تبعیض کے لیے آتا ہے ۔ یہ اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ تمام اعمال کی انجام دہی بھی شرط نہیں ہے بلکہ اگر صاحبانِ ایمان کچھ بھی عملِ صالح بجالائیں تو بھی وہ اہل نجات و سعادت ہیں ۔

بہرحال یہ آیت قرآن کی بہت سی دوسری آیات کی طرح ، اعمالِ صالح کی قبولیت کی شرط ایمان کو شمار کرتی ہے ۔

" لا کفران لسعیه " کے جملہ کا ذکر ، اس قسم کے افراد کی جزا کے بیان کرنے کے لیے ، ایک ایسی تعبیر ہے کہ جو انتہائی لطف و محبت اور بزرگواری کے ساتھ ملی ہوئی ہے کیونکہ خدا اس مقام پر اپنے بندوں کی قدردانی کرتے ہوئے ان کی سعی و کوشش کا شکریہ ادا کر رہا ہے ۔ یہ تعبیر اُس تعبیر کی مانند ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۹ میں بیان ہوئی ہے :

ومن اراد الاٰخرة وسعیٰ لها سعیها وهو مؤمن فاولٰئك كان سعیهم مشكورًا

جو شخص آخرت کے گھر کی خواہش کرے گا ، اور اس کے لیے سعی و کوشش کرے گا ۔ جبکہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو ، تو اُس کی کوشش کی قدردانی کی جائے گی ۔

---

[1] آل عمران - ۵۵ ، انعام - ۱۶۴ ، نحل - ۹۲ اور حج ۶۹ وغیرہ ۔



Marfat.com

۹۵۔ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○

۹۶۔ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ○

۹۷۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○

## ترجمہ

۹۵۔ وہ شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے (گناہوں کی پاداش میں) ہلاک کر دیا، ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ (اس دنیا میں) پلٹ سکیں۔

۹۶۔ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ تیزی کے ساتھ ہر بلندی سے گزر جائیں گے۔

۹۷۔ اور (قیامت کے بارے میں) حق کا وعدہ (ایفا کے) قریب ہو جائے گا، تو اس وقت کافروں کی آنکھیں وحشت کی وجہ سے حرکت چھوڑ دیں گی، (وہ کہیں گے) وائے ہو ہم پر کہ ہم اس کے بارے میں غفلت میں تھے، ہم تو ظالم تھے۔

## تفسیر

### کفّار قیامت کے آستانے پر:

گزشتہ آیات میں نیکو کار مومنین کے بارے میں گفتگو تھی اور زیر بحث پہلی آیت میں ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ان کے نقطۂ مقابل میں واقع ہیں وہ لوگ کہ جو آخری سانس تک گمراہی اور برائی پر باقی رہتے ہیں۔

فرمایا گیا ہے: ان بستیوں پر کہ جنہیں ہم نے ان کے گناہوں کے جرم میں نابود کر دیا ہے، حرام ہے کہ وہ دنیا کی طرف پلٹ کر آئیں، وہ ہرگز واپس نہیں آئیں گے:



Marfat.com

(وحرام علیٰ قریۃ اھلکناھا انھم لا یرجعون)[1]

درحقیقت وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو عذابِ الٰہی دیکھنے کے بعد یا ہلاکت کے بعد اور عالمِ برزخ میں جانے کے بعد غرور و غفلت کے پردوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے ہٹا ہوا پائیں گے۔ تو آرزو کریں گے کہ اے کاش! وہ ان تمام خطاؤں اور گناہوں کی تلافی کرنے کے لیے، دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ جاتے، لیکن قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ ان کی بازگشت بالکل حرام یعنی ممنوع ہے۔

یہ اسی بات کے مشابہ ہے کہ جو سورۂ مؤمنون کی آیہ ۹۹ میں بیان ہوئی ہے:

حتیٰ اذا جآء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت کلا۔۔۔

ان کی یہ کیفیت اسی طرح باقی رہے گی، یہاں تک کہ ان کی موت (کا وقت) آن پہنچے گا تو وہ یہ کہیں گے: پروردگارا! ہمیں دنیا کی طرف پلٹا دے تاکہ وہ نیک اعمال کریں جو ہم نے ترک کردیئے ہیں انجام دیں لیکن وہ سوائے منفی جواب کے اور کچھ نہیں سنیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرے بیانات بھی ذکر ہوئے ہیں کہ جن میں سے بعض کی طرف نیچے حاشیہ میں اشارہ ہوگا[2]

بہرحال یہ بے خبر لوگ ہمیشہ غفلت اور غرور میں ہی رہیں گے اور ان کی یہ بدبختی اسی طرح باقی رہے گی یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے گی۔

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یہ بات اس وقت تک ہوتی رہے گی یہاں تک کہ یاجوج و ماجوج پر راہ کھول دی جائے گی اور وہ ساری زمین میں پھیل جائیں اور وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں: (حتیٰ اذا فتحت یأجوج ومأجوج وھم من کل حدب ینسلون)۔

یاجوج و ماجوج کون لوگ تھے، کہاں رہتے تھے اور آخرکار وہ کیا کریں گے اور ان کا کیا انجام ہوگا؟

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "حرام" خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور "انھم لا یرجعون" کا جملہ اس پر دلیل ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

حرام علی اھل قریۃ اھلکناھا ان یرجعوا الی الدنیا انھم لا یرجعون

جن اہلِ قریہ کو ہم نے ہلاک کیا ہے ان پر حرام ہے کہ وہ پلٹ آئیں، وہ نہیں پلٹیں گے۔

[2] بعض نے "حرام" کو یہاں "واجب" کے معنی میں لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ لغتِ عرب میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور وہ لفظ "لا" کو زائدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے حساب سے آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا:

آخرت میں ان کی بازگشت واجب اور ضروری ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ "حرام" حرام ہی کے معنی میں ہے، لیکن "لا" زائدہ ہے، یعنی ان کی بازگشت اس جہان کی طرف حرام ہے۔

بعض مفسرین نے آیت کو خدا اور توبہ کی طرف بازگشت نہ ہونے کے معنی میں لیا ہے (تفسیر مجمع البیان اور فخر رازی زیر بحث آیہ کے ذیل میں)

بعض یہ کہتے ہیں کہ آیت نفی در نفی کے قبیل سے ہے اور یہ اس بات کو بیان کرتی ہے کہ یہ حرام ہے کہ وہ قیامت میں پلٹ کر نہ آئیں یعنی وہ پلٹ کر آئیں گے۔ (تفسیر نہج الصادقین زیر بحث آیہ کے ذیل میں) لیکن جو کچھ ہم نے متن میں بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔



Marfat.com

اس بارے میں ہم نے سورہ کہف کی آیہ ۹۴ کے ذیل میں اور اس کے بعد بحث کی ہے اور اسی طرح اس" سد" کے بارے میں بھی کہ جو " ذوالقرنین" نے ان کے حملوں کو روکنے کے لیے پہاڑوں کے ایک تنگ درہ میں بنائی تھی، تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

کیا ان دونوں گروہوں کے کھل جانے سے مراد، اس سد کا ٹوٹ جانا، اور ان کا اس راستے سے دنیا کے دوسرے علاقوں میں نفوذ کرنے سے مراد کرۂ زمین میں ہر جانب اور ہر طرف سے نفوذ ہے؟ زیر نظر آیت نے صریح طور پر اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی ہے۔ صرف زمین میں پھیل جانے کو عالم کے اختتام کی ایک نشانی اور قیامت کے آنے کی ایک تمہید کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے: اس وقت خدا کا وعدۂ حق نزدیک آپہنچے گا: (واقترب الوعد الحق)۔

اور ایک گھبراہٹ اس طرح کفار کے سارے وجود پر چھا جائے گی کہ ان کی آنکھیں حرکت نہیں کر پائیں گی، اور وہ یہ منظر حیرانی کے ساتھ دیکھیں گے: (فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا)۔

اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت اور غرور کے پردے ہٹ جائیں گے اور انہیں پکاریں گے: وائے ہو ہم پر، ہم تو اس منظر سے غفلت میں ہی تھے: (یا ویلنا قد کنا فی غفلة من ھذا)۔

اور چونکہ اپنے اس عذر سے اپنے گناہ نہیں چھپا سکیں گے اور خود کو بری بھی قرار نہ دے سکیں گے، لہذا صراحت کے ساتھ کہیں گے: نہیں بلکہ ہم ہی ظالم تھے: (بل کنا ظالمین)۔

اصولی طور پر خدا کے ان تمام پیغمبروں اور آسمانی کتابوں اور ان تمام ہلا دینے والے حوادث اور اسی طرح ایسے عبرت آموز سبقوں کے باوجود ـــ کہ جو زمانہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے ـــ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ پھر بھی غفلت میں رہیں، لہذا جو کچھ ان سے سرزد ہوا ہے، تقصیر ہے اور خود اپنے اوپر بھی اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم ہے۔

## چند الفاظ کے لغوی معنی:

"حدب" (بروزن "ادب") ایسی بلندیوں کے معنی میں ہے کہ جو پستیوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کبھی انسان کی پشت کے ابھار کو بھی "حدب" کہتے ہیں۔

"ینسلون" "نسول" کے مادہ سے (بروزن "فضول") تیزی سے نکلنے کے معنی میں ہے۔

یہ جو یاجوج و ماجوج کے بارے میں ہے کہ وہ ہر بلندی سے تیزی کے ساتھ گزریں گے اور نکلیں گے، یہ ان کے کرۂ زمین میں بہت زیادہ نفوذ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

"شاخصة" "شخوص" (بروزن "خلوص") دراصل گھر سے باہر نکلنے کے معنی میں ہے۔ یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف نکل جانے کے معنی میں ہے اور چونکہ تعجب اور حیرانی کے وقت انسان کی آنکھ گویا یہ چاہتی ہے کہ وہ باہر نکل آئے، لہذا اس حالت کو بھی "شخوص" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ جو قیامت میں گنہگاروں کو لاحق ہوگی۔ وہ ایسے حیران ہوں گے کہ گویا ان کی آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے حلقہ سے باہر نکل آئیں۔



Marfat.com

٩٨۔ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط
أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝

٩٩۔ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ط وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

١٠٠۔ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ۝

١٠١۔ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ لا أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝

١٠٢۔ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ج وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ۝

١٠٣۔ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا
يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝

## ترجمہ

٩٨۔ تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہوں گے، اور تم سب کے سب اس میں جاؤ گے۔

٩٩۔ اگر یہ خدا ہوتے تو ہرگز اس میں نہ جاتے اور وہ سب کے سب ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

١٠٠۔ وہاں پر وہ دردناک طریقے سے نالہ و فریاد کرتے ہوں گے اور وہاں انہیں کچھ سنائی نہ دے گا۔

١٠١۔ لیکن وہ لوگ کہ جن سے ہم نے پہلے سے اچھا وعدہ کیا ہوا ہے، انہیں اس سے دور ہی رکھا جائے گا۔

١٠٢۔ وہ جہنم کی آگ کی آواز (تک بھی) نہیں سنیں گے اور وہ اسی میں کہ جس میں ان کا دل چاہے گا، ہمیشہ (نعمتوں میں) رہیں گے۔

١٠٣۔ انہیں وہ عظیم وحشت محزون و مغموم نہیں کرے گی اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے بڑھیں گے (اور یہ کہیں گے) کہ یہی تو وہ دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔



Marfat.com

# تفسیر

## جہنم کا ایندھن :

گزشتہ آیات میں ظالم مشرکین کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی ۔ ان آیات میں رُوئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے . اُن کی اور ان کے معبودوں کے مستقبل کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے : تم بھی اور جن جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو (سب کے سب) جہنم کا ایندھن ہیں ( انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم )۔

" حصب " دراصل پھینکنے کے معنی میں ہے ۔ خصوصاً ایندھن کے ٹکڑوں کو تنور میں پھینکنے کو " حصب " کہا جاتا ہے ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ " حطب " ( بروزن سبب ) کہ جو ایندھن کے معنی میں ہے ، عربوں کی مختلف زبانوں میں مختلف تلفظ رکھتا ہے ۔ بعض قبیلے اسے " حصب " اور بعض دوسرے اس کو " حضب " کہتے ہیں ، اور چونکہ قرآن قبائل اور دلوں کو جوڑنے کے لیے آیا ہے لہذا بعض اوقات ان کے مختلف الفاظ کو بھی استعمال کرتا ہے تاکہ اس طریقے سے دل جمع ہوں ۔ یہ لفظ " حصب " بھی ایسے الفاظ میں سے ہے کہ جو اہل یمن کے قبائل لفظ " حطب " کی جگہ تلفظ کرتے ہیں [1]

بہر حال زیر بحث آیت مشرکین سے کہتی ہے کہ جہنم میں آگ جلانے والا ایندھن جس سے اس کے شعلے پیدا ہوں گے ، خود تم اور تمہارے بناوٹی خدا ایندھن کے بے قدر و قیمت ٹکڑوں کی طرح یکے بعد دیگرے جہنم میں پھینکے جاؤ گے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : تم اس میں جاؤ گے ( انتم لها واردون )۔

یہ جملہ یا تو گزشتہ بات کی تاکید کے طور پر ہے یا ایک نئے نکتہ کی طرف اشارہ ہے ، اور وہ یہ ہے کہ پہلے تو بتوں کو آگ میں ڈالیں گے ، پھر تم ان پر وارد ہو گے ، گویا تمہارے خدا اس آگ کے ساتھ کہ جو ان کے وجود سے نکلے گی ، تمہارا استقبال کریں گے [2]

اگر یہ سوال ہو کہ بتوں کو جہنم میں ڈالنے کا کیا فلسفہ ہے ، تو اس کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ بھی بُت پرستوں کے لیے ایک قسم کا عذاب اور سزا ہے کیونکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ وہ اس آگ میں کہ جس کے شعلے اُن کے بتوں سے نکل رہے ہیں ، جل رہے ہیں ۔

علاوہ ازیں یہ بات ان کے نظریات کی تحقیر و تذلیل ہے ، کہ وہ اس قسم کی بے قدر و قیمت چیزوں کی پناہ لیا کرتے تھے ۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ ( مایعبدون ) ان معبودوں کے معنی میں ہو کہ جو بے جان پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بُت ہیں ( جیسا کہ " ما " کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ " ما " عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے ) لیکن اگر اس کے مفہوم کو عام سمجھیں اور اس میں وہ شیاطین بھی شامل ہوں کہ جو معبود بنے ہوئے تھے تو پھر ان معبودوں کا جہنم میں آنا بالکل واضح ہے کیونکہ وہ تو خود شریک جُرم ہیں ۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

[2] اس بات پر توجہ رہے کہ پہلی صورت میں " لها " کی لام " الی " کے معنی میں ہے اور " ها " کی ضمیر جہنم کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری تفسیر میں بھی لام " الی " کے معنی میں ہے لیکن ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہے ۔



Marfat.com

اس کے بعد عمومی نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر یہ بت خدا ہوتے تو ہرگز جہنم کی آگ میں نہ پہنچتے (لوکان هؤلاء الهة ماوردوها)۔

لیکن یہ جان لو کہ نہ صرف یہ کہ وہ جہنم میں پہنچیں گے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے (وکل فیها خالدون)۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ بت پرست ہمیشہ اپنے خداؤں کے ساتھ ہی رہیں گے۔ وہ خدا کہ جن کی وہ ہمیشہ پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں مصیبتوں میں ڈھال سمجھتے تھے اور اپنی مشکلات کا حل ان سے چاہتے تھے۔

ان "گمراہ عبادت کرنے والوں" کی " ان بے قدر و قیمت معبودوں " کے ساتھ دردناک کیفیت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے: وہ دوزخ میں دردناک نالہ و فریاد کریں گے (لهم فیها زفیر)۔

"زفیر" اصل میں ایسی چیخ و پکار کرنے کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ سانس کی آواز بھی آرہی ہو۔ بعض نے کہا کہ خچر کی نفرت انگیز آواز کو ابتداء میں "زفیر" اور آخر میں "شھیق" کہتے ہیں۔ بہر حال یہاں ایسے نالہ و فریاد کی طرف اشارہ ہے کہ جو غم و اندوہ کی وجہ سے نکلے[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ غم انگیز نالہ و فریاد صرف ان عبادت کرنے والوں کے ساتھ ہی مربوط نہ ہو بلکہ شیاطین کہ جو ان کے معبود تھے وہ بھی اس میں ان کے شریک ہوں۔

بعد کا جملہ ان کی ایک اور دردناک سزا کو بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: انہیں دوزخ میں کچھ سنائی نہیں دے گا: (وهم فیها لایسمعون)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہیں سنیں گے کہ جو ان کے لیے راحت کا باعث بنے۔ بلکہ وہ دوزخیوں کے جانکاہ نالے اور عذاب کے فرشتوں کی جھڑکیاں ہی سنیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں آگ کے تابوتوں میں رکھا جائے گا، اس طرح سے کہ وہ کسی کی آواز کو بالکل نہیں سنیں گے۔ گویا وہ اکیلے ہی عذاب میں ہیں اور یہ بات خود زیادہ عذاب کا سبب ہے کیونکہ اگر انسان کے ساتھ اور افراد بھی زندان میں ہوں تو یہ بات اس کے دل کی تسلی کا باعث ہوگی کیونکہ:

البلیة اذا عمت طابت

بلا و مصیبت جب عام ہو تو وہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

اگلی آیت سچے مومنین اور صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کے حالات بیان کر رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ سے دونوں کی کیفیت زیادہ واضح ہوجائے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ لوگ کہ جن سے ہم نے ان کے ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے پہلے سے اچھا وعدہ کر رکھا ہے، وہ اس وحشتناک اور ہولناک آگ سے دُور رہیں گے (ان الذین سبقت لهم منا الحسنیٰ اولئک عنها مبعدون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد نہم میں سورہ ھود کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں رجوع کریں۔



Marfat.com

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے اس جہان میں مومنین سے جتنے وعدے کیے ہیں، ہم انہیں پورا کریں گے ان میں سے ایک ان کا جہنم کی آگ سے دُور رہنا ہے۔

اگرچہ اس جملے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تمام سچے مومنین کے لیے ہوگا لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ جیسے معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ ایک گروہ جن کی عبادت ان کی خواہش اور مرضی کے بغیر کرتا تھا۔ اور چونکہ سابقہ آیات یہ کہتی تھیں کہ تم بھی اور تمہارے معبود بھی دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس تعبیر سے ممکن تھا کہ حضرت عیسیٰؑ جیسے افراد بھی شامل سمجھ لیے جاتے، لہٰذا قرآن یہ جملہ فوراً ایک استثنا کے طور پر بیان کرتا ہے کہ ایسے لوگ ہرگز دوزخ میں نہیں جائیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بارے میں ایک شانِ نزول ذکر کی ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض لوگوں نے یہی سوال پیغمبر اسلامؐ سے بھی کیا تھا لہٰذا یہ آیت ان کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

لیکن اس حالت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیرِ نظر آیت اُس سوال کا جواب بھی ہو اور سب سچے مومنین کے بارے میں ایک عمومی حکم بھی ہو۔

آخری زیرِ بحث آیات میں خدا کی چار عظیم نعمتوں کا ذکر ہے کہ جو ان لوگوں کو میسر ہوں گی:

پہلی یہ کہ وہ آگ کی آواز تک نہیں سنیں گے (لا یسمعون حسیسها)۔

"حسیس" جیسا کہ اربابِ لغت نے کہا ہے۔ محسوس آواز کے معنی میں ہے اور خود حرکت یا خود حرکت سے جو آواز پیدا ہو اس کے معنی میں بھی ہے۔ دوزخ کی آگ کہ جو ہمیشہ آتش گیریوں میں بڑھتی ہی جاتی ہے، ایک مخصوص آواز رکھتی ہے۔ یہ آواز دو جہت سے وحشتناک ہے، ایک تو اس لحاظ سے کہ یہ آگ کی آواز ہے، اور دوسرے اس لحاظ سے کہ یہ آگے بڑھنے کی آواز ہے۔

سچے مومنین چونکہ جہنم سے دُور رہیں گے، لہٰذا یہ وحشتناک آوازیں ہرگز ان کے کانوں میں نہیں پڑیں گی۔

دوسری یہ، کہ "وہ جیسی نعمت میں چاہیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں مستغرق رہیں گے (وهم فيما اشتهت انفسهم خالدون)۔

یعنی وہاں پر اس جہان کی طرح کی محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تو انسان بہت سی نعمتوں کی آرزو کرتا ہے لیکن ان تک نہیں پہنچ پاتا۔ وہاں پر وہ جو بھی مادی و معنوی نعمت چاہے گا، اس کی دسترس میں ہوگی۔ وہ بھی ایک دن یا دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

تیسری یہ کہ: عظیم وحشت انہیں مغموم نہیں کرے گی (لا یحزنهم الفزع الاکبر)۔

"فزع اکبر" (عظیم اور بڑی وحشت) کو بعض نے روزِ قیامت کی وحشتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ وہ ہر وحشت سے بڑی ہے اور بعض نے صور کا پھونکا جانا اور اس جہان کے ختم ہونے کی زبردست کیفیت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جیسا کہ سورہ نمل کی آیہ ۸۷ میں ہے:

لیکن چونکہ قیامت کے دن کی وحشت مسلم طور پر اس سے زیادہ اہم ہے، لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں ان لوگوں کے لیے آخری نعمت کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ، رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے، انہیں مبارکباد دیں گے اور یہ بشارت دیں گے کہ یہ وہی دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا: (وتتلقاهم الملائكة هذا



Marfat.com

یومکم الذی کنتم توعدون)۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

فبادروا باعمالکم تکونوا مع جیران اللہ فی دارہ ، رافق بھم رسلہ ، وازارھم ملائکتہ ، واکرم اسماعھم ان تسمع حسیس نار جھنم ابدًا ۔

نیک اعمال کی طرف جلدی کرو ، تاکہ تم خدا کے گھر میں اس کے پڑوسی بنو۔ ایسے مقام پر کہ جہاں پیغمبروں کو ان کا رفیق قرار دیا ہے اور فرشتوں کو ان کی زیارت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ خدا نے ان لوگوں کی اتنی عزت بڑھائی ہے کہ ان کے کان جہنم کی آگ کی آواز تک نہیں سنیں گے۔ [1]

۱۰۴۔ یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ○

## ترجمہ

۱۰۴۔ وہ دن کہ جب ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے خطوط کے کاغذوں کو آپس میں لپیٹا جاتا ہے۔ (پھر) جس طرح سے ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی ، اسی طرح سے اُسے واپس لوٹائیں گے۔ یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور ہم یقینی طور پر اسے انجام دیں گے۔

## تفسیر

### جب آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا :

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں تھا کہ سچے مومنین عظیم وحشت سے غمگین نہیں ہوں گے۔ یہاں پر اس بڑی وحشت کے دن کا ایک اور رُخ پیش کیا جا رہا ہے اور درحقیقت اس وحشت کی عظمت کی علت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

[1] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۸۳۔



Marfat.com

یہ معاملہ اُس دن حقیقت کی صُورت اختیار کرلے گا کہ جب ہم آسمانوں کو اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ جس طرح خطوں کو لپیٹا جاتا ہے (یوم نطوی السمآء کطی السجل للکتب)[1]۔

گزشتہ زمانے میں خطوط لکھنے کے لیے اور اسی طرح کتابیں لکھنے کے لیے، طومار (لپٹے ہوئے کاغذ) کی طرح کے اوراق استعمال ہوتے تھے۔ ان طوماروں کو لکھنے سے پہلے لپیٹ دیتے تھے اور لکھنے والا بتدریج آہستہ آہستہ اُسے ایک طرف سے کھینچتا رہتا تھا اور جو مطالب اُسے لکھنا ہوتے تھے اس کے اُوپر لکھا کرتا تھا اور لکھائی ختم ہونے کے بعد پھر انھیں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کے خطوط اور کتابیں بھی طومار کی شکل میں ہوتی تھیں اُس طومار کو "سجل" کا نام دیا جاتا تھا کہ جس کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس آیت میں، دنیا کے اختتام پر، عالمِ ہستی کے لپیٹ دیئے جانے کی، ایک لطیف تشبیہ ہے۔ اس وقت اوراق کے یہ طومار کھلے ہوئے ہیں اور اس کے تمام نقوش اور خطوط پڑھے جارہے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قائم اور برقرار ہے لیکن جب قیامت کا حکم ہو جائے گا تو یہ عظیم طومار اپنے تمام خطوط و نقوش کے ساتھ لپیٹ دیئے جائیں گے۔

البتہ دنیا کے لپیٹے جانے کا معنی اس کا مٹنا اور نابود ہونا نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے خیال کر رکھا ہے۔ بلکہ اس کا درہم برہم ہو کر مل جانا اور اکٹھا ہو جانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان کی شکل و صُورت تو بگڑ جائے گی، لیکن اس کا مادہ نابود اور ختم نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آیاتِ معاد کی مختلف تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے مثلاً انسان کا بوسیدہ ہڈیوں اور قبروں سے اُٹھنا ـــــ

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ: "جس طرح ہم نے اُسے ابتداء میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) دوبارہ پلٹائیں گے" یہ کام ہماری عظیم قدرت کے سامنے کوئی مشکل نہیں ہے (کما بدأنا اول خلق نعیدہ)۔

درحقیقت یہ تعبیر اُس تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سُورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں ہے:

کما بدأکم تعودون

جس طرح سے اُس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا اسی طرح لوٹائے گا۔

اسی طرح:

وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ و ھو اھون علیہ

اور وہی ذات تو ہے جس نے خلقت کی ابتداء کی، پھر اس کو لوٹائے گا اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے (روم - ۲۷)[2]

---

[1] "سِجل" (بروزن "سطل") بڑے اور پانی سے بھرے ہوتے ڈول کے معنی میں ہے، اور "سِجِلّ" (سین اور جیم کی زیر اور لام کی شد کے ساتھ) اُن پتھروں کے ٹکڑوں کے معنی میں ہے کہ جن کے اُوپر لکھا جاتا تھا، اس کے بعد ان تمام اوراق کو کہ جن پر مطالب لکھتے ہیں کہا گیا ہے (مفردات راغب و قاموس)۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیئے کہ "کطی السجل للکتب" کے جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "طی" جو کہ مصدر ہے "سجل" کی طرف جو کہ اس کا مفعول ہے، مضاف ہے، اور "للکتب" میں جو لام ہے وہ اضافت کی ہے یا بیانِ علت کے لیے۔ (غور کیجئے)

[2] (اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)



Marfat.com

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ اس بازگشت سے مراد، فنا و نابودی کی طرف بازگشت یا آغاز آفرینش کی طرح آپس میں لپیٹ دینا ہے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اور یقیناً ہم اُسے انجام دیں گے۔ (وعدًا علینا انا کنا فاعلین)[۱] —

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کی پہلی صُورت میں بازگشت سے مراد یہ ہے کہ انسان دوبارہ ننگے پاؤں اور عُریاں — جیسا کہ ابتدائے خلقت میں تھے — پلٹ کر آئیں گے لیکن بلا شک اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم اسی معنی میں منحصر ہے، بلکہ یہ تو مخلوق کے پہلی صُورت میں لوٹنے کی ایک شکل ہے۔

۞ ۞ ۞

۱۰۵۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ○

۱۰۶۔ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ○

## ترجمہ

۱۰۵۔ ہم نے ذکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث ہوں گے۔

۱۰۶۔ اس میں عبادت گزاروں کے لیے ایک روشن ابلاغ ہے۔

---

(از گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) البتہ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ خدا کی لا متناہی قدرت کے بارے میں "مشکل اور آسان" کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ سب کچھ ایک جیسا ہے۔ اس بنا پر جو تعبیر مذکورہ بالا آیت میں آئی ہے، حقیقت میں انسانوں کی نظر کے لحاظ سے ہے۔

(اس صفحہ کا حاشیہ)

[۱] "وعدًا" "وعدنا" کا مفعول ہے جو کہ مقدر ہے۔

یہ جملہ حقیقت میں چند قسم کی تاکیدیں لیے ہوئے ہے: مثلاً "وعدًا"، "علینا" (ہم پر) پھر "انا" کے ساتھ تاکید اور دوسرے "کنا" میں فعل ماضی کا استعمال اور اسی طرح "فاعلین" کا لفظ۔



Marfat.com

# تفسیر

## زمین کی حکومت صالحین کے لیے ہوگی ،

گزشتہ آیات میں صالح مومنین کے لیے اُخروی جزا کے ایک حصّے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں نہایت عُمدگی اور فصاحت سے ان کی ایک واضح دُنیاوی جزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے زمین کی حکومت — ارشاد ہوتا ہے،
ہم نے "زبور" میں "ذکر" کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ آخر کار میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وارث ہو جائیں گے"
(ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون)۔

"ارض" سارے کرہ زمین کو کہا جاتا ہے اور سارا جہان اس میں شامل ہے، مگر یہ کہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو۔ اگرچہ بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت میں ساری زمین کا وارث ہونا ہے لیکن لفظ "ارض" کا ظاہری معنی جب کہ یہ مطلق طور پر بولا جائے، اس جہان کی زمین ہی ہوتا ہے۔[1]

لفظ "ارث" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، اس چیز کے معنی میں ہے کہ جو بغیر معاملہ اور خرید و فروخت کے کسی کی طرف منتقل ہو اور کبھی قرآن مجید میں "ارث" ایک صالح قوم کے غیر صالح قوم پر تسلط اور کامیابی، اور ان کے تمام سرمائے و وسائل کو اپنے قبضہ اور اختیار میں لینے کے لیے بولا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۳۷ میں بنی اسرائیل کی فرعونیوں پر کامیابی کے بارے میں بیان ہوا ہے:

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا

ہم نے زمین کے مشرق و مغرب کو، اس مستضعف قوم کی میراث میں دے دیا۔

اگرچہ "زبور" اصل میں ہر قسم کی کتاب اور تحریر کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید میں تین مواقع میں سے دو موقعوں پر یہ لفظ حضرت داؤد کی زبور کی طرف اشارہ ہے لیکن بعید نہیں کہ تیسرے موقع پر یعنی زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

"زبور داؤد" یا "عہد قدیم" کی کتابوں کی تعبیر میں "مزامیر داؤد" اللہ کے نبی حضرت داؤد کی نصیحتوں، دعاؤں اور مناجات کا ایک مجموعہ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "زبور" سے مراد یہاں گزشتہ انبیاء کی تمام کتب ہیں۔[1]

لیکن مذکورہ دلیل کے پیش نظر — یہی معلوم ہوتا ہے کہ "زبور" سے مراد "مزامیر داؤد" ہی ہے۔ خاص طور پر جب کہ موجودہ مزامیر میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں کہ جو زیر بحث آیت سے بالکل مطابقت رکھتی ہیں۔ انشاء اللہ ان کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

"ذکر" دراصل یاد آوری یا اس چیز کے معنی میں ہے جو تذکر و یاد آوری کا باعث بنے۔ قرآن کی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی حضرت موسیٰ کی آسمانی کتاب یعنی توارت پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے مثلاً سورۂ انبیاء کی آیہ ۴۸ میں:

ولقد اتینا موسیٰ وھارون الفرقان وضیاء وذکرا للمتقین

---

[1] یہ احتمال تفسیر مجمع البیان اور تفسیر فخر رازی نے چند گزشتہ مفسرین سے نقل کیا ہے۔

Marfat.com

اور کبھی یہ لفظ قرآن کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ تکویر کی آیہ ۲۷ :

ان ھو الا ذکر للعالمین

لہذا بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں ذکر سے مراد قرآن ہے اور زبور سے مراد تمام گزشتہ کتب ہیں اور "من بعد" کا لفظ، تقریباً فارسی کے لفظ "علاوہ بریں" کے ہم معنی ہے۔[1] اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہوگا :

ہم نے قرآن کے علاوہ، تمام گزشتہ انبیاءؑ کی کتابوں میں بھی لکھ دیا تھا کہ آخر کار تمام رُوئے زمین خدا کے صالح بندوں کے اختیار میں قرار پا جائے گی۔

لیکن آیت میں جو تعبیرات استعمال ہوئی ہیں ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ظاہر یہ ہے کہ زبور سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہی ہے اور "ذکر" تورات کے معنی میں ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زبور تورات کے بعد تھی تو "من بعد" کی تعبیر بھی حقیقی ہی ہوگی اور اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا :

ہم نے تورات کے بعد، زبور میں یہ لکھ دیا تھا کہ اس زمین کی میراث ہمارے صالح بندوں تک پہنچے گی۔

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آسمانی کتابوں میں سے صرف انہی دو کتابوں کا نام کیوں لیا گیا ہے؟

ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ حضرت داؤدؑ ان بزرگ ترین پیغمبروں میں سے ایک تھے کہ جنہوں نے حق اور عدالت کی حکومت قائم کی اور بنی اسرائیل بھی وہ مستضعف قوم تھے کہ جنہوں نے مستکبرین کے خلاف قیام کیا اور ان کے اقتدار کو ختم کر کے ان کی حکومت اور سرزمین کے وارث ہو گئے۔

ایک اور سوال کہ جو یہاں باقی رہ جاتا ہے، یہ ہے کہ خدا کے صالح بندے (عبادی الصالحون) کون ہیں؟

بندوں کی خدا کی طرف اضافت پر توجہ کرتے ہوئے، ان کے ایمان اور توحید کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور لفظ "صالحین" کی طرف توجہ کرنے سے جو کہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے، تمام اہلیتیں اور لیاقتیں ذہن میں آجاتی ہیں۔ عمل و تقویٰ کے لحاظ سے اہلیت علم و آگاہی کے لحاظ سے اہلیت، قدرت و قوت کے لحاظ سے اہلیت اور تدبیر و نظم و ضبط اور اجتماعی شعور کے لحاظ سے اہلیت۔

جس وقت صاحب ایمان بندے اس قسم کی اہلیتیں پا لیں، تو خدا بھی کمک اور مدد کرتا ہے تاکہ وہ مستکبرین کو شکست دے سکیں ان کے آلودہ ہاتھوں کو زمین کی حکومت سے ہٹا سکیں اور ان کی میراثوں کے وارث بن جائیں۔

اس بنا پر صرف "مستضعف" ہونا دشمنوں پر کامیابی اور رُوئے زمین کی حکومت کے لیے کافی نہیں ہوگا بلکہ ایک طرف ایمان ضروری ہے اور دوسری طرف اہلیتوں کا حصول۔ مستضعفین جہان جب تک ان دو اصولوں کو زندہ نہیں کریں گے، رُوئے زمین کی حکومت تک نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] اصطلاحی علمی تعبیر کے مطابق "بعد" کی لفظ یہاں "بعد" رتبی ہے نہ کہ "بعد" زمانی۔ اُردو میں "من بعد" کا متبادل "علاوہ ازیں" یا "اس کے علاوہ" ہے۔



Marfat.com

اس لیے بعد والی آیت میں مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس بات میں ان لوگوں کے لیے کہ جو خدا کی اخلاص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں، ایک واضح اور روشن ابلاغ ہے (ان فی ھذا لبلاغًا لقوم عابدین)۔

بعض مفسرین لفظ "ھٰذا" کو اُن تمام وعدوں اور وعیدوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو اس سورہ میں ہیں یا سارے قرآن میں ہیں۔

لیکن آیہ کا ظاہر یہ ہے کہ "ھٰذا" اسی وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو گزشتہ آیت میں خدا نے اپنے صالح بندوں سے رُوئے زمین کی حکومت کے بارے میں کیا ہے۔

* * *

## چند اہم نکات:

**۱۔ قیامِ مہدیؑ کے سلسلہ میں روایات:** بعض روایات میں یہ آیت صراحت کے ساتھ حضرت امام مہدیؑ کے یار و انصار کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ جیسا کہ مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے اسی آیت کے ذیل میں منقول ہے:

هم اصحاب المهدی فی آخر الزمان:

وہ صالح بندے کہ جن کا خدا نے اس آیت میں وارثانِ زمین کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ آخری زمانے میں مہدی کے اصحاب و انصار ہیں۔

تفسیر قمی میں بھی اس آیت کے ذیل میں ہے:

ان الارض یرثها عبادی الصالحون، قال القائم واصحابه

اس سے مراد کہ زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے، مہدیٔ قائمؑ اور ان کے اصحاب ہیں۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے کہ یہ روایات اسی ایک عالی اور آشکار مصداق کا بیان ہیں۔ ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ یہ تفاسیر ہرگز آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتیں۔

لہٰذا جس زمانے میں بھی اور جس جگہ بھی خدا کے صالح بندے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو وہ کامیاب ہوں گے اور آخر کار زمین اور اس کی حکومت کے وارث ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا روایات تو خصوصیت سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شیعہ سُنی کتب میں حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی بہت زیادہ روایات ہیں جو پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیتؑ سے منقول ہیں: اور سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آخر کار اس جہان کی حکومت صالحین کے ہاتھ آ جائے گی اور خاندانِ پیغمبرؐ سے ایک شخص قیام کرے گا کہ جو زمین کو عدل و داد سے اس طرح سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی۔

ان میں سے ایک یہ مشہور حدیث ہے جو اکثر منابع اسلامی میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے:



Marfat.com

لو لم يبق من الدنيا الا يوم ،لطول الله ذلك اليوم حتى يبعث رجلاً (صالحًا) من اهل بيتي يملأ الارض عدلاً و قسطًا كما ملئت ظلمًا وجورًا -

" اگر دنیا کی عمر میں سے ایک ہی دن باقی رہ جائے ، تو بھی خدا اس دن کو اس قدر طولانی کر دے گا کہ میرے خاندان میں سے ایک مرد صالح کو مبعوث کرے گا کہ جو صفحۂ زمین کو اس طرح سے عدل و انصاف سے معمور کر دے گا کہ جس طرح سے وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی ۔

یہ حدیث انہی الفاظ میں یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ بہت سی شیعہ اور اہل سُنّت کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے [1]

ہم سورہ توبہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے بزرگ شیعہ سنی علماء متقدمین و متاخرین نے اپنی اپنی کتابوں میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیامِ مہدی کے سلسلہ کی احادیث حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اور کسی طرح سے بھی قابلِ انکار نہیں ہیں ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ کتابیں لکھی ہیں کہ جن کی تفصیل آپ تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد سورہ توبہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں مطالعہ فرما سکتے ہیں ۔

**۲۔ مزامیر داؤدؑ میں صالحین کی حکومت کی بشارت :** قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کتاب مزامیر داؤد میں کہ جو اس وقت کتبِ عہدِ قدیم کا حصہ ہے بالکل وہی تعبیر کہ جو مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے یا اُس سے ملتی جلتی کئی مقام پر دکھائی دیتی ہے ۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان تمام تحریفات کے باوجود کہ جو ان کتابوں میں کی گئی ہیں ، یہ حصہ اس طرح کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے ۔ مثلاً :

۱۔ مزمور ۳۷ جملہ ۹ میں ہے :

" ... کیونکہ شریر منقطع ہو جائیں گے لیکن خدا پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے اور عنقریب شریر نیست و نابود ہو جائیں گے ۔ تو اس کی جگہ کے بارے میں جتنا بھی پوچھے گا کچھ معلوم نہ ہو گا ۔

۲۔ اور اسی مزمور میں دوسری جگہ (جملہ - ۱۱) میں ہے :

: لیکن انکسار و تواضع سے زمین کے وارث ہو کر بڑی سلامتی پائیں گے ۔

۳۔ اور اسی مزمور ۳۷ کے جملہ ۲۷ میں یہ موضوع ایک اور تعبیر کے ساتھ بھی دکھائی دیتا ہے :

کیونکہ متبرکانِ خدا زمین کے وارث ہو جائیں گے لیکن اس کے ملعونین منقطع ہو جائیں گے ... ...

۴۔ اسی مزمور کے جملہ ۲۹ میں ہے :

صدیقین زمین کے وارث ہو جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے ۔

۵۔ اور اسی مزمور کے جملہ ۱۸ میں ہے :

---

[1] مزید معلومات کے لیے کتاب " منتخب الاثر " اور " نور الابصار " کی طرف رجوع کریں ۔



Marfat.com

خدا صالحین کے دلوں کو جانتا ہے اور ان کی میراث ابدی ہوگی۔[1]

یہاں پر ہم خوب دیکھ رہے ہیں کہ وہی صالحین کا لفظ کہ جو قرآن میں آیا ہے مزامیر داؤد میں بھی نظر آرہا ہے اس کے علاوہ دوسری تعبیریں "صدیقین" "متوکلین" "متبرکین" اور "متواضعین" کہ جو اس تعبیر کے ساتھ ملتے جلتے ہیں، وہ بھی دوسرے جملوں میں مذکور ہیں۔

یہ تعبیریں صالحین کی عمومی حکومت کی دلیل ہیں اور قیام مہدی کی احادیث کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔

۳۔ **صالحین کی حکومت ایک قانون آفرینش ہے:** اگرچہ یہ بات ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے زیادہ تر ظالموں جابروں اور سرکشوں کی حکومتوں کو ہی دیکھا ہے، اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ قبول کرنا مشکل ہے کہ یہ سب حکومتیں قوانین جہان خلقت کے برخلاف ہیں اور جو ان قوانین سے ہم آہنگ ہے وہ صرف صاحب ایمان صالحین کی حکومت ہے۔

لیکن منطقی اور فلسفی تجزیوں کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" کا جملہ اس سے پہلے کہ ایک خدائی وعدہ ہو ایک قانون تکوینی بھی شمار ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے جہان ہستی مختلف نظاموں کا مجموعہ ہے۔ اس پورے عالم میں منظم اور عمومی قوانین کا وجود اس نظام کی یگانگت اور ہم آہنگی کی دلیل ہے۔

عالم آفرینش کی وسعت میں نظم، قانون اور حساب کا مسئلہ، اس عالم کے اساسی ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کئی سوطاقتور کمپیوٹر مل کر خلائی سفر کے لیے دقیق حساب کر رہے ہیں اور ان کے حسابات بالکل درست بیٹھتے ہیں اور چاند گاڑی اسی پہلے سے مقررشدہ جگہ پر چاند میں جا اترتی ہے حالانکہ چاند اور زمین کا کرہ دونوں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں تو ہمیں اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ اس بات کا اس طرح ہونا، نظام شمسی اور اس کے ستاروں اور چاند کے دقیق نظام کے ماتحت ہونے کا مرہون منت ہے کیونکہ اگر وہ ایک سیکنڈ کے سویں حصے کے برابر بھی اپنی منظم رفتار سے منحرف ہو جاتے، تو کچھ معلوم نہیں کہ خلائی مسافر کس مقام پر جا پڑتے۔

اب ہم اس بڑے جہان سے چھوٹے عالم اور اس سے چھوٹے اور بہت ہی چھوٹے عالم میں آتے ہیں۔ یہاں پر خاص طور سے زندہ موجودات میں ایک نمایاں نظم موجود ہے اور اس میں حرج و مرج کی کوئی گنجائش نہیں ہے مثلاً انسان کے دماغ کے ایک خلیے کی تنظیم کی خرابی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کی زندگی کے تمام نظام کو بگاڑ دے۔

اخباروں میں ایک دفعہ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک نوجوان طالب علم کو ٹریفک کا ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس میں وہ شدید دماغی دھچکے کا شکار ہوا تھا اور تقریباً اپنی تمام گزشتہ باتوں کو بھول گیا۔ جبکہ وہ دوسری طرف، ہر طرح صحیح و سالم تھا۔ اخبارات نے لکھا کہ وہ اپنے بھائی اور بہن کو بھی نہیں پہچانتا اور جب اس کی ماں اُسے اپنی آغوش میں لے کر پیار کرتی ہے تو وہ گھبراتا ہے کہ یہ اجنبی عورت میرے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ اُسے اس کمرے میں لے جایا گیا کہ جہاں وہ پل کر بڑا ہوا ہے، وہاں وہ اپنے وسیع کاموں اور اپنی کھینچی

[1] ان جملوں کو عموماً کتب عہد عتیق کے اس فارسی ترجمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جو ۱۸۷۸ء میں کلیسا کی معروف شخصیات کی زیر نگرانی شائع ہوا۔ برطانیہ میں ان شخصیات نے دوسرے ممالک کو بھیجنے کے لیے کتب مقدسہ کے ترجمے کیے تھے۔



Marfat.com

ہوئی تصویروں کو دیکھتا ہے، لیکن کہتا ہے کہ میں اس قسم کے کمرے اور تصویروں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کرّہ سے اس کرّہ میں اُتر آیا ہے کیونکہ تمام چیزیں اس کے لیے نئی ہیں۔

شاید اس کے دماغ کے کروڑوں سیلوں میں سے چند ارتباطی سیل کہ جو گزشتہ کو حال سے ملاتے ہیں بیکار ہوگئے تھے لیکن اسی جزوی تنظیم کے خراب ہونے نے کیا وحشتناک اثر دکھایا۔

تو کیا انسانی معاشرہ "لانظام" حرج ومرج، ظلم وستم، اور ناہنجاری کو انتخاب کرکے، اپنے آپ کو جہانِ آفرینش کے اس عظیم سمندر سے الگ کر سکتا ہے؟ کہ جس میں سب کے سب منظم پروگرام کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

کیا جہان کی وضع عمومی کا مشاہدہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا کہ بشریت بھی خواہ مخواہ عالم ہستی کے نظام کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور منظم اور عادلانہ نظام کو قبول کرے، اپنی اصلی راہ کی طرف پلٹ آئے اور اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے؟!

ہم ہر انسان کے بدن کی گوناں گوں اور پیچیدہ مشین کی ساخت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ دل و دماغ سے لے کر آنکھ، کان زبان یہاں تک کہ بال کی ایک جز کو دیکھتے ہیں، یہ سب کے سب قوانین نظم اور ایک حساب کے تابع ہیں، تو اس حالت میں انسانی معاشرہ ضوابط و قوانین اور صحیح عادلانہ نظام کی پیروی کے بغیر کس طرح برقرار رہ سکتا ہے؟

ہم بقائے بشریت کے خواہاں ہیں اور اس کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں۔ البتہ ابھی تک ہمارے معاشرے کی سطح آگاہی اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ موجودہ راہ و روش کو جاری رکھنے کا انجام ہماری فنا اور نابودی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ادراک اور شعور فکری ہمیں حاصل ہو جائے گا۔

ہم اپنے مفادات کے خواہاں تو ہیں لیکن ابھی تک ہم یہ نہیں جانتے کہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنا، ہمارے مفادات کو برباد کر رہا ہے۔ البتہ آہستہ آہستہ جب ہم بیدار ہوں گے اور اسلحہ سازی پر غور کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ عالمی معاشروں کی آدھی فعال ترین فکری اور جسمانی قوتیں اور عالمی سرمائے کا آدھا حصہ اس راستہ میں رائیگاں جا رہا ہے۔ نہ صرف رائیگاں جا رہا ہے بلکہ دوسرے آدھے کو نابود کرنے کے کام میں لایا جا رہا ہے۔

سطح آگاہی بلند ہوگی تو ہم واضح طور پر جان لیں گے کہ ہمیں عالم ہستی کے عمومی نظام کی طرف پلٹنا چاہیئے اور اُس کے ساتھ ہم آواز ہونا چاہیئے۔

"اور جس طرح سے کہ ہم واقعی طور پر اس کل کی ایک جز ہیں، عملی طور پر بھی ہمیں ایسا ہی ہونا چاہیئے تاکہ ہم تمام مسائل میں اپنے مقاصد تک پہنچ سکیں"۔

نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ جہانِ انسانیت میں نظامِ آفرینش ہی آئندہ زمانے میں ایک صحیح اجتماعی نظام کو قبول کرنے کے لیے ایک روشن دلیل بنے گا اور یہ وہی چیز ہے کہ جو زیر بحث آیت اور "عالم کے مصلح عظیم" (مہدیؑ ارواحنا فداہ) کے قیام سے مربوط احادیث سے معلوم ہوتی ہے [1]

---

[1] یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ بحث سال ۱۴۰۲ کے ماہ شعبان کی پندرہویں رات۔ جو ولادت باسعادت حضرت مہدی امام زمانہ (ارواحنا له الفداء) کی رات ہے، کو لکھی گئی ہے۔ ہم اس بحث کو ایسے وقت میں لکھ رہے ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی خوشیاں منا رہے ہیں۔ ایک تو حضرت مہدیؑ کے میلاد مسعود کی اور دوسری ان کامیابیوں کی کہ جو لشکر اسلام کو محاذِ جنگ پر نصیب ہوئی ہیں اور ہم خدا کا ان سعادتوں کے ملنے پر شکر ادا کرتے ہیں۔

۱۰۷۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○
۱۰۸۔ قُلۡ اِنَّمَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ○
۱۰۹۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ
بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ○
۱۱۰۔ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَـهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ○
۱۱۱۔ وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّـكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ○
۱۱۲۔ قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَـقِّ‌ؕ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ○

# ترجمہ

۱۰۷۔ اور ہم نے تجھے عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
۱۰۸۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو صرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود خدائے یگانہ ہے تو کیا (اس حالت میں حق کے سامنے) سرِ تسلیم خم کرو گے (اور بتوں کو چھوڑ دو گے)۔
۱۰۹۔ اگر (ان تمام باتوں کے باوجود) وہ رُوگردانی کریں تو تم اُن سے یہ کہہ دو کہ میں تم سب کو یکساں طور پر عذاب الٰہی سے خبردار کرتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا کہ (عذاب خدا کا) یہ وعدہ تمہارے نزدیک ہے یا دُور۔
۱۱۰۔ یقیناً وہ آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور جسے تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے (اور کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے)۔
۱۱۱۔ اور میں یہ نہیں جانتا کہ شاید یہ بات تمہارے لیے آزمائش ہو اور ایک (معین) مدت کے لیے فائدہ اٹھانے کے لیے ہو۔
۱۱۲۔ اور (پیغمبر نے) کہا: پروردگارا! تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دے (اور ان سرکشوں کو سزا دے) اور ہمارا پروردگار ہی وہ رحمٰن ہے کہ جس سے میں تمہاری ناروا تہمتوں پر مدد طلب کرتا ہوں۔



Marfat.com

# تفسیر

## عالمین کے لیے پیغمبر رحمتؐ :

گزشتہ آیات صالح بندوں کو رُوئے زمین کی حکومت کی بشارت دے رہی تھیں، اور اس قسم کی حکومت تمام جہانوں کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ اس لیے پہلی زیر بحث آیت میں وجودِ پیغمبرؐ کے رحمت عامہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر عالمین کے لیے رحمت بنا کر (وما ارسلناك الا رحمة للعالمین)۔

دُنیا کے سبھی لوگ خواہ وہ مومن ہوں یا کافر تیری رحمت کے ممنون ہیں کیونکہ تو نے ایسے دین و آئین کی ترویج اپنے ذمہ لی ہے کہ جو سب کی نجات کا سبب ہے۔ اب اگر کچھ لوگوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور کچھ نے نہیں اُٹھایا۔ تو یہ بات خود انہیں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا تیری رحمت کے عمومی ہونے پر کوئی اثر نہیں ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک ساز و سامان سے آراستہ ہسپتال تمام بیماریوں کے علاج کے لیے بنایا جائے جس میں ہر قسم کی دوائیاں اور ماہر طبیب اور ڈاکٹر موجود ہوں اور اس کے دروازے تمام لوگوں کے لیے بلا کسی امتیاز کے کھول دیئے جائیں تو کیا یہ اس معاشرے کے تمام لوگوں کے لیے وسیلۂ رحمت نہیں ہے؟ اب اگر بعض ہٹ دھرم بیمار اس فیض عام کو خود سے قبول کرنے سے انکار کر دیں تو اس مرکز شفا کے عمومی ہونے پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ کے وجود کا تمام جہانوں کے لیے رحمت ہونا تو فاعل کی فاعلیت کے مقتضی ہونے کا پہلو رکھتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فعلیت تبھی نتیجہ خیز ہوتی ہے جب قبول کرنے والے میں قبول کرنے کی قابلیت بھی ہو۔

"عالمین" کی تعبیر ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جس میں تمام ادوار کے تمام انسان شامل ہیں اسی لیے اس آیت کو پیغمبر اسلامؐ کی خاتمیت کے لیے بھی اشارہ سمجھا گیا ہے کیونکہ آپؐ کا وجود آئندہ کے تمام انسانوں کے لیے عالم کے اختتام تک رحمت ہے اور رہبر و پیشوا و مقتدا ہے اور ایک لحاظ سے تو یہ رحمت فرشتوں کے لیے بھی ہے۔

اس سلسلے میں ایک عمدہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس عمومیت کی تائید کرتی ہے۔ حدیث یہ ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا:

هل اصابك من هذه الرحمة شیء

کیا اس رحمت کا کچھ فائدہ تمہیں بھی پہنچا؟

تو جبرئیل نے جواب میں عرض کیا:

انی کنت اخشی عاقبة الامر، فامنت بك، لما اثنی الله علی بقوله
عند ذی العرش مکین

میں اپنے انجام سے ڈرتا تھا لیکن ایک آیت کی وجہ سے کہ جو آپ پر قرآن میں نازل ہوئی ہے



Marfat.com

میں اپنی حالت سے مطمئن ہو گیا ہوں، کیونکہ خدا نے میری اس جملہ کے ساتھ مدح کی ہے:

ذی قوۃ عند ذی العرش مکین (جبرئیل خدا کے ہاں کہ جو خالق عرش ہے بلند مقام و مرتبہ پر ہے)۔[1]

بہرحال موجودہ دُنیا کہ جس کے درو دیوار سے فساد، تباہی اور ظلم و ستم کی بارش ہو رہی ہے۔ جنگوں کے شعلے ہر جگہ بھڑک رہے ہیں اور ظالم قوتوں کا چنگل مظلوم مستضعفین کے گلے دبا رہا ہے۔ اس دنیا میں کہ جس میں جہالت، اخلاقی تباہی، خیانت، ظلم و استبداد اور طبقاتی تفاوت نے ہزاروں قسم کی مشکلات اور مصیبتیں پیدا کر دی ہیں ۔۔ ہاں! ہاں! ایسے جہان میں پیغمبر اکرمؐ کے "رحمۃ للعالمین" ہونے کا مفہوم ہر دور سے زیادہ آشکار اور واضح ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو گی کہ آپؐ ایک ایسا پروگرام لے کر آئے ہیں کہ جس پر عمل سے یہ تمام نامرادیاں، بدبختیاں اور سیاہ کاریاں ختم ہو سکتی ہیں۔

ہاں! ہاں! وہ بھی اور ان کے احکام بھی، آپؐ کا پروگرام اور آپؐ کا اخلاق بھی سب کے سب رحمت ہیں۔ ایسی رحمت کہ جو سب کے لیے ہے اور اس رحمت کی بقا و دوام کا نتیجہ تمام کرۂ زمین پر صاحبانِ ایمان صالحین کی حکومت ہو گا۔

٭ ٭ ٭

اور چونکہ رحمت کا اہم ترین مظہر اور اس کی محکم ترین بنیاد، مسئلہ توحید اور اس کے جلوے ہیں لہٰذا اگلی آیت میں فرمایا گیا:

تم یہ کہہ دو کہ مجھ پر تو یہی وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے (قل انما یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد)۔

تو کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ اس بنیادی اصل یعنی توحید کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو اور بتوں کو چھوڑ دو (فھل انتم مسلمون)۔

درحقیقت اس آیت میں تین بنیادی نکات پیش کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ رحمت کی حقیقی بنیاد توحید ہے اور سچ بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی غور و فکر کریں گے اتنا ہی یہ قوی رابطہ واضح تر اور روشن تر ہوتا جائے گا۔ اعتقاد میں توحید، عمل میں توحید، صفوں میں توحید، قانون میں توحید، غرضیکہ ہر چیز میں توحید۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لفظ "انما" کے تقاضے کے مطابق کہ جو حصر پر دلالت کرتا ہے، اسلام کے پیغمبرؐ کی تمام دعوت کا خلاصہ، اصل توحید ہے۔ گہرا مطالعہ بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اصولِ دین میں بلکہ فروع و احکام تک میں بھی آخرکار توحید ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی بنا پر۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے ۔۔ توحید صرف اصولِ دین کی ایک اصل ہی نہیں بلکہ یہ ایک مضبوط دھاگے کی مانند ہے کہ جو تسبیح کے دانوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک رُوح ہے کہ جو دین کے بدن میں پھونکی گئی ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ تمام معاشروں اور قوموں کی اصل مشکل مختلف شکلوں میں شرک سے آلودگی ہے۔ کیونکہ "فھل انتم مسلمون" (کیا اس اصل کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو) کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ اصل مشکل شرک اور شرک کے مظاہر سے باہر آنا اور بتوں کو توڑنے کے لیے آستینیں چڑھانا ہے۔ نہ صرف پتھر اور لکڑی کے بتوں، بلکہ ہر قسم کے بتوں، خصوصاً انسانی طاغوتوں کو توڑنے کے لیے

٭ ٭ ٭

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



Marfat.com

بعد والی آیت کہتی ہے کہ اگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ ہماری دعوت اور پیغام کی طرف توجہ نہ کریں اور رُوگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم سب کو یکساں طور پر عذاب الٰہی کے خطرے سے آگاہ کرتا ہوں ( فان تولوا فقل اٰذنتکم علی سواء )۔

"اٰذنت" مادہ "ایذان" سے خبردار کرنے کے معنی میں ہے جس کے ساتھ تہدید موجود ہو اور بعض اوقات یہ لفظ اعلانِ جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی اور وہاں نہ تو جہاد کے لیے زمین ہموار تھی اور نہ ہی حکم جہاد نازل ہوا تھا، لہٰذا یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ یہ جملہ یہاں پر اعلانِ جنگ کے معنی میں ہو۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس بات سے یہ چاہتے ہیں کہ اُن سے اعلان نفرت و علیحدگی کریں۔

"علیٰ سواء" کی تعبیر یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مَیں خدا کی سزا اور عذاب کے خطرے سے تم سب کو یکساں طور پر خبردار کرتا ہوں تاکہ وہ یہ تصوّر نہ کرلیں کہ اہل مکہ یا قریش اور دوسروں میں کوئی فرق ہے اور خدا کی بارگاہ میں انہیں کوئی بڑائی یا برتری حاصل ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں اپنی آواز تم سب کے کانوں تک بغیر کسی استثناء کے پہنچا چکا ہوں۔

پھر اسی تہدید کو اور زیادہ آشکار صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مَیں نہیں جانتا کہ عذاب کا وہ وعدہ کہ جو تم سے کیا گیا ہے، قریب ہے یا دُور: ( وان ادری اقریب ام بعید ماتوعدون )۔

یہ خیال نہ کرنا کہ یہ وعدہ دُور ہے، شاید نزدیک ہو اور بہت ہی نزدیک ہو۔

یہ عذاب اور سزا کہ جس کی یہاں انہیں تہدید کی گئی ہے، ممکن ہے کہ عذابِ قیامت ہو یا دُنیا کی سزا اور یا یہ دونوں ہی ہوں پہلی صورت میں اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص ٹھیک طور پر وقوع قیامت کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہے حتیٰ کہ خدا کے پیغمبر بھی۔

اور دوسری اور تیسری صورت میں ممکن ہے کہ اس کی جزئیات اور زمانے کے بارے میں اشارہ ہو، کہ مَیں ان جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم اس قسم کے حادثات کے بارے میں ہمیشہ فعلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ بعض اوقات ارادی پہلو رکھتا ہے یعنی جب تک ارادہ نہ کریں نہیں جانتے[۱]

یہ تصوّر بھی اپنے ذہنوں میں نہ پھٹکنے دو کہ اگر تمہاری سزا میں کچھ تاخیر ہو جائے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا تمہارے اعمال اور تمہاری باتوں سے آگاہ نہیں ہے۔ نہیں! ایسا نہیں ہے! وہ سب کچھ جانتا ہے" وہ تمہاری آشکار باتوں کو بھی جانتا ہے اور اُن باتوں کو بھی کہ جنہیں تم چھپاتے ہو" ( انہ یعلم الجھر من القول ویعلم ما تکتمون )۔

اصولی طور پر پنہاں و آشکار، تمہارے لیے تو مفہوم رکھتا ہے کیونکہ تمہارا علم محدود ہے ـــ لیکن اس ذات کے لیے کہ جس کا علم بے پایاں اور لامتناہی ہے، غیب و شہود ایک ہے اور پوشیدہ اور اعلانیہ یکساں ہے۔

❀ ❀ ❀

علاوہ ازیں اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ خدائی سزا فوری طور پر تمہارے دامن گیر نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے

---

[۱] مزید وضاحت کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم جانشینوںؑ کے بارے میں "کتاب رہبران بزرگ و مسئولیتہائے بزرگ تر" کا مطالعہ کریں۔



Marfat.com

کام سے آگاہ نہیں۔ مجھے کیا معلوم ؟ شاید یہ تمھاری آزمائش کے لیے ہو" (وان ادری لعلہ فتنۃ لکم)۔

"اور وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس دنیا کی لذتوں سے ایک مدت تک بہرہ مند کرے اور اس کے بعد تم سے ہر لے لے اور جزا نے (ومتاع الی حین،

درحقیقت یہاں خدائی سزاؤں کی تاخیر کے دو فلسفے بیان ہوئے ہیں ۔

پہلا فلسفہ امتحان و آزمائش ہے ۔ خدا ہرگز عذاب میں جلد بازی نہیں کرتا تاکہ مخلوق کی کافی حد تک آزمائش کر لے اور اتمام حجت کر دے

دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ کچھ ایسے افراد ہیں کہ جن کی آزمائش تو مکمل ہو چکی ہے اور ان کی سزا کا فیصلہ قطعی ہو چکا ہے لیکن اس غرض سے کہ انہیں سخت سے سخت سزا ہو ، اپنی نعمت کو ان پر وسیع کر دیتا ہے تاکہ وہ پوری طرح نعمت میں غرق ہو جائیں اور ٹھیک اسی حالت میں جب کہ وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں عذاب کے تازیانے اُن پر پڑنے لگیں تاکہ وہ اور بھی زیادہ دردناک اور تکلیف دہ محسوس ہوں اور محروموں اور ستم دیدہ لوگوں کی تکلیفوں کا اچھی طرح احساس کریں ۔

۞ ۞ ۞

آخری زیر بحث آیت کہ جو سورۂ انبیاء کی بھی آخری آیت ہے ، اس سورت کی پہلی آیت کی طرح بے خبر لوگوں کی غفلت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نقل کیا گیا ہے :

اس سے ان لوگوں کے غرور اور غفلت کے بارے میں آپ کی ناراضگی اور پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : پیغمبر نے ان کی تمام رُوگردانیوں اور اعراض کو دیکھنے کے بعد" عرض کیا : میرے پروردگار ! اب حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور اس سرکش گروہ کو اپنی عدالت کے قانون کے مطابق سزا دے" (قال رب احکم بالحق)[1]

دوسرے جملے میں رُوئے سخن مخالفین کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

"ہم سب کا پروردگار خدائے رحمٰن ہے اور ہم اس کی مقدس بارگاہ میں اُن ناروا تہمتوں پر کہ جو تم اس کی طرف دیتے ہو، اسی سے مدد مانگتے ہیں" (وربنا الرحمٰن المستعان علی ما تصفون)۔

درحقیقت لفظ "ربنا" انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہم سب کے سب مربوب مخلوق ہیں اور وہ ہم سب کا خالق و پروردگار ہے ۔

لفظ "الرحمٰن" کہ جو پروردگار کی رحمتِ عامہ کی طرف اشارہ ہے ، انہیں یہ بات سمجھا رہا ہے کہ تمہارے سارے وجود کو خدا کی رحمت نے گھیر رکھا ہے ۔ تو پھر ایک لمحے کے لیے ان سب نعمتوں اور رحمتوں کے پیدا کرنے والے کے بارے میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے ؟

اور "المستعان علی ما تصفون" کی تعبیر انہیں اس بات پر خبردار کر رہی ہے کہ یہ گمان نہ کر لینا کہ ہم تمہاری جمعیت کی کثرت کے مقابلہ میں تنہا ہیں اور یہ تصور بھی کر لینا کہ تمہاری یہ سب تہمتیں اور جھوٹ اور ناروا نسبتیں چاہے وہ خدا کی ذاتِ پاک کی طرف ہوں یا ہماری طرف ان کا جواب ضرور دیا جائے گا ۔ کیونکہ ہم سب کی پناہ گاہ وہی ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے مومن بندوں کا ہر قسم کے جھوٹ اور تہمتوں کے مقابلہ میں دفاع کرے ۔

---

[1] اس میں شک نہیں کہ خدا کا ہر حکم حق کے مطابق ہے لہٰذا "بالحق" یہاں توضیحی پہلو رکھتا ہے ۔



Marfat.com

# اختتام

پروردگارا ! جس طرح تو نے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے قلیل ساتھیوں کو ان کے کثیر دشمنوں کے مقابلے میں اکیلا نہیں چھوڑا ، ہمیں بھی مشرق و مغرب کے ان دشمنوں کے مقابلے میں تنہا نہ رہنے دے کہ جنہوں نے ہماری تباہی کے لیے ایکا کرلیا ہے۔

خداوندا ! تو نے اس پُر برکت سُورت میں اپنی خاص رحمت کا ذکر کیا ہے کہ جو تُو نے اپنے پیغمبروں پر سخت اور بحرانی مواقع میں اور زندگی کے طوفانوں کے مقابلہ میں کی ۔

بارِالٰہا ! ہم بھی اس زمانے میں ایسے طوفانوں میں گرفتار ہیں اور اسی رحمت اور کشائش کے منتظر ہیں ۔ آمین یارب العٰلمین

اسی پر ——

سُورۃ انبیاء

اور

تفسیر نمونہ —— جلد ۱۳

اختتام پذیر ہوئی

—— جمعۃ المبارک

—— ۳۰ شوال المکرم ۱۴۰۲ ہجری

ناصر مکارم شیرازی



Marfat.com

مدینۃ العلم دار العلوم محمدیہ
نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ



تفسیر نمونہ ———— جلد ۱۳
کا
ترجمہ ———— راقم پرتقصیر کے ہاتھوں
اختتام کو پہنچا

بوقت ———— ۱۰ بجے دن
بروز ———— منگل
بتاریخ ———— ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴
برمکان ———— شیخ پرویز انور
بمقام ———— مانچسٹر، محلہ کرشل ۲۶۴
ہالینڈ روڈ انگلستان

والحمد للہ اولاً وآخراً ولہ الشکر ابداً وسرمداً
والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمّد وآلہ الطاہرین

سیّد صفدر حسین نجفی
ابن
سیّد غلام سرور نقوی مرحوم

Marfat.com

# ادارہ امامیہ قرأت کالج

# سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۳)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینیجر
امامیہ قرآت کالج
اندرون موچی دروازہ - لاہور

Marfat.com